

PakistaniPoint

Aik Rabta Apnon Sey

ماہنامہ

PakistaniPoint

Aik Rabta Apnon Sey

فروری 2018



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

### ناولٹ

118 بشری سیل می رقص  
146 صہیل اختر شہر دل کے راستے

### اسلامیات

7 جہنم حمد نعت  
7 کلمہ صہیل  
8 ادارہ پیارے نبی کی پیاری باتیں

### مکمل ناول

40 فرحت احمدی محبت غوش کماں ہے  
82 سلمان آف من سمیت  
160 شاد احمد سورج نے گرہن چھوڑ دیا

### انشاء نامہ

13 بادشاہت کی تلاش میں ابن انشاء

### افسانے

224 نصیر امجد تنہائی  
211 گلدار حیرے جگر کے پھول  
233 سہا احمد بے نشان  
17 سولما احمد ویلھائن ڈے

### سلسلہ ناول

17 پرست کے اُس پار کہیں نایاب جیلانی  
192 ام سریم دل گزیدہ

### مستقبل

241 قنیم طاہر حاصل مطالعہ  
238 تحریم محمود میری ڈائری سے  
250 سائر محمود رنگ حنا  
247 بلقیس بیٹی حنا کا دسترخوان  
243 مین مین حنا کی محفل  
253 افرح طارق کس قیامت کے یہ نامے  
256 فوریہ شفیق

☆☆☆

سرور طاہر محمود نے نواز پر تنگ پریس سے چھپوا کر دفتر ماہنامہ حنا 205 سرگرم روڈ لاہور سے شائع کیا۔  
خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ: ماہنامہ حنا، ماہلی منزل محمد علی امین میڈیسن مارکیٹ 207 سرگرم روڈ  
لاہور و بازار لاہور فون: 042-37321690, 042-37310797 ای میل ایڈریس: monthlyhina@hotmail.com, monthlyhina@yahoo.com

استنباط: ماہنامہ حنا کے جملہ حقوق محفوظ ہیں، بلاشر کی تحریری اجازت کے بغیر اس رسالے کی کسی بھی کاپی،  
چھاپہ یا سلسلہ کو کسی بھی انداز سے نہ نقل نہ شائع کیا جاسکتا ہے، اور نہ کسی ٹی وی چینل پر ڈرامہ، ڈرامائی تشکیل  
آڈیو سے واپس سے طور پر کسی بھی شکل میں پیش کیا جاسکتا ہے، خلاف ورزی کرنے کی صورت میں قانونی کارروائی کی جائے گی۔



قارئین کرام! فردری 2018ء کا شمارہ پیش خدمت ہے۔

گزشتے چند سالوں میں معصوم بچوں سے زیادتی کے واقعات میں بہت اضافہ ہوا ہے۔ ہمارے معاشرے کے لئے کافی تشویش ناک ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ملک میں انٹرنیٹ کے صارفین کی تعداد میں اضافہ اور ان واقعات میں اضافے کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔ انٹرنیٹ کی ہر جگہ دستیابی کی وجہ سے ہر قسم کا مواد ہر عمر کے لوگوں کی دسترس میں رہتا ہے جس کی وجہ سے غیر اخلاقی فلموں کے ناظرین کی تعداد میں کافی اضافہ ہوا ہے۔ دنیا بھر میں غیر اخلاقی مواد کو سرچ کرنے والوں میں پاکستان پہلے چند نمبروں میں ہے جہاں انٹرنیٹ کے بے شمار فائدے ہیں وہاں اس کے نقصانات بھی اتنے ہی ہیں۔ اس لئے ہمارے خیال میں حکومت کو اس قسم کے جرائم کے سدباب کے لئے انٹرنیٹ پر دستیاب مواد پر بھی توجہ دینی ہوگی اور غیر اخلاقی مواد والی ویب سائٹس پر پابندی لگانا ہوگی۔ ہمارا معاشرہ ایک اسلامی معاشرہ ہے اور ہم مغربی ممالک کی طرح کی کھلی بے حیائی کے محل نہیں ہو سکتے۔ اسی طرح ہمارے لی وی چینلوں پر جس قسم کے ڈرامے دکھائے جا رہے ہیں اس سے بھی معاشرتی بے راہ روی میں اضافہ ہو رہا ہے۔

کسی زمانے میں ہمارے لی وی ڈراموں کا معیار اتنا بلند تھا کہ بڑی ممالک کی درس گاہوں میں ان کو مثال کے طور پر پڑھایا جاتا تھا۔ مگر اب گھیسر اور ریٹنگ کی دوڑ میں ہم اس حد تک گر گئے ہیں کہ خاندان کے افراد کے لئے ساتھ بیٹھ کر ڈرامہ دیکھنا مشکل ہو گیا ہے۔ اگر ہم نے ملک میں خواتین اور بچوں کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں پر قابو پانا ہے تو دیگر عوامل کے ساتھ ساتھ ان چیزوں کو بھی کنٹرول کرنا ہوگا۔

اس شمارے میں **فخر جنت انصاری**، ریحانہ آفتاب اور شبانہ شوکت کے مکمل ناول، تحسین اختر بشری سیال کے ناول، سونیا چوہدری، فلک ذاکر، نصیر آصف اور سیما بنت عاصم کے افسانے، ام مریم اور نایاب جیلانی کے سلسلے دار ناولوں کے علاوہ ختا کے بھی مستقل سلسلے شامل ہیں۔

آپ کی آرا کا منتظر  
سردار طاہر محمود



کس کا جمال ناز ہے جلوہ نما یہ سو بہ سو  
کوشہ بگوشہ در بدر فریہ بہ فریہ کو بہ کو

اتھک نفاں ہے کس لئے دیدہ مختل مرا  
دجلہ بہ دجلہ یم بہ یم چشمہ بہ چشمہ جو بہ جو

مری نگاہ شوق میں حسن ازل ہے بے حجاب  
غنجہ بہ غنجہ گل بہ گل لالہ بہ لالہ بو بہ بو

جلوہ عارض نبی رشک جمال یوسفی  
سینہ بہ سینہ سر بہ سر چہرا بہ چہرا ہو بہ ہو

زلف دراز مصطفیٰ گیسوئے لیل حق نما  
طرہ بہ طرہ خم بہ خم حلقہ بہ حلقہ مو بہ مو

یہ میرا اضطراب شوق رشک جنون قیس ہے  
جذبہ بہ جذبہ دل بہ دل شیوہ بہ شیوہ خو بہ خو

تیرا تصور جمال میرا شریک حال ہے  
نالہ بہ نالہ غم بہ غم نعرہ بہ نعرہ ہو بہ ہو

نام بھی تیرا عقیدت سے لیا جاتا ہوں  
ہر قدم پر تجھے سجدے بھی کیے جاتا ہوں

کوئی دنیا میں مرا مونس و منور نہیں  
تیری رحمت کے سہارے پہ بیٹے جاتا ہوں

تیرے اوصاف میں اک وصف خطا پوشی ہے  
اس بھروسے پہ خطائیں بھی کیے جاتا ہوں

آزمائش کا محل ہو کہ مسرت کا مقام  
سجدہ شکر بہر حال کیے جاتا ہوں

زندگی نام ہے اللہ پہ مر مٹنے کا  
یہ سبق سارے زمانے کو دیے جاتا ہوں

مہر کرنا ہے تری شان کریبی کو عزیز  
میں یہی سوچ کر آنسو بھی پیے جاتا ہوں

ہر گھڑی اس کی رضا پیش نظر ہے اقبال  
شکر ہے ایک سلیقے سے بیٹے جاتا ہوں

ریحانہ امردہوی

اقبال عظیم

### دائرہ حقوق اللہ اور حقوق العباد

حقوق اللہ اور حقوق العباد کوئی ایک دوسرے سے کئے ہوئے یا علیحدہ نہیں ہیں بلکہ ایک دوسرے کے ساتھ مربوط اور پیوستہ ہیں، ایک کی ادائیگی سے دوسرے کی بھی ادائیگی ہو جاتی ہے، حقوق العباد کی ادائیگی کا حکم چونکہ اللہ کی طرف سے ہے، لہذا اس کی ادائیگی سے اللہ کے حکم کی ادائیگی ہوگی اور اس طرح حقوق اللہ کے زمرے میں آئے گی اور یہ عبادت شمار ہوتی ہے، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے، ”راستے سے تکلیف دو چیز ہٹانا بھی نیکی ہے۔“

راستہ میں بڑا پتھر چونکہ مخلوق خدا کو تکلیف دیتا ہے، اس لئے اس کے ہٹانے کو بھی حقوق اللہ کی ادائیگی سے متصور کر کے نیکی مانا جائے گا۔

حقوق اللہ میں مندرجہ ذیل اہم پہلوؤں پر ایمان لانا ضروری ہے۔

- ۱۔ توحید باری تعالیٰ
  - ۲۔ قیام صلوٰۃ یا عبادت
  - ۳۔ ادائیگی زکوٰۃ
  - ۴۔ اہتمام صیام
  - ۵۔ ادائیگی مناسک حج
  - ۶۔ امر بالمعروف و نہی عن المنکر یا جہاد
- اللہ تعالیٰ نے اپنی ترتیب میں حقوق العباد کو اپنے حقوق کی نسبت زیادہ اہمیت دی ہے، عام لوگوں میں غلط فہمی پائی جاتی ہے کہ حقوق اللہ کو

الانام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے تھے کہ بڑھ چڑھ کر نیکیاں کیا کرو اور کبھی بھی نیکی کو حقیر نہ سمجھو، چاہے ایک مجبور کا صدقہ ہی کیوں نہ ہو۔

حقوق العباد پر اللہ تعالیٰ کا زور اس لئے بھی ہے کہ حقوق العباد کی روگردانی سے خود بنی نوع انسان کو نقصان ہوتا ہے، عدل و توازن برقرار نہیں رہتا، ظلم پھیلتا ہے اور عفو و احسان سکڑتا ہے، اخوت و مساوات ختم ہوتی ہے اور ظاہر ہے ایسا ماحول جہنم سے کم نہیں ہے، اس لئے انسان کی جبلت کو دیکھتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام مبعوث فرمائے جن کا کام تذکیہ نفس اور حکمت کی تعلیم تھا تا کہ خلافت ارضی پر مامور حضرت انسان کو فرائض خلافت کی ذمہ داریوں کے حوالے سے تیار کر سکیں، آنحضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ فرمان حقوق اللہ اور حقوق العباد کے باہمی تعلق اور نجات اخروی میں ان کی اہمیت کو بخوبی واضح کر دیتا ہے۔

### جنت میں لے جانے والے اعمال

حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، ”جنت میں لے جانے والے اعمال یہ ہیں۔“

اللہ کی عبادت ایسے خلوص سے کرو کہ اللہ کے سوا نہ صرف یہ کہ کسی غیر کی عبادت نہ کرو بلکہ اللہ کی جو عبادت کرو، اس میں شرکت غیر کا شائبہ تک نہ ہو، خالصتاً اللہ کی عبادت ہو اور اللہ کی خوشنودی کے لئے ہو، نماز قائم کرو، زکوٰۃ ادا کرو اور رشتہ داروں سے میل جول اور حسن سلوک کرو۔“

### رزق حلال

ایک اور ارشاد میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

”ایک شخص لمبا سفر کر کے غبار میں اٹا ہوا آتا ہے اور آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر ربی ربی کہتا ہے، دعا کرتا ہے مگر اس کا کھانا، پینا، لباس اور نشو و نما سب حرام کی کمائی سے ہے تو اس کی دعا کہاں قبول ہوگی۔“

### نیکی کیا ہے

حضرت داہد ابن معبد رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے فرمایا۔

”تم پوچھتے آئے ہو کہ نیکی کیا ہے؟ اور گناہ کیا؟“

میں نے عرض کیا۔

”ہاں۔“

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اگلیوں کو اٹھا کر اور میرے سینہ پر پار کر فرمایا۔

”اپنے آپ سے دریافت کر، اپنے دل سے دریافت کرو۔“

پھر فرمایا۔

”نیکی وہ ہے جس سے انسان خود مطمئن ہو جائے اور اس کے دل کو اطمینان ہو جائے اور گناہ وہ ہے جس سے انسان کا ضمیر غلش محسوس کرے اور جس سے اس کے سینہ میں شک پیدا ہو جائے۔“

جب ایک شخص کسی دوسرے شخص کے حقوق پر درست درازی کرتا ہے تو وہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے دی گئی حفاظت کو ختم کرنے کی کوشش کرتا ہے اس لئے اگر وہ کسی کی جان لیتا

ہے تو اس کی جان لے لی جاتی ہے، اگر وہ کسی کی تہمت لگا کر بے عزتی کرتا ہے تو وہ ہمیشہ کے لئے غیر معتبر ٹھہر جاتا ہے، اسی طرح کوئی محفوظ مال چراتا ہے تو گویا وہ اپنے بھائی کا حق مار کر جرم کا مرتکب ہو جاتا ہے، غرضیکہ یہ سارے جرائم ہیں جو اللہ تعالیٰ کے بندوں کے خلاف ہوتے ہیں تو اس سے بندوں کا خالق متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا، چنانچہ اسی وجہ سے اس نے معاشرے میں ایسے لوگوں کی سرکوبی کے لئے حدود کا تعین کر دیا ہے جو قرآن و حدیث میں بیان کر دی گئی ہیں۔

### حقوق نفس

نفس سے مراد انسانی جان ہے جو کہ شخصیت انسانی کی تمام ظاہری و باطنی کیفیات پر محیط ہے، لہذا نفس کے حقوق دیے ہوں گے جو انسان کے جسم اور اس کی روح کے حقوق ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کے لئے فرمایا۔

”بے شک تیری جان کا تجھ پر حق ہے، تیرے بدن کا بھی تجھ پر حق ہے اور تیری آنکھوں کا بھی تجھ پر حق ہے۔“

قرآن مجید میں ارشاد ہے۔

”اللہ تعالیٰ کسی جان کو تکلیف نہیں دیتا بلکہ اس طاقت کے مطابق اس کے لئے دی کچھ ہے جو اس نے کمایا اور اس پر وہی ہے جو اس نے کیا۔“ (البقرہ ۲)

اور قرآن مجید میں ایک جگہ اور ارشاد ہے۔

”اپنی جانوں اور اپنے اہل خانہ کی جانوں کو آگ سے بچاؤ۔“

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے سورۃ شعراء کی آیت ۲۱۴ نازل فرمائی کہ ”اپنے قریب ترین

رشتہ داروں کو ڈراؤ“ تو آنحضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کھڑے ہو کر فرمایا۔

”اے گروہ قریش! اپنی جانوں کو (جہنم سے) بچالو، میں تم کو عذاب الہی سے ذرا بھی بچا نہ سکوں گا۔“ پھر آپ نے نام لے لے کر بنی عبد مناف، حضرت عباس بن عبد المطلب اور اپنی بھوپھی حضرت صفیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے کہا۔

”میں آپ کو اللہ کی گرفت سے ذرا بھی نہ بچا سکوں گا۔“ پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی بیٹی سے کہا۔

”اے فاطمہ میری بیٹی اتم مجھ سے میرے مال میں سے جو چاہو لے لو مگر میں اللہ تعالیٰ کی گرفت سے تمہیں ذرا بھی نہ بچا سکوں گا۔“

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ ایک دیہاتی نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مکہ سے ہجرت کی اجازت طلب کی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

”نادان ہجرت بہت مشکل کام ہے تم اگر سمندروں کے اس بارہر چتے ہوئے بھی تنگ عمل کرو گے تو اللہ تعالیٰ تمہارے کسی عمل کو ضائع نہیں کرے گا اور اس کا اجر تم کو مل کر رہے گا۔“ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس سے دریافت فرمایا۔

”کیا تمہارے پاس اونٹ ہیں اور کیا تم ان کی زکوٰۃ ادا کرتے ہو؟“ اس نے عرض کیا۔

”ہاں!“ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

”تو پھر زکوٰۃ ادا کرتے رہو۔“

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

”جب تم میں سے کوئی بستر پر جانے لگے تو اسے چاہیے کہ پہلے بستر کو جھاڑ لے، اسے نہیں معلوم کہ اس کے پیچھے اس پر کیا چیز آئی پھر کہے

”میرے ہاں جو مال ہوتا ہے، میں اس کے دینے میں دریغ نہیں کرتا اور تم سے بچا کر نہیں رکھتا لیکن جو شخص سوال کرنے سے باز رہتا ہے،

اے میرے مالک! میں تیرے ہی نام سے اپنا پہلو بستر پر رکھ رہا ہوں اور تیرا ہی نام لے کر اسے بستر سے اٹھاؤں گا، اگر اس دوران تو میری روح قبض کرے تو اس پر رحم فرماؤ اور اگر تو اسے آزاد رکھے تو اس کی اس طرح حفاظت فرما جیسے تو اپنے نیک بندوں کی حفاظت فرماتا ہے۔“

### مسافر کے لئے

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

”مسافر ایک طرح کا عذاب ہے، جس کی وجہ سے انسان کھانے، پینے اور سونے سے محروم رہتا ہے اس لئے مسافر کو چاہیے کہ وہ اپنے کام سے فارغ ہوتے ہی اپنے اہل و عیال کے پاس پہنچنے میں جلدی کرے۔“ (بخاری ۱۹:۲۶)

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

”سوئے وقت اپنے گھروں میں آگ جلتی نہ چھوڑو۔“ (بخاری ۴۹:۴۹)

### سوال نہ کرنا

حضرت ابو سعید خدری سے مروی ہے کہ انصار میں سے چند لوگوں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کچھ طلب کیا آپ نے انہیں دے دیا، انہوں نے پھر مانگا آپ نے پھر عطا فرمایا حتیٰ کہ جو کچھ آپ کے پاس موجود تھا سب ختم ہو گیا پھر آپ نے ارشاد فرمایا۔

”میرے ہاں جو مال ہوتا ہے، میں اس کے دینے میں دریغ نہیں کرتا اور تم سے بچا کر نہیں رکھتا لیکن جو شخص سوال کرنے سے باز رہتا ہے،

اللہ تعالیٰ اس کے لئے صبر آسان کر دیتا ہے اور کسی کو کوئی عطاء الہی صبر سے زیادہ بہتر اور وسعت والی نہیں ملے۔“ (بخاری ۸:۲۵)

### حیاء

حضرت عمران بن حصین رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

”حیاء صرف بھلائی لاتی ہے۔“ (بخاری ۷۷:۷۸)

### دیور سے پردہ

حضرت عقیقہ بن عامر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

”عورتوں کے پاس جانے سے خود کو بچاؤ۔“ ایک انصاری نے دریافت کیا۔

”یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! دیور کے بارے میں کیا حکم ہے؟“

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

”دیور تو موت ہے۔“ (بخاری ۱۱:۶۷)

### صدقہ

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

”جب کوئی شخص اپنی پاک کمائی میں سے ایک کھجور کے برابر بھی صدقہ دیتا ہے تو اللہ اسے بڑھاتا ہے حتیٰ کہ وہ پہاڑ کی مثل ہو جاتا ہے۔“ (بخاری ۲۳:۹۷)

### گھروالوں پر خرچ



گزر رہے۔

امیر تیمور کو ہم قائل کر لیتے، ہمارا خیال ہے کہ وہ ہماری بات نہ ٹالتے، لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ کچھ اس قسم کا اندر کر کے کہ ”آج میری ناگہ میں درد ہے، کل انکیشن کی تاریخ کا اعلان کروں گا۔“ راتوں رات گھوڑوں کی ٹنگی پیچھے پر پیچھے کر لٹکر لے کر ”علی علی“ کرتے خوارزم کی طرف نکل جاتے، بلکہ ان کا ایک اور گھوڑا جاتے جاتے ہماری گھاس پھوس کی ٹنگی کولات مار جاتا کہ اور درد مشورے صاحب قراں کو، اصولاً تو انگریزوں کو بھی حکومت سنبھالنے سے پہلے ہندوستان میں انکیشن یا استصواب رائے وغیرہ کرانا چاہیے تھا لیکن خیر! دوسرا طریقہ بھی حکومت بدلنے کا انتخابی مقبول اور مشہور ہے بلکہ ہمارے ہاں جمہوریت تو مدت سے کافور ہے، اسی کا زیادہ دستور ہے۔

سوال یہ ہے کہ ان دو گھمے بڑے طریقوں کے علاوہ بھی کوئی طریقہ ہے جو پر امن بھی ہو، انفس کہ نیلیو پڑن اور ریلو کی بدعت رائج ہونے کے باعث لوگوں میں پرانے کلاسیکی ادب کا ذوق اٹھ گیا ہے، ہائے کیا زمانہ تھا کہ لوگ شب و روز داستانیں کہتے سنتے رہتے تھے، خوش جہاں بادشاہوں اور ماہ پارہ شہزادیوں کی اور تین آنکھوں والے نابکار دیوؤں کی اور اڑتے قالینوں کی، داستان میں اس انہماک کا ایک صحنہ فائدہ یہ تھا کہ ملک میں اعلیٰ (افراط زر) بھی پیدا نہ ہونے پانی تھی۔

ان قصوں کہانیوں کے بموجب ایک بادشاہ

نی زمانہ حکومتوں کے بدلنے کے دو طریقے رائج اور مقبول ہیں، ایک بیلٹ یعنی انکیشن، دوسرا بیلٹ یعنی گولی کا، ویسے اب دونوں میں چنداں فرق نہیں رہا کیونکہ انکیشن میں بھی بیلٹ کے ساتھ ساتھ بلکہ بیلٹ سے زیادہ بیلٹ کا استعمال ہونے لگا ہے اور زیادہ موثر اور کامیاب پایا گیا ہے، ہم ذاتی طور پر انکیشن کے حق میں نہیں، یہ خون خرابے کی چیز ہے جسے ہم نے مغرب کی اندھی تقلید میں اختیار کیا ہے، ہمارے بہترین بادشاہوں میں سے جن کا نام زریں حروف سے لکھتے لکھتے ہماری دو اتنی خشک ہو گئی ہیں اور ملک کے سونے کے ذخائر میں کافی کمی واقع ہو گئی ہے، اکبر، جہانگیر، شاہجہاں وغیرہ، ان میں سے کون انکیشنوں کے ذریعہ برسر اقتدار آیا؟ عوام کی اکثریت کی رائے کی کوئی سند بھی نہیں۔

لوگوں کا بس چلتا تو بادشاہ غازی حضرت اورنگ زیب عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ کے مقابلے میں وہ دوت دارا شکوہ کو دیتے، حالانکہ ہم آپ جانتے ہیں کہ وہ بڑا بد عقیدہ آدمی تھا، ہمارے ممدوح کے مقابلے میں جو تہذیبی آثار پیشہ، درویش اور اپنے بھائیوں پر جان چھڑکنے والے تھے، اس میں کوئی خاص خوبی نہ تھی بلکہ ایک بڑا عیب یہ تھا کہ کتابیں لکھتا تھا، اکبر اعظم تو انکیشن کا فارم بھی خود نہ کر سکتے تھے، ان کے نامزدگی کے کاغذات ابوالفضل کو پر کرنے پڑتے، بادشاہ بس نشان انکشت ثبت کرتا، محمود غزنوی اور احمد شاہ ابدالی سے بھی یہ توقع نہیں کرتے کہ وہ اس کٹ راگ سے

حضرت عبد اللہ بن عمر سے مروی ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔  
”جب تم کچھ خریدو یا بیجو تو کہہ دیا کرو لا خلاہ“ (یعنی بلا کسی دھوکے کے عیب ذکر کر دیا کرو۔) (بخاری ۳۳: ۳۸)

سود

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

”ایک دوسرے سے بغض نہ رکھو، کسی سے حسد نہ کرو اور نہ آپس میں بول چال بند کرو اور سب اللہ کے بندو ایک دوسرے کے بھائی بن کر زندگی گزارو اور کسی مسلمان کے لئے جائز نہیں ہے کہ تین دن سے زیادہ اپنے بھائی سے تعلقات یا بول چال ترک کرے۔“ (بخاری ۷۸: ۵۷)

### مسلمانوں کے حقوق

حضرت عبد اللہ بن عمر سے مروی ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

”مسلمان مسلمان کا بھائی ہے اور بھائی نہ تو اپنے بھائی پر ظلم کرتا ہے اور نہ اس کو ظلم یا تکلیف میں مبتلا دیکھ سکتا ہے اور جو شخص اپنے بھائی کی حاجت رد کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کی ضروریات کا کھل ہوجاتا ہے اور جو شخص کسی ایک مسلمان کی تکلیف دور کرتا ہے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی تکالیف میں سے ایک تکلیف دور فرمائے گا اور جو کسی مسلمان کی پردہ پوشی کرے گا، اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی پردہ پوشی کرے گا۔“ (بخاری ۳۶: ۳)

☆☆☆

حضرت ابو مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

”مسلمان جب اپنے گھر والوں پر خرچ کرتا ہے اور خرچ کرتے وقت ثواب کی امید رکھتا ہے تو وہ خرچ اس کا صدقہ بن جاتا ہے۔“ (بخاری ۱۰۲۹: ۱)

### صدقہ

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ ”انسانوں کے جسم میں جتنے جوڑ ہیں ان میں سے ہر ایک پر صدقہ واجب ہے ہر روز جب آفتاب طلوع ہوتا ہے تو دو آدمیوں کے درمیان انصاف سے فیصلہ کر دینا بھی صدقہ ہے اور کسی کی مدد کرنا اس طرح کہ اسے اپنی سواری پر بٹھا کر اس کا سامان لا کر منزل تک پہنچا دے یہ بھی صدقہ ہے اور کلمہ خیر یا اچھی بات کہنا بھی صدقہ ہے اور ہر وہ قدم جو نماز کے لئے مسجد کو جاتے ہوئے اٹھتا ہے وہ بھی صدقہ ہے اور راستے میں ایذا رساں چیز ہٹانا صدقہ ہے۔“ (بخاری ۵۶: ۱۲۸)

### سوال کرنا

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

”انسان کا جنگل سے کڑیوں کا سٹھا کر پر اٹھا کر لانا اس سے کہیں بہتر ہے کہ وہ کسی کے آگے دست سوال دراز کرے جو اسے کچھ دے یا انکار کر دے۔“ (بخاری ۳۳: ۲۳)

### دھوکا دینا

## اچھی کتابیں پڑھنے کی عادت ڈالیے

ابن انشاء

اردو کی آخری کتاب

خدا رکندم

دنیا گول ہے

آوارہ گرد کی ڈائری

ابن بطوطہ کے تعاقب میں

چلنے ہو تو چین کو چلئے

گھری گھری پھر اسافر

خط انشائی کے

بہتی کے اک کوپے میں

چاندگر

دل وحشی

تپ سے کیا پردہ

ڈاکٹر مولوی عبدالحق

توا بعد اردو

انتخاب کلام میر

ڈاکٹر سید عبداللہ

طیف نثر

طیف غزل

طیف اقبال

لاہور انکلیڈی، چوک اردو بازار، لاہور

فون نمبر: 7321690-7310797

ہی کو ہے تو ہمیں بھی ہے، تاہم یہ ہوا کہ بادشاہت کی کیو میں ان کا نبرگ گیا، باجواں۔ ہم کہاں تک ترے پہلو سے سرکتے جاویں پھر بھی اگر پہلے چار امیدواروں کو کچھ ہو جائے اور ان میں جو اولاد زینہ ہے، وہ فائز انقل نکل جائے یعنی سب کے سب امریکی منکوحہ عورتوں سے شادی کر کے وزیر اعظم وقت کو ناراض کر لیں، یا رومن کیتھولک، مسلمان یا کبیر پنتھی ہو جائیں اور یہ نومولود بچی تاج پینے سے انکار کر دے کہ چھتا ہے یا میر امیر اسٹائل سے خراب ہوتا ہے تو سلطنت دست بدست ہم تک آ سکتی ہے، لیکن آج یہ خبر آئی کہ اس گھرانے میں ایک اور شزادی نے جنم لیا ہے، یہ ڈچس آف گلوستر کی صاحبزادی ہیں، ان کا بادشاہت کی قطار میں بار ہواں نمبر ہے۔

ہم نے ایک ہمدرد سے ذکر کیا اور کہا کہ ”گلوستر پریس میں رہنے کی وجہ سے ہم بھی ایک طرح کے ڈیوک آف گلوستر ہیں کہ نہیں۔“ تو کہنے لگے۔

”صاحب من، اگر ملکہ الزبتھ ثانی کو ملکہ وکٹوریہ کی عمر ارزانی ہوئی تو کچھ عجب نہیں کہ ایک سو بار ہواں امیدوار بھی پیدا ہو جائے، بس سیدھے اپنے وطن واپس جاؤ، اپنا وقت مت ضائع کرو، انٹیکریشن کے رجسٹر کے مطابق تمہارا نمبر وارثت کے معاملے میں چھ کروڑ اسی لاکھ چوراسی ہزار آٹھ سو پینتیسواں ہے، پھر تم کالے بھی ہو اور پرانی داستانوں میں بھی شاہی خون کی شرط ہوا کرتی تھی۔“

ہم نے بتایا کہ ”کالے تو ہم بیماری کی وجہ سے ہو گئے ہیں، جب وقت آئے تو اپنے ملک سے گورا کرنے والی کریم منگالیں گے، جس کے استعمال سے جلدی تک گورے ہو سکتے ہیں اور

کہ اب جو ہمیں خدا نے یہ ملک دیا ہے تو اس میں ہمیشہ بادشاہت لا کر کسی کو بادشاہ یا خلیفہ بنانا چاہیے تاکہ یہ آئین دستور، پتیل پارٹی، پی این اے وغیرہ کے جھگڑے نہ اٹھیں، یہ کوئی ضروری نہ تھا کہ ہمیں بادشاہ بنایا جاتا، کسی اور کو بھی بنایا جا سکتا تھا، کیونکہ فی زمانہ اہلیت اور لیاقت کو کون دیکھتا ہے، تاہم ہماری شنوائی نہ ہوئی۔

انگلستان ہم اس لئے بھی آئے تھے کہ یہاں بادشاہت ہے، یہاں بھی نہ کبھی کوئی تو لاؤلد مرے گا کیا عجب یہاں صبح دم دروازہ شہر میں داخل ہونے والوں کے حقوق تسلیم کیے جائیں، لیکن یہاں آکر پہلی مایوسی تو یہ ہوئی کہ اس شہر میں نہ فیصل ہے، نہ کوئی دروازہ ہے، یہاں ہم کھل لے کر بڑ جاتے اور ہر روز اخبار ناگزیر خرید کر سیاہ حاشیے کی خبروں کا مطالعہ کرتے ایک صورت یہ بھی تو تھی کہ لوگ در بدر تلاش کرتے تھے کہ شہر میں کوئی ایسا بصرے یا کاشغر کا لوجوان تاجر ملے جس کا تعلق کسی پرانے شاہی خاندان سے ہو اور جو حسن صورت، لیاقت اور ذہانت میں یکماتے زمانہ ہو، ہم نے اسی خیال سے اپنی ڈگریاں اس ڈگری کے علاوہ جو کہ آپریٹو تفرصہ کی ناندہنگی کے سلسلے میں ہم پر ایک دیوالی عدالت نے دی تھی (کوئی ہا ہوش عدالت ایسا نہیں کر سکتی تھی) فریم کر کے اپنے ڈرائنگ روم میں لٹکا دیں، جہاں لوگ آتے جاتے رہتے ہیں، ایسے بھی جن کی پارلیمنٹ اور ہیکم پریس تک پہنچ ہے اور خود عمل تعمیر شروع کر دیا، قیاحت یہ ہوئی کہ کسی نے ملکہ عالیہ کو بروقت فیمل پلاننگ کا لٹریچر نہ بھیجا تھا جس سے چند قیاحتیں پہلے ہی پیدا ہو چکی تھیں بلکہ قیاحت در قیاحت تھی، اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ شزادی این کے ہاں اس عزیزہ کے پیدا ہونے کی ہمیں خوشی نہیں، جب اور سب

کے لاؤلد مرنے پر لوگ صبح دم شہر کے دروازے میں سب سے پہلے داخل ہونے والے مسافر کے سر پر تاج رکھ کر شادیانے بجا دیتے تھے، کچھ لوگوں کا کہنا ہے شاہ مرحوم کا کاٹا وزیر اس پہلے آدی کو پہلے ہی لکھی دروازے سے یا فیصل گئے برج سے رسی لٹکا کر شہر کے دروازے کے پاس اتار دیتا تھا اور وہ تڑکے تک سردی سے ٹھٹھرتا اپنے کو بادشاہی کے خوابوں سے گرہا تا وہاں دبا پڑا رہتا تھا، لیکن ہم اسے محض بدگمانی سمجھتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ اس زمانے میں ولی عہد پیدا کرنے کے معقول انتظام ہوتے تھے، خاصے مگنجان حرم بیگموں کے بھی، کیتروں کے بھی، امراء، وزرا کی بیوی بیٹیاں اس پر مستزاد اور اولاد زینہ کی بشارتیں اور دعائیں دینے والے اہل اللہ بھی شہر کے باہر ڈیرے جمائے بیٹھے رہتے تھے، شہر سے باہر لیکن اتنی دور بھی نہیں کہ لوگوں کو نذر و نیاز کے ٹوکے وہاں تک لے جانے میں وقت ہو۔

علاوہ ازیں ان دعاؤں کو مستجاب بنانے اور اس معاملہ میں قدرت کا ملکہ کو ظہور میں لانے کے لئے محل کے اندر جی غلام بھی رہتے تھے جن کے سرکاری فرائض تو دن میں ختم ہو جاتے تھے لیکن اپنے آقا کی بیگمات کی فرمائش پر اور نام بھی خوشی خوشی کر لیتے تھے، خوبہ سراؤں کی موجودگی اس میں مانع نہ ہوتی تھی، تاہم داستانوں سے پتا چلتا ہے کہ بادشاہوں کی لاؤلدی اور صبح دم مسافروں کو بیٹھے بٹھائے پکی پکائی بادشاہی ملنے کی وارداتیں خاصی ہوتی تھیں۔

☆☆☆

ہم بادشاہت کے تہہ دل سے قائل ہیں، اس وقت بالخصوص مسلمان ملکوں میں جو بادشاہ ہیں، وہ ہماری آنکھ کا تارا ہیں، ہم نے کئی بار لکھا



☆☆☆

نہیں نے پورے کمرے کو سرخ کلابوں سے مہکا دیا تھا، ہیڈ شیت، پردے، کٹن ہر چیز میں سرخی مائل تھی، کمرے کی تمام لائٹ آف تھیں لیکن کینڈل ریڈر میں جلتی موم بتیاں کمرے کو روشن کر رہی تھیں۔

زینی ریڈ پاجامہ پر نفیس ہلکی سلور کڑھائی والے فراک میں ملبوس ہلاکی حسین لگ رہی تھی۔ اس نے اپنی نظریک ہار پھر سامنے وال کلاک کی جانب دوڑا دی، رات کے دس بج چکے تھے۔

وہ پچھلے دو گھنٹوں سے اس کا انتظار کر رہی تھی، لیکن وہ اب تک نہیں آیا تھا، کئی بار اس نے قاسم کا نمبر ڈائل کیا لیکن دوسری جانب سے کوئی

اس نے کندھوں سے سر کی ہوئی شال کو درست کرتے ہوئے گاڑی کا دروازہ کھولا، ہوا میں ہلکی ہلکی اور سردی کا احساس اسے شدت سے چھو کر گزرا تھا وہ ہاتھ میں موبائل اور والٹ تھا اسے ایک شاپ میں داخل ہوئی۔

پوری شاپ سرخ گلابوں اور ویلنٹائن ڈے کے کارڈز سے جگمگا رہی تھی، اس نے آگے بڑھ کر ایک خوبصورت ویلنٹائن ڈے کا کارڈ اٹھا کر پڑھا اور اس کو دیکھ کر مسکرانے لگی۔

کارڈ کے ساتھ اس نے ایک نفیس سی گھڑی خریدی اور سمکٹ کی، ویلنٹائن ڈے وہ ہمیشہ جوش و خروش سے سیلبریت کرتی آئی تھی، تو آج کیسے بھول سکتی تھی، آج کا دن اس کے لئے خاص تھا، بہت خاص۔

ہاتوں کا قلع قمع کرتے پہلے قلع پھر قلع، جیسے چھٹی کرتے تھے، لیکن افسوس وہ پہلے ہی ہونے لگی ہے، خیر جسے کی دو چھٹیاں کر دیں گے، ہمارے عہد معدلت عہد میں ہفتے میں دو جمعے ہوا کریں گے تاکہ لوگ دل جمعی سے عبادت کرتے رہیں، جمہوریت اور سوشلزم وغیرہ کے شیطانی دوسے ان کے دل میں پیدا نہ ہوں، شراب کی ممانعت کرنے کا نکتہ بھی ہمارے منشور میں تھا، وہ بھی ہو چکی، لیکن ہرج نہیں، ہم مزید ممانعت کر دیں گے تاکہ جو لوگ نہیں پیتے وہ مزید نہ پئیں، یہاں تفصیل کیا دیں، آزمائش شرط ہے، ”مشک آئست کہ خود بوید۔“

☆☆☆

تاریخ انگلستان ہم نے اس خیال سے لکھنی شروع کی تھی کہ آخر میں اپنے عہد کا حال اپنے قلم سے لکھ جائیں تاکہ آنے والے سورخ غلطیاں نہ کریں، لیکن قارئین کرام شاعر کہہ گیا ہے۔  
”جب وطن از ملک سلیباں خوشتر۔“

اب ہم فرنگستان کے راج پاٹ پر لات مار کر وطن واپس آنے اور ایک رحم دل اور بیدار مغز تاجدار کے طور پر اپنے ملک اور رعایا کی خدمت کرنے کے لئے بے تاب ہیں، جونہی امراء اور عمائد کا کوئی وفد ہمیں لینے کے لئے آئے گا، ہم لندن کے درو دیوار پر حسرت سے نظر کرتے ہوئے روانہ ہو جائیں گے، اس کالم کی کئی سنبھال کر رہیں، اسے سب قارئین کو ہم خلعت و انعام دیں گے اور لوگوں کا منہ موتیوں سے بھر دیں گے، خصوصاً ان کا جو نکتہ چینی کے لئے منہ کھولنے کی کوشش کریں گے۔

☆☆☆

رہوڈیشیا اور جنوبی افریقہ تک کے مسئلے حل ہو سکتے ہیں، اب رہی شاہی خاندان کی بات ہم نے ایک پرانی کتاب میں دیکھا ہے کہ پراچین زمانے میں ہمارے جد امجد کا لبحر کے قریب ایک ریاست کے ایک طرح سے راجہ تھے، وہ یوں کہ بقا ہر راجہ ان کے چھوٹے بھائی تھے لیکن وہ بڑے بھائی یعنی ہمارے جد امجد کا اتنا ادب کرتے تھے کہ ان کی کھڑاؤں تخت پر تو نہیں، تخت پر جگہ ہی کہاں ہوتی ہے، تخت کے نیچے رکھتے تھے۔  
ہمارے ان مہرمان نے فرمایا۔

”یہ انگلستان ہے، یہاں انگریزی خون یعنی سفید خون کی شرط ہے، کالبحر کا حوالہ نہیں چلے گا۔“

ہم نے دل برداشتہ ہو کر کہا۔  
”اچھا تو اور ملکوں کے نام بتاؤ جہاں بادشاہت ہو اور جہاں جو ہر قابل کی قدر ہوتی ہو، اسلامی ملک ہو تو اور اچھا ہے، کیونکہ ہمیں اسلام کا بول بالا کرنے کا بھی شوق ہے۔“

ہمارے ان دوست نے چند ملکوں کے نام بتائے لیکن یہ بھی کہا کہ ”آج کل وہاں دیراکی پابندی ہے اور پاکستانیوں کو تو بالکل نہیں ملتا۔“  
اس کے بعد جیب سے پی آئی اے کا ٹائم ٹیبل نکال کر کہنے لگے۔

بتاؤ، لندن سے کون کون سی فلائیں سیدھی کراچی جاتی ہیں۔  
ہم نے مختصراً ہو کر کہا۔

”رہنے دو، ہم خود دیکھ لیں گے، آدی گڑ نہ دے، گڑ کی بات تو کرے۔“

ہم بادشاہ ہوتے تو کیا کرتے، اس باب میں ہم نے ایک منشور چھاپ رکھا ہے جسے خرچا ڈاک کے لئے دس روپے بیج کر ہم سے طلب کیا جاسکتا ہے، مختصر یہ کہ ملک سے ساری بری بری



جواب نہیں آ رہا تھا۔

شادی کے بعد یہ اس کا قاسم کے ساتھ پہلا ویلنٹائن ڈے تھا، وہ جو آج کے دن کا بے مبری سے انتظار کر رہی تھی، اب غصے میں بیٹھی خود کو کوٹنے لگی۔

”میں ہی پاگل تھی جو اس کے لئے اتنا بے سنور کے بیٹھ گئی۔“ اس نے کانوں میں پینے والے جیمکے اتار تے ڈریسنگ ٹیبل پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ غصے میں خود کھائی کرتے ہوئے اس نے ساری چوڑی اتار کر ٹیبلک دی اور پیچ کر کے لئے واش روم میں گھس گئی، واش روم سے نکل کر ایک بار پھر اس نے ایک نگاہ گھڑی کا ڈالنے ہوئے ٹائم دیکھا۔

اب اس کو اپنی بے مبری سے اس دن کے انتظار پر غصہ آنے لگا تھا اور قاسم کے نہ آنے پر رونا، بیڑے بیٹھنے اس کی نظر سائید ٹیبل پر پڑی۔ جس پہ گھڑی اور خوبصورت ویلنٹائن ڈے کارڈ کے ساتھ گلاب کہ پھولوں کا کبے بھی موجود تھا۔

اس کی آنکھوں میں نمی اترنے لگی اور وہ خاموشی سے لیٹ گئی۔

”وہ کیوں اب تک نہیں آیا؟ میں نے اس کو بار بار کہا تھا کہ آج جلدی آنا، کیا وہ بھول گیا ہو گا کہ آج 14 فروری ہے؟ محبت کرنے والوں کے لئے خاص دن، کہیں وہ مجھ سے ایک سال میں ہی تو نہیں اکٹا گیا؟ اور کوئی اور.....“ خیالات کی پورش اسے کہاں سے کہاں لے گئی تھی، وہ جو سارا دن ہواؤں میں اڑتی رہی آج کے دن کی خوشی میں اس وقت عجیب سی محنت کا شکار تھی، غصہ اور مایوسی اس کے اعصاب پر حاوی تھا۔

سوچتے سوچتے کب نیند نے اس کو اپنی آغوش میں لے لیا اس کو معلوم ہی نہ ہوا ویلنٹائن ڈے ”خوست“ کا دن اسے تھا ہی گزارنا پڑا تھا، ہاں شادی کے بعد یہ پہلا دن تھا۔ چاہے کتنا ہی بڑا دن ہو۔

☆ ☆ ☆  
صبح اس کی آنکھ کھلی تو کافی دیر ہو چکی تھی، اس نے ایک نظر سوئے قاسم پر ڈالی، رات وہ کب لوٹا اس کو خبر نہ ہوئی، اپنے بکھرے بالوں کو سینٹے ہوئے وہ بیڈ سے اتری اور فریش ہو کر کچن میں چلی آئی، رات والے واقعے سے اس کا موڈ اب تک خراب تھا، وہ خاموشی سے اپنے لئے کافی بنا رہی تھی، جب اپنے عقب میں اسے قاسم کی آواز سنائی دی۔

”میرے لئے بھی ایک کپ کافی بنا دو۔“ اس نے مڑ کر ایک نظر قاسم پر ڈالی، اس کے چہرے پر کوئی شرمندگی کے آثار نظر نہیں آرہے تھے، وہ بالکل نارمل لہجے میں کہتا ہوا وہاں سے چلا گیا اور زینی اس کے اس انداز پر جل کر رہ گئی۔ وہ جو سمجھ رہی تھی کہ صبح آنکھ کھلتے ہی وہ رات دیر سے آنے پر معافی مانگے گا، اسے ویلنٹائن دس کرے گا، اس کے اس نارمل لی بیوپہ اس کو مزید غصے آنے لگا، وہ قاسم کے لئے کافی بنائے بنا ہی کچن سے چلی آئی تھی۔

☆ ☆ ☆  
معمول کے مطابق وہ تیار ہو کر ناشتے سے فراغت کے بعد آفس چلا گیا، جانے سے پہلے بھی اس نے زینی سے کوئی خاص بات نہیں کی۔ وہ جو اس کے آگے پیچھے گھوم رہی تھی کہ شاید اب وہ سواری بولے گا، مجھے گنٹ دے کر دس کرے گا اور منالے گا، بعد میں اپنی ہی سوچ

پر غصہ کرنے لگی۔

”کتنا لا پرواہ شخص ہے، فکر ہی نہیں بیوی کی اور نہ بیوی کی محبت کی۔“ رات کمرے میں بٹائے گئے گھابوں کو اس نے جس نہس کرتے ہوئے چلا کر کہا۔

”میں بھی آج کے بعد بھی اس کی فکر نہیں کروں گی، نہ جسمی یوں پاگلوں کی طرح اس کی محبت میں کمرے اور گھر کو سجاویں پھروں گی، اسے اپنے کام سے محبت ہے بس اب، مجھ سے نہیں۔“ سوچتے سوچتے ایک بار پھر اس کی آنکھوں میں نمی اترنے لگی۔

☆ ☆ ☆  
وہ قاسم کو بتاتے اپنی ای کی طرف چلی آئی تھی۔

زینی ایسی ہی تھی، سب کچھ برداشت کر سکتی تھی لیکن خود کو اگور ہوتے نہیں دیکھ سکتی تھی۔

”ویلنٹائن ڈے تو محبت کرنے والوں کا دن ہوتا ہے، پھر اس دن اس نے کیوں مجھے اپنی محبت کا اظہار نہیں کیا؟ آگے پیچھے تو بہت دعوے کرتا پھرنا ہے اور جس دن موقع تھا محبت کا احساس دلانے کا اس دن اس نے خود ہی میری محبت کو اگور کر دیا۔“

”یہ بھی نہیں سوچا ہو گا کتنا دکھ ہو گا مجھے۔“ اپنے کمرے میں بیٹھی وہ اسی کے بارے میں سوچ رہی تھی جب امی کمرے میں داخل ہوئی دکھائی دیا۔

”زینی بیٹا قاسم آئے گا لینے شام میں کہ تم خود جاؤ گی۔“ انہوں نے محبت بھرے لہجے میں پوچھا۔

”اے اپنے کاموں سے فرصت ملے گی تو آئے گا، اس کو تو اتنی بھی خبر نہیں ہوتی آج کل

کہ بیوی گھر میں موجود ہے بھی کہ نہیں۔“ زینی نے دکھ بھرے لہجے میں جواب دیا تھا اس کی ماں نے حیرت سے ایک نگاہ اس کے چہرے پر ڈالی اور اس کے قریب آن بیٹھی۔

”قاسم سے جھگڑا ہوا کیا؟“ انہوں نے فکر مندی سے زینی کو پوچھا۔

”جھگڑا ہی تو نہیں ہوا۔“ اس نے بے بسی کے عالم میں جواب دیتے ہوئے کہا۔ ”تو پھر؟“ انہوں نے نفیاتی نظروں سے زینی کو گھورا۔

”تو پھر کیا، بس کچھ نہیں ہوا امی، آپ فکر مند نہ ہوں، میں شام میں خود چلی جاؤں گی، گاڑی میرے پاس ہی ہے۔“ زینی نے موڈ نارمل کرتے ہوئے جواب کیا۔

وہ اپنی امی سے بے حد محبت کرتی تھی، اس لئے اپنی وجہ سے انہیں ہرگز پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی۔

شام میں واپسی پر مارکیٹ چلی آئی، گھر جانے کا اس کا بالکل جی نہیں چاہ رہا تھا، اپنے لئے کچھ شاپنگ کرنے کے بعد وہ واپس گاڑی میں آ بیٹھی، ایک نگاہ اس نے موبائل پر ڈالی۔

”صبح سے ایک میسج بھی نہیں ہو سکا اس سے؟ اتنا مصروف رہنے لگا ہے وہ؟ کہ اسے اپنی بیوی کا ہی خیال نہیں رہتا۔“ سوچتے سوچتے اس نے گاڑی اسٹارٹ کی اور نہ چاہتے ہوئے بھی گھر کے لئے روانہ ہو گئی۔

☆ ☆ ☆  
دروازہ کھول کر وہ اندر داخل ہوئی تو ہر طرف اندھیرا اچھایا تھا، شاید لائٹ مگنی تھی، موبائل کی لائٹ میں وہ کچن تک آئی اور باجس لے کر موم بتی جلانے لگی، نونج چکے تھے، وہ آج بھی

اب تک نہیں لوٹا؟ اس نے دل ہی دل میں ایک بار پھر اس کو یاد کیا تھا، وہ ٹی وی لائٹ میں آکر صوفے پر بیٹھ گئی۔

نیمبل پہ موسم ہتی رکھتے ہوئے اس کی نظر ایک گلابی رنگ کے کارڈ پر پڑی، جس کے ساتھ ایک خوبصورت سی گلاب کی ٹکلی بھی موجود تھی، اس نے فوراً اسے کارڈ کھول کر دیکھا۔

”سوری!“ کارڈ پر صرف سوری لکھا تھا، اس نے کارڈ واپس نیمبل پر رکھ دیا اور کلی اٹھانے لگی تو لائٹ آگئی۔

کارڈ اور کلی، مطلب وہ آچکا ہے، زینبی نے ایک نظر پورے گھر میں دوڑاتے ہوئے سوچا اور فوراً اپنے کمرے کا رخ کیا۔

کمرے میں لیب کی مدد مرم روشنی اس کو کمرے کا حال بیان کر رہی تھی اس نے جلدی سے لائٹ آن کی۔

گلابوں سے مہکتا کمرہ بے حد حسین لگ رہا تھا، کمرے کے چاروں کونوں میں گلاب کے بکے موجود تھے، لیکن وہ خود کہاں ہے؟ اس نے اضطراب سے سوچا۔

”زینبی!“ اسے اپنے عقب میں قاسم کی آواز سنائی دی، اس نے پیچھے مڑ کر قاسم کی جانب دیکھا، وہ دونوں ہاتھ باندھے کھڑا اسی کو مسکراتا دیکھ رہا تھا۔

”اب اس سب کی کیا ضرورت تھی؟“ زینبی نے غصا ہوتے ہوئے کہا۔

”تم جاؤ کر داپنا کام، مجھ پہ کیوں دقت برپا کر رہے ہو۔“ وہ جانتا تھا زینبی اس سے خفا ہے بھی چپ چاپ کھڑا اس کی ڈانٹ کو سن رہا تھا۔

”کتنا انتظار کیا تھا کل تمہارا، تمہاری خاطر

بھی سنوری، تمہاری محبت میں پورے کمرے کو گلاب کی پتیوں سے سجا دیا، لیکن تمہیں تو کوئی فرق نہیں پڑتا، میری محبت کا تو تمہیں کوئی احساس نہیں نا، تم غرور ہوتے ہی ایسے ہو، بس اپنے جذباتوں کی نذر کرنے والے، دوسرا کیا سوچتا ہے کیا کرتا ہے وہ کوئی معنی نہیں رکھتا تمہارے لئے۔“ وہ سخت غصے میں بولتی جا رہی تھی۔

”زینبی بس کر داب اتنا غصہ مت کرو، سوری نا۔“ قاسم نے زینبی کو کندھوں سے تھاپتے ہوئے کہا تو اس نے ایک جھٹکے میں اسے خود سے الگ کیا۔

”دور رہو مجھ سے، اب سوری کہنے کی کوئی ضرورت نہیں، پہلے دل توڑتے ہو پھر معافی مانگتے ہو۔“ اس نے تم آنکھوں سے قاسم کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”زینب میں نے کبھی تمہارا دل نہیں توڑنا چاہا نہ کبھی تمہیں ہرٹ کرنے کا سوچا ہے، میں تمہاری اور تمہاری محبت کی دل سے قدر کرتا ہوں۔“ قاسم نے محبت بھرے لہجے میں کہا تھا۔

”جان بچا ہوں جتنی قدر کرتے ہو۔“ ایک بار پھر وہ طنز پر لہجے میں مخاطب ہوئی تھی۔

”زینبی یار تم مجھے غلط سمجھ رہی ہو، میں تو تمہیں بس یہ احساس دلانا چاہتا تھا کہ ویلنٹائن ڈے کی محتاج نہیں ہے ہماری محبت اور نہ ہی اس دن کا ہم مسلمانوں سے اور اسلام سے کوئی تعلق ہے، یہ دن صرف بے وقوف لوگ ہی مناتے ہیں، ہم جیسے پاکیزہ محبت کا رشتہ رکھنے والے نہیں، تم نے بھی ایک بات سوچی ہے زینب؟“ اس نے زینبی کو سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”یقین نہیں سوچی ہوگی۔“

”ہم مسلمان ہو کر غیر مسلمانوں کے رسم و

رواج کو کتنی جلدی اپنا لیتے ہیں، کبھی کسی غیر مسلمان کو تم نے ہمارا کوئی کچھ تہوار مناتے یا اس میں شریک ہوتے ہوئے دیکھا؟ یقیناً نہیں، تو پھر کیا یہ ہمارے ایمان کی کمزوری نہیں کہ ہم وہ سب جلدی سے اپنا لیتے ہیں جس سے ہمارا اللہ اور ہمارے نبیؐ نہیں منع فرماتے ہیں۔“ زینبی خاموشی سے نظریں جھکائے اس کی باتیں سن رہی تھی۔

”ہم مسلمانوں کا تو اب یہ حال ہے کہ اگر اپنے نبیؐ کی شان میں کوئی میلاد منعقد کر لیں تو دوسرے فرشتے کے لوگ آکر حوالے مانگنے لگتے ہیں، کیا ہمیں میلاد معطیٰ کے لئے بھی حوالے دینے پڑیں گے؟“

”تو پھر ویلنٹائن ڈے، پی کرس ڈے جیسے دنوں پر ان مسلمانوں کی زبانوں کو تالے کیوں لگ جاتے ہیں؟ کیوں یہ ان دنوں پر برابر کا شریک رہتے ہیں، کیوں ان کو پھر حوالے احادیث اور گناہوں کا خیال نہیں رہتا، کیا یہ ہے آج کا سچا مسلمان؟“

”جو اپنے نبیؐ کی شان بیان کرنے پر حوالے مانگے اور غیر مسلمانوں کے تہواروں کو منانے میں خاموش تماشائی بنا بے حیائی پھیل گئی دیکھتا رہے؟“ مجھے شرم آنے لگی ہے زینبی ایسے لوگوں کو مسلمان کہتے بھی۔“

”کل رات میں نے نہ آفس کہ کسی کام میں مصروف تھا، نہ ہی دوستوں کے ساتھ تھا، میں اسی لئے لیٹ آیا تھا کہ جلدی آکر تمہیں کل یوں سمجھا نہ پاتا اور یوں تمہارے محبت سے کیے گئے اہتمام پہ کل سمجھانے کی بجائے خود بھی مجبوراً سیلبریشن میں شریک ہو جانا، لیکن مجھے تمہیں احساس دلانا تھا تمہیں یہ بات سمجھانی تھی کہ غیر اسلامی تہواروں کی محتاج نہیں ہے ہماری پاکیزہ محبت

میں کل تمہیں خوش کرنے کے لئے اللہ کو ہرگز ناراض نہیں کر سکتا تھا، کیونکہ جب اللہ ناراض ہوتا ہے تو پوری دنیا کے بھی راضی ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا، لیکن اگر اب بھی تمہیں لگتا ہے کہ میں نے تمہیں ہرٹ کیا ہے، تمہیں دکھ دینا چاہا ہے تو مجھے معاف کر دو اور جو سزا دینا چاہو دے دو میں تمہارے سامنے حاضر ہوں۔“ قاسم نے سرخم کرتے ہوئے ذرا سا جھک کر کہا تو زینب کی آنکھ

سے ایک آنسو کا موتی ٹوٹ کر زمین پر گرا تھا، وہ دھیرے دھیرے اس کے سامنے آکھڑکی ہوئی۔

”قاسم مجھے معاف کر دو، میں نے تمہیں غلط سمجھا اور غصے میں نہ جانے کتنا برا بھلا کہہ گئی، میں کبھی تھی کہ تم مجھ سے پور ہو گئے ہو مجھ سے اب محبت نہیں کرتے اسی لئے مجھے دش کرنا بھی تم نے گوارہ نہیں سمجھا، لیکن میں اپنی سوچ پر شرمندہ ہوں اور میں وعدہ کرتی ہوں آج کے بعد کبھی غیر اسلامی تہوار نہیں مناؤں گی، کیونکہ ہماری محبت کسی ایک دن کی محتاج نہیں، ہماری محبت کے لئے تو ہر دن بہت خاص ہے، جیسے رات کے بعد برتنی صبح بہت اہم ہوتی ہے۔“ زینبی نے قاسم کے سینے پر سر نکاتے ہوئے کہا تو قاسم نے دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کیا تھا۔

کہ اس کی ماؤرن سوسائٹی کی ماؤرن وائٹ سنو کو وہ با آسانی اپنے دل کی بات سمجھا سکا تھا۔

کمرے میں مہنگی گلاب کی پتیوں کی مہک اب ان دنوں کی زندگیوں کو بھی مہکانے لگی تھیں۔

☆☆☆

دل گزرو

ام مریم

چھبیسویں قسط کا خلاصہ

حمدان کے اس اچانک ہو جانے والے نکاح کی خبر اس کے گھر والوں پہ غانیہ سمیت بجلی بن کر گرتی ہے، منیب چوہدری ایک بار پھر اپنا سنگلاخ فیصلہ سناتے ہوئے حمدان کو حکم دیتے ہیں طلاق کا، اس کی شادی شانزے سے کرنے کا ان کا فیصلہ اٹل ہے۔  
قدر اس بندھن کو قبول نہیں کر پار ہی، سلیمان سے زندگی میں پہلی بار بدتمیزی سے پیش آتی ہے، مگر پیش نہ چلتی دیکھ کر علی شیر سے حمایت اور مدد حاصل کرتی ہے، علی شیر اسے نئی نئی پنیاں پڑھا رہا ہے۔  
آپا اگ سلیمان پہ دباؤ ڈالتی ہیں، سلیمان کا ڈپریشن بڑھ رہا ہے۔

ستائیسویں قسط

اب آپ آگے پڑھیے



تشویش یکدم بڑھ گئی، اضطراب میں اس جہانک اضافہ ہوا کہ خدشات میں لرزنا دل دماغ یکدم خالی ہو گئے، جرم کے ہر وہ میز حیاں آخر کے پیچھے آیا تو شام اپنے پر مکمل طور پر سیٹ کر رات کا لبادہ اوڑھ چکی تھی، فضا میں گرمی اور جس تھا، جسے حجاب نے اپنے طور پر کم کرنے کی کوشش کی تھی، ممکن دھوکہ دینے جلا کر سب اس وقت آگن میں موجود تھے، اس شخص سمیت، کرسیوں پہ براجمان مگر ہر سو خاموشی تھی، غائبی کی تو ہر ادا سے واضح اضطراب بھی جھلکتا تھا، وہ بار بار پیشانی پہ ایسے ہاتھ پھیر رہی تھی گویا پسینوں میں ڈوب رہی ہو۔

”دیر ہے..... آپ کچھ بولنے کیوں نہیں، اس طرح سب کو اٹھا کیا جیسے بہت خاص بات ہو اور خود خاموشی اوڑھ کر بیٹھ گئے ہیں، سب خیر ہے نا؟“ اشارہ جانے سزاوارتہ کیوں گھبرا رہا ہے۔“ اس خاموشی کو توڑنے والی کینیز تھی، حمدان نے آواز کیوں نہ کر دے کے پلر سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا، اس نے کسی نے خاص توجہ نہیں دی تھی، بالخصوص کینیز ان کے شوہر اور شانزے نے، ان کی توجہ کا مرکز منیب چوہدری تھا، جس کا بیٹا ہے، غائبی نے البتہ ضرور اک نظر بٹنے کو دیکھا اور ہونٹ کچلتے ہوئے تکی تکی سانس لیتی، حجاب نے نظروں ہی نظروں میں بھائی کو آکر اپنے برابر نشست سنبھالنے کا اشارہ کیا تھا مگر حمدان نہ سمجھا نہ عمل کیا، وہ متوش مضطرب نظروں سے باپ کو دیکھتا تھا جو اس کی زندگی کا سب سے اہم فیصلہ کرنے جا رہے تھے، ان کی زبان سے لکھے لفظوں پہ اس کی آئندہ زندگی کی خوشیوں سرت یا پھر بربادی کا دار و مدار تھا، ایسا ہوتا ہے، قدرت اپنے بندوں کو اکثر اوقات انتہا اختیار کر دیا کرتی ہے کہ وہ اس کے باقی ماندہ بندوں پہ زندگی سہل اور تنگ کرنے کی پوزیشن میں آجائیں، یہی تو اعمال ہیں، جنہوں نے باعث بننا ہے آخرت میں جنت و جہنم کا، جو خیر ماننے کا اسے خیر ملے گی، جو شر پھیلانے کا فساد برپا کرے گا، وہ اپنا انجام حشر میں دیکھ لے گا بیٹیک۔

منیب چوہدری نے گلا کھکا اور بات کے آغاز سے قبل اک نظر یارمن کو دیکھا، وہ انہیں ہی دیکھ رہا تھا، اس کی نظروں کا ٹھکر اور سم ان سے مخفی نہ رہ پایا، انہیں لگا وقت ہیں سال پیچھے چلا گیا ہو، ان کے سامنے آٹھ سالہ یارمن کھڑا ہوا ان سے انتہاء آمیز انداز میں اپنی کوئی فرمائش کو خد نہواتا ہوا، معصوم چہرے کے بسور تے تاثر پہ اک مان اک بھروسہ اور اک آس تھی، وہ مان جو اک لاڈلے بیٹے کو پیار کرنے والے باپ پہ ہو سکتا ہے، وہ بھروسہ جو محبت کا ذائقہ چکھ لینے کے بعد قائم ہو سکتا ہے، وہ آس جو خود آگاہ ہوئی ہے ٹوٹ ہی نہیں سکتی، انہوں نے گہرا سانس بھرا اور خود کو ڈھیلا چھوڑ دیا، انہیں لگا یہ سب احساس گزرتے وقت نے خود انہوں نے اپنے یارمن سے جھین لے ہوں، ان کے سچ سے یہ سارے خوب صورت جذبے کب اپنی موت مرے انہیں احساس ہی نہ ہوا۔

کیا وہ پھر صرف غائبی کے لئے بنے تھے؟

نہیں تو وہ غائبی کی وجہ سے سب کے لئے سنگناخ چٹان بن گئے تھے، خاص کر اپنی اولاد کے معاملے میں، انہیں جانے کب کیوں یہ خوف لاحق ہو گیا تھا اگر وہ ذرا سا بھی ڈھیلے پڑے تو بیوی کی طرح اولاد بھی سر پہ چڑھ کے تانے لگے گی، بیوی..... جسے انہوں نے دل پہ بھی چڑھنے کی

اجازت نہ دی تھی، وہ سر پہ کیسے اور کیونکر چڑھ جاتی مگر وہ ایک تلخ تجربے اور ایک سنگین غلطی سے ایسے خائف ہوئے ایسے بددل ہوئے کہ پھر اسے دہرانے سے ہمیشہ کی تو پہ کر لی، ایسی تو پہ کر لی کہ پھر اس جذبے کو بھی دل میں ابھرنے ہی نہ دیا، اس کی آپاری اور اس کی پرورش تو بہت دور کی بات تھی۔

”مجھے لگتا ہے سوئیٹ اینڈ لوگ ماموں جان کا میرے لئے خصوصی سر پرانز ہے، ہے نا ماموں؟“ خاموشی طویل ہو گئی، اضطراب انتہا کو پہنچا، انتظار کی حد ہو گئی تو شانزے کا اتنا ڈالا پن خود کر آیا، وہ اٹھلا کر چلتی منیب چوہدری کے پیچھے آن کھڑی ہوئی، اپنا ہاتھ ان کے کندھے پہ رکھا، منیب چوہدری چونک گئے، حمدان حد سے بڑھ کر اکتا گیا، سر اٹھا کر تاریک آسمان پہ نگاہ کی جہاں گاؤں کی رات اپنی مخصوص خاموشی اور خالص پن کے ساتھ اتر رہی تھی، اس خاموشی میں بھی کئی کتوں کے بھونکنے، کھیتوں سے واپس آتے بیلوں کے گلے سے بندھی کھینچوں کی آوازیں مکمل مل جاتیں، جھن کا بس ایک ہی بلب روشن تھا مگر اس کی روشنی کو نہ کھدروں کو روشن کرنے میں ناکام نظر آتی تھی، اس وقت گھر کے کئی افراد جمع تھے مگر عجیب سی خاموشی پھر بھی ماحول کا حصہ تھی۔

”بتائیں نا ماموں! کون سا سر پرانز ہے؟ آپ نے گاڑی خریدی ہے میرے لئے یا پھر منی مون ٹرپ کے لئے یورپ کے ٹکٹ گفٹ کر رہے ہیں، ایسا کریں گے تو آپ ہی کریں گے باقی نہ تو گھر میں کسی کو اس شادی کی اتنی خوشی ہے کہ مجھے ایسا گفٹ دے سکیں نہ آپ کے بیٹے میں ہی کوئی ایسی امنگ ہے۔“ وہ پھر بولی تھی، حمدان بر طرز یہ نگاہ ڈال کر بالخصوص جھلکا یا، گھر والوں سے اور حمدان سے شکوہ پرانا تھا، منیب چوہدری اک مضطرب نگاہ بھر بیٹے پر اور پھر بھانجی پر ڈالی، ایک بار پھر گلا کھکا رہا، ہمت جمع کی، یہ ہمت ہی تھی جو جمع نہ ہو رہی تھی، آج پھر گا بھی بھلا کیونکر صاف ہو پاتا۔

”کینیز.....! اگر ہم یہ شادی روک دیں، نہ کریں۔“

”کیا.....؟“ ایک غیر یقینی کا عالم تھا گیا، سب سے بلند آواز کینیز کی ہی تھی، حمدان اور غائبی نے چونک کر ٹھٹک کر اس شخص کو دیکھا، انہیں کم از کم اس بات کی توقع تو ہرگز نہ تھی، شانزے کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

”کیا کہہ رہے ہیں دیرے، آپ ہوش میں ہیں؟“ کینیز بیٹھے سے اٹھ کھڑی ہوئیں، ان کا جسم شدت غیبی سے کاپٹنے لگا تھا، ان کے شوہر کی حالت بھی ان سے کچھ مختلف نہ تھی، شانزے کی کیفیت میں فرق نہ آیا۔

”آپ مذاق سناری زندگی نہیں کر سکے مگر اب ایسا بھیا یک مذاق، دیرے بیچ تو بوجے پر کھڑی تھی جیسے..... پھر اب کیا ہوا؟“ کینیز اپنے گال پیٹ رہی تھی جیسے، اس شخص کا رنگ خفیر تھا، نظریں جھکی ہوئی تھیں، حمدان کو باپ پہ رحم آیا، کس مشکل میں گرفتار کر دیا تھا اس نے انہیں۔

غائبی کا پورا وجود بالکل سرد ہو چکا تھا، خوف کا ایسا عالم تھا کہ ناقابل بیان، حجاب نے بے اختیار حرم کو کنبی ماری، وہ چوٹی تھی اور اسے چپ رہنے کا اشارہ کیا، جس کی سکر اہٹ اس انداز میں پھل رہی تھی کہ ہنسی میں بدلنے کو بھی چاہیے۔

”میں بہت شرمندہ ہوں، صورت حال کی سنگینی کا مجھے پورا احساس ہے، میری بہن مگر مجبوری ہی ایسی آپڑی ہے کہ.....“ وہ بہت ہمت کر کے بولنا شروع ہوئے تھے، مگر کنیز نے جیسے ہی ان کی بات کاٹ دی۔

”کیا احساس ہے آپ کو دیرے، کیا احساس ہے، میں تو سوچ بھی نہ سکتی تھی آپ میرے بھرا ہو کر میرے سر پہ ایسی خاک بھی ڈال سکتے ہیں، اللہ غارت کرے، کون سی مجبوری آپڑی آخر.....؟“ وہ زار و قطار رونے لگ گئی تھیں، شانزے کا سکتہ ٹوٹا، وہ پھر کر تھلا کر تند خیز موج کی طرح بے قابو ہوتی حمدان کی طرف آئی اور اس کا گریبان پکڑتے ہی زوردار جھٹکا دیا۔

”سب تمہارا کیا دھرا ہے نا، میں تمہیں معاف نہیں کر سکتی۔“ وہ اتنی وحشت سے چلائی کہ روتی ہوئی کنیز کی آواز بھی دب گئی، باقی سب پہ جیسے سکتہ طاری تھا، حمدان نے گھبرا کر اس کے ہاتھوں سے گریبان چھڑانا چاہا مگر وہ تو ساتھ چپکی جا رہی تھی، پیچھا عجیب آزمائش میں پڑ گیا۔

”حمدان کا نکاح ہو چکا ہے، جس ہا حشیت شخص نے یہ نکاح کیا ہے میں اس کے سامنے انکار کی پوزیشن میں نہیں ہوں، میری پندرہ سالوں کی محنت اکارت جانے کا احتمال ہے۔“ وہ سر جھکائے جمرانہ انداز میں گویا ہوئے، روتی ہوئی کنیز کی آنکھیں پھٹتی مفلتوں سے باہر ابل پڑیں، شانزے نے قہرا کر حمدان کو دیکھا، جو اس سے اپنا آپ چھڑا کر ماں کے پاس آکھڑا ہوا تھا، اچھا خاصا شرمسار نظر آتا تھا۔

”نکاح ہو چکا ہے؟“ کنیز کی بیٹی جھینپی آواز نکلی۔

”کب.....؟“ اور آپ اب عین شادی پہ تیار ہے ہیں؟“ کنیز کا شکوہ بجا تھا، غلط نہ تھا، اس شخص سے نظریں نہ اٹھائی گئیں۔

”میری سیاسی پارٹی کے چیئرمین نے اپنی بیٹی سے نکاح کر لیا ہے، ایک دن پہلے ہوا، کیسے پہلے بتایا تمہیں؟“ وہ خود لاچار نظر آ رہے تھے، کنیز کا بس نہ چلتا تھا کیا نہ کر ڈالیں، شانزے تو ہاتھ قاعدہ بین ڈال رہی تھی جیسے۔

”وہ کون ہوتا ہے ایسے نکاح کرنے والا، اور حمدان نے کیونکر مان لی بات، یہ تو خود سے ترا رہا تھا۔“ کنیز پھر دہائی دینے لگیں، شکوہ کرنے لگیں، روتی ہوئی شانزے کو گلے لگا لیا تھا۔

”ان کی کوئی مجبوری تھی، بیٹی کی جہاں شادی ہو رہی تھی، وہاں ایسا مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا کہ شادی نہیں کر سکے، عزت بچانے کو۔“

”بیٹی نے کہیں منہ کالا کر لیا ہوگا، عزت بچانے کے لئے باپ نے اپنا گند آپ کے گھر پھینک دیا اور آپ نے چاٹ بھی لیا دیرے۔“ پھری ہوئی کنیز تلخ کلائی پہ اتری تو راج کے تیغ بولی، اس شخص نے سر نہیں اٹھایا، حمدان کا چہرہ ضرور شدت غنیمت سے تپ کر انگارہ ہوا۔

”گستاخی معاف ہو جان، مگر وہ لڑکی میری عزت ہے اب، اور میں اس کے لئے ایسی گفتگو کی کسی کو اجازت نہیں دے سکتا۔“ اس کی خاموشی ٹوٹی تھی اور قہر برپا ہوا، اس شخص نے سر اٹھا کر غیرت مند بیٹے کو انک نظر دیکھا، شانزے کی ہال دھائی میں افسانہ ہوا، کنیز تو بالکل بلبلانہ تھی۔

”اس کے تئیر دیکھے آپ نے دیر! مجھے تو سب کیا دھرا ہی اس کا لگتا ہے، اللہ غارت کرے

ایسے لوگوں کو جو دوسرے کے دشمن اجاڑ کر اپنے گھر کی بنیاد رکھ دیتے ہیں۔“ کنیز دوپٹہ پھیلا پھیلا کر بددعائیں دینے لگیں، شانزے دھاڑ کی آواز کے ساتھ زمین بوس ہوئی، ایک دم ماحول میں اضطراب اور وحشت سی پھیل گئی، کنیز اور شانزے کے والد کے ساتھ غانیہ اور فیب چوہدری بھی تڑپ کر اس کی جانب لپکے۔

”خبردار کو کوئی ہاتھ نہیں لگائے گا میری بیٹی کو، بس جو کچھ کرنا تھا آپ لوگوں نے کر دیا۔“ کنیز کے شوہر نے پھنکارنے کے انداز میں کہہ کر فیب چوہدری کا ہاتھ بدتیزی سے جھٹکا اور جھٹک کر شانزے کو اٹھالیا، کنیز الگ دھمکیاں اور بددعائیں دے رہی تھیں، رورہی تھیں۔

”اگر میری بیٹی مر گئی تو میں تم سب کو جیل بھجوں گی، یاد رکھنا۔“

ماحول اچھا خاصا کشیدہ ہو گیا تھا، فیب چوہدری نے ان ناراض لوگوں کے ساتھ جانا چاہا مگر کنیز اتنی خفا تھی کہ بھائی کو دھکے مار مار کر دھکا رہا تھا، وہ چلے گئے، فیب چوہدری وہیں کھڑے رہ گئے تھے، ہر کوئی اپنی جگہ پہ پریشان اور بے چین تھا، اس شخص نے بے حد شاکی نگاہ حمدان پہ ڈالی تھی، جس میں سر دکاٹ کی لپک بہت تیز تھی اور پلٹ کر اپنے کمرے میں بند ہو گئے، پیچھے پھر بھی خاموشی تھی، ہر کوئی نظریں جراتا اور لم سم کھڑا تھا۔

☆☆☆

رات کا سمندر ہے

رات بھی محبت کی

بات کا اجالا ہے

بات بھی محبت کی

گھات کی ضرورت ہے

گھات بھی محبت کی

زخم گرم خاموشی

سج سج سرگوشی

چور چور دروازے

کون چپ کے آیا ہے

آرزو کے جنگل میں

راستہ بتایا ہے

جھینپتے ہوئے آئینے نے

درخت سے تل کر

کچھ نہ کچھ بھجایا ہے

آسمان کی کھڑکی میں

سکھ بھری شرارت سے

چاند مسکرایا ہے

چاند مسکرایا ہے  
چاندنی نہائی ہے  
خوشبوؤں کے موسم نے  
آگ سی لگائی ہے  
عشق نے محبت کی  
آنکھ چومنا چاہی  
اور ہوا کے حلقے میں  
شورخ سی نزاکت سے  
شارخ کسمائی ہے  
رات کا سندور ہے  
رات بھی محبت کی  
بات کا اجالا ہے  
بات بھی محبت کی  
بات کے سورے میں  
زندگی کے گہرے میں  
روح ٹٹھائی ہے  
وصل جھلایا ہے  
دل نے بند سینے میں  
حشر سا اٹھایا ہے  
کون چپ کے آیا ہے  
وہ کمرے میں آیا تو بالکل ریلیکس تھا، اشمیلال کا وقت کٹ گیا، اب تو ہونٹوں پہ مسکراہٹ  
چل رہی تھی، خواہ مخواہ بلا وجہ، فیصلہ کیا حق میں ہوا، سارے خدشات جاتے رہے۔  
(تو آخر میں نے بلکہ میرے مقدر نے جنہیں جیت لیا پیاری لڑکی میری محبت سے زیادہ میرا  
نصیب زور آور لگلا) اس کے چہرے پر مسکراہٹ کا گلاب کھلا۔  
جب آنکھوں میں شام اترے  
پلکوں پہ شفق چھوٹے  
کا جل کی طرح اس کی  
آنکھوں کو دھنک جھولے  
اس وقت کوئی اس کو  
آنکھوں سے میری دیکھے  
پلکوں سے میری چوے  
وہ اٹھ کر کمرے کی میں آن کھڑا ہوا ہر دم لڑتی ہوئی غفا نظر آئی وہ لڑکی روح کا درماں ثابت ہوئی

تھی، جیسی نظروں سے دیکھتی ہوئی کبھی ناک چڑھا کر ہونٹ سکڑ کر بات کرتی ہوئی۔  
اس کا ہر انداز ڈرہا تھا  
اس کی ہر ادا جان لیوا تھی  
وہ پھر مسکرایا، لیوں میں سلگتی مسکراہٹ اور دھواں خارج کرتے ہونٹ۔  
ساڑھے پیچھے جگ رلیا  
اسی تیرے پیچھے رل گئے آں  
وہ سرشار سا سرشار تھا، ایسا اطمینان اندر اترتا تھا کہ اگلی پچھلی اذیت کے مداوے ہو گئے تھے۔  
(کیا رد عمل ہوگا بھلا تمہارا، یہ جان کر کہ جنہیں ساری عمر مجھ سے ہی لڑنا اور مجھ سے ہی پیار کرنا  
ہے) اس کی سوچوں نے دور تک سوچا، مسکراہٹ گہری ہوئی، اس کا دل چاہا، ابھی اسے دیکھے، اس  
سے ملے، کم از کم اس اہم ترین تہذیبی کے بعد اس کا رد عمل تو معلوم ہو۔  
(پتا نہیں وہ اس بندھن پہ راضی بھی ہے کہ نہیں)  
دل میں اک اور خیال اور خدشے نے سر اٹھایا، اس نے مہر اسانس بھرا اور خود کو ڈھیلا چھوڑ  
دیا۔  
(جو بھی ہے جیسا بھی ہے، اب تم میری ہو تو سب خیر ہی خیر ہے، آخر اختلاف کرو گی بھی تو  
کب تک، اگر میں نے جنہیں جیت لیا تو تمہارا دل بھی جیت لوں گا)  
اس کی مسکراہٹ جھلنے لگی، شرارت سے شوخی سے۔  
ہر ایرے غیرے سے ملتا تھوڑی ہے  
میرا دلبر ایسا دیر تھوڑی ہے  
اک بار اسے گہرے میں آ لینے دو  
وہ میری بانہوں سے جھڑا تھوڑی ہے  
میں اس کو بے شک اپنا کہہ سکتا ہوں  
اس نے اب تک ایسا مانا تھوڑی ہے  
اپنی سوچوں کے بہک اٹھنے پہ وہ خود جینپ کر رہ گیا، تب ہی ایک دم دروازہ کھلا اور حجاب  
کے ساتھ حرم بنا جائزات بنا دستک اندر گھس آئیں، دونوں کھٹکھٹائی ہوئیں ایک ساتھ آ کے اس کے  
دائیں بائیں کندھوں سے لپٹی تھیں۔  
”بہت مبارک ہو یہ جیت پہ محبت برادر۔“ حرم چبکی، حمدان کا رنگ بے تحاشا تھمتھا اٹھا،  
اس نے مصنوعی کھٹکی سے اسے گھورا۔  
”تم نے اس بلی کو بھی سب بتا دیا۔“ اس کا اشارہ حجاب کی شریر مسکراہٹ کی طرف تھا، وہ  
ایک دم کھٹکھٹائی۔  
”جی بالکل بتا دیا کہ آپ اندر ہی اندر کون سا کارنامہ سرانجام دے چکے ہیں، میں تو اتنی خوش  
ہوں، بتا نہیں سکتی، مبارک پاؤں میں دوں گی، بہت مہنگا گفٹ لوں گی، ٹریٹ لوں گی اور.....“  
”ابھی اور بھی کچھ باقی ہے؟“ حمدان نے اس کے سر پہ پیار بھری چپت لگائی، اس کی ہلکی



بے قابو ہوئی۔  
”بالکل جناب باقی ہے، بھلا کیا؟“ اس نے مسکراہٹ دہائی، حمدان نے مہنوں کو لایا  
انداز میں اچکا یا تب گویا ہوئی تھی۔

”اور بھابھی سے ملاقات..... جس کا اربج آپ کریں گے، گھر پہ ہوگی یہ ڈیٹ چاہے کسی  
تفریح گاہ میں یا ہوٹل میں، آپ جانیں۔“ اس نے شرارت بھرے انداز میں کہا، حمدان خفیف سا  
ہو گیا۔

”جو تم دونوں کی موجودگی میں ہوگی، وہ واقعی ڈیٹ ہوگی؟“ اس کا انداز جلا کٹا تھا، ایسا کہ  
دونوں ہی کھٹکھٹا کر ہنس پڑیں۔

”میں مذاق نہیں کر رہی ہوں بھائی، ہم نے بھابھی کو دیکھا ہے اور کل ہی۔“ جناب کا انداز  
ایسا اصرار آمیز تھا کہ حمدان کو بخنبدہ ہونا پڑا۔

”ابھی تو ایسا ممکن نہ ہوا شاید، سر سلیمان جب بلوائیں گے تب میں کوشش کروں گا کہ.....“  
”یہ کیا بات ہوئی بھائی، پہلے وہ بہت بڑے آدمی ہیں، مگر اب آپ کے ساتھ بہت خاص  
تعلق ہے ان کا، بلکہ انہیں تو خود آپ کو الو ایٹ کرنا چاہیے، آپ کی ٹیمپلی کے ساتھ اپنے گھر۔“  
جناب چمک کر بولی تھی، حمدان نری سے سہاؤ سے مسکرانے لگا۔

”تمہاری بات اپنی جگہ بالکل ٹھیک ہے مگر سویت ہارٹ، یہ سب کچھ نہ نازل حالات میں ہوا  
ہے نہ ہی خوشی سے، یہ تو شاید مجبور یوں کے سودے طے ہوئے ہیں، آپ نے دیکھا اس بات کے  
کھلنے کے بعد ہماری ٹیمپلی میں یکدم کتنا تاؤ پھیل گیا ہے، یقیناً اس سے بڑا کراس ادھر ہوا ہوگا  
تب یہ سب ہو سکا ہے۔“ وہ یکدم کتنا بخنبدہ ہو گیا تھا، جناب نے منہ بنالیا۔

”یہ کیا بات ہوئی بھلا، آپ کی بھابھی کے ساتھ بھی کوئی کٹ مٹ نہیں کہ ان کے ذریعے یہ  
ملاقات آسان ہو سکے۔“ اس نے پھر آس باندھنی چاہی، حمدان نے گہرا سانس بھرا۔

”محترمہ کے ساتھ تو ایسا دیا کوئی بھی تعلق نہیں، اس لئے صبر کرو۔“  
”آپ تو میری سوچ سے زیادہ کئے ٹکے، کوئی گل ہی نہ کھلا سکے۔“ وہ سخت چڑھ گئی، حمدان کے

ساتھ حرم کی بھی ہنسی نکل گئی۔  
”نہیں اب اتنے بھی سیدھے نہیں ہیں بھائی صاحب، خوابوں اور خیالوں میں تو بہت سے  
سنہرے گل کھلائے ہیں۔“ حرم نے گویا اس کا بھاغڑا پھوڑا، حمدان اسے ہاتھ دھوڑنے لگا مگر وہ

ترنگ میں بھی باز نہ آئی۔  
”وہ جو ایک گانا نہیں ہے۔“ اس نے ہاتھ دھوڑنا شروع کیا۔

آنکھیں بند کر کے جو ایک چہرہ نظر آیا  
وہ تہی ہو..... او صمیم

اس شرارت نے جناب کو بڑا الحاف دیا، بڑی تحریک دی، وہ خود بھی اس کے ساتھ اس چھی  
چھاڑ کا حصہ ہوئی، اس شرارت کو طول دیا۔

”نہیں، یہ اتنے سیدھے کہاں، اتنے شریف کہاں، ان کا یہ حال ہے کہ۔“

آنکھیں کھلی ہوں یا ہوں بند

دیدار ان کا ہوتا ہے

کیسے کہوں میں او یار

یہ پیار کیسے ہوتا ہے

حمدان نے نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبا لیا، دل انوکھے سے سرتال پہ دھڑک اٹھا، کتنا فرق تھا  
شانزے اور قدر کے ذکر میں، وہ کتنا ریلیکس کتنا سرشار ٹیل کر رہا تھا خود کو۔

”کیوں بھائی، ایسا ہی ہے؟“ جناب نے اسے زچ کرنا چاہا مگر وہ الٹا انہیں ششدر کر گیا۔  
”نہیں..... اس سے بھی کچھ زیادہ ہی ہے، وہ گانا کیوں بھول گئی ہو بھلا تم۔“

رنگین ہے تو رنگوں سے بھی زیادہ

شوخ رنگی ہو رہ کے بھی زیادہ

لے جائیں گے تم کو اٹھا کے

تیرے بنا لاگے نہ مورا جیا

اس نے ہاتھ دھوڑنا شروع کیا، دونوں کے منہ جہت سے کھل گئے، اب ہنسنے کی حمدان کی باری  
تھی، جناب نے اس کے کاندھے پہ کھونسا دے مارا۔

”ہمارا اندازہ بالکل درست تھا، آپ ہرگز اتنے شریف نہ تھے جتنے بنتے تھے، جتنے لگتے تھے،  
اب شرافت سے اپنی پہلی سے آخری ڈیٹ تک کی روداد ہمیں سنا دیں، بہتری اسی میں پوشیدہ ہے،  
یہ بھی بتائیں پہلا گانا کس نے گایا تھا، پہلے اظہار محبت کس کی جانب سے ہوا؟“

جناب اس پہ گرفت کر گئی، وہ زیادہ ہی شارپ ہو رہی تھی، حمدان نے سر دھڑکا۔  
”اسٹاپ اٹ کا کی، ایسا کچھ نہیں ہوا تھا اس لئے کہ یہ کوئی فلم نہیں تھی۔“ اب کے اس کے

لہجے میں بڑے پن کا رعب تھا، جناب مگر کہاں متاثر ہوئی۔  
”آپ ایسے ہمیں چمکائیں دے سکتے ہیں بھائی! بچ تو اگلا پڑے گا، چلیں یہ نہ سہی صرف یہی  
بتا دیں محبت حاصل کرنے کو کتنے دھانف پڑے اور کتنی دعائیں مانگیں۔“ جناب کے سوال پہ اس

سے قبل کہ حمدان جواب میں کچھ کہتا، بند دروازہ تھپتھپاتی غائب اندر آ گئیں، اس سے قبل کہ کچھ  
بولیں حرم اور جناب ان سے لپٹ گئی تھیں۔

”ہم سب کو یہ خوشی مبارک ہو ماما، چڑیل سے جان چھوٹی۔“  
”شش..... چپ کر بیٹے۔“ غائب نے گہرا کر بنی کے منہ پہ ہاتھ رکھا، وہ غصا ہی ہو گئی۔

”وہ چاہتی ہے ماما، آپ بھی بس.....“

”بیٹے آپ کے چہا بہت ڈسٹرب ہیں، بہت ڈس ہارٹ، میں ان کی وجہ سے بہت پریشان  
ہوں، آپ لوگ بھی اب آرام کرو، اپنے اپنے کمرے میں، بہت ہو گیا ہلہ گلہ اور شور شرابا۔“

”پاپا کے اپنے کیے غلط فیصلے ان کو پریشان کرنے کا باعث بنے ہیں ماما، انہوں نے کبھی ہمارا  
خیال ہی نہ کیا۔“ جناب کے گلہ آمیز لہجے میں دکھ کی بھی آمیزش تھی، غائب نے چونک کر اسے دیکھا،  
حمدان بے حد خاموش بیٹے پہ بازو لیپنے ماں کو دکھ رہا تھا، جو اس کی سمت متوجہ نہ تھیں۔

نہ میرے لطف پہ چہاں نہ اپنی انکھن پر  
مجھے تو یہ شخص ہر شخص سے جدا ہی لگا  
کوئی دسویں ہار کی ٹرائی پہ اس کی خشک آواز سننے کو ملی تھی۔  
”ہیلو؟“

”تو یہ ہے، ایسا بھی کیا بندہ معروف کہ کسی کو بات کرنے کو بھی میسر نہ ہو۔“ حجاب نے کوفت و بے زاری کا مظاہرہ کیا۔

”زحمت کس سلسلے میں کی۔“ ادھر اس سے بڑھ کر بے زاری کا مظاہرہ ہوا تھا، حجاب کو اچھا خاصا محسوس ہوا برا لگا، بلکہ ناگوار لگا۔

”محترم، آپ کن ہواؤں میں ہیں کہ آپ کے بغیر ہمارا گزارہ نہیں۔“ انا کو چوٹ پہنچی تھی، اس درجہ بے اشتنائی برداشت نہ ہو سکی، سلگ کر رہ گئی۔

”نہیں، میں بہت اچھی طرح جانتا ہوں اور جان چکا ہوں کہ یہ گزارہ بہت اچھا ہو سکتا ہے۔“ ادھر سے وہی پتھر پھوڑے گئے، حجاب کو اب کے توہین کا بھی احساس ہوا۔

”تو پیچھے ہٹنے کی وجہ یہی تھی، بہت اچھا ہوا، مشقت میں پڑنا ویسے بھی ہر کسی کا دل گردہ تھوڑی ہوتا ہے۔“ طنز اس کی فطرت بھلے نہ تھا مگر اتنا ہرٹ ہوئے کہ جتلا ڈالا، عمر ز ہر خند سے مسکرایا۔

”میں نے کوئی وعدہ دے دھند نہیں کیے تھے کہ آپ مجھے پیچھے ہٹنے کا الزام دے سکیں۔“ اس کا ماتھا ٹھکنوں سے اٹ گیا تھا، حجاب کا دل یا سیت سے بھر گیا، عجیب سی اذیت سے دوچار ہو گئی۔

”میں نے بھی آپ کو یہ نہیں کہا، خوش فہمی میں جتلا نہ ہوں، مجھے بھی آپ سے ایسی کوئی خواہش نہیں تھی۔“

پندار کی حفاظت ضروری ہو گئی تھی، چاہے اس کوشش میں دل کھلا جانا یا زخمی ہوتا۔  
”گنڈ، ایک لڑکی کو اتنا باوقار اور سمجھ دار تو ہونا ہی چاہیے۔“ دوسری جانب عمر بھی چاہے جیسے جلا کڑھا سکا مگر بھرم اس نے بھی قائم رکھا، دونوں کے مابین جان لیوا خاموشی در آئی، جسے عمر نے ہی

تدرے توقف سے توڑا۔  
”میں نے پوچھا تھا اس زحمت کی وجہ؟“ وہ پھر طنز کر رہا تھا، حجاب چونک گئی مگر اسانس بھرا۔

”بھائی کی شادی میں انوائٹ کرنا مقصد تھا، مگر آپ تو شاید آنا ہی نہ چاہیں گے۔“ عمر ایک دم الجھا۔

”بھائی کی شادی کی اتنی خوشی ہے کہ دشمنوں کو بھی انوائٹ کر لیا۔“ وہ مسلسل انکار دے چارہا تھا، حجاب کو اس کا موڈ معمول سے زیادہ برہم لگا مگر معاف کرنے کو وہ پھر بھی تیار نہ ہوئی، رعایت

مناسب نہ تھی، غصہ ہی انوکھا تھا، اس پر۔  
”یہ دشمن پہلے بھی انوائٹ کئے تھے، دشمنوں کی یادداشت خاصی کمزور ہے۔“ عمر نے سر آہ بھری اور اسے اس کی حیثیت واضح کرانا چاہی، پتا نہیں کس بات کا غصہ اس طرح نکل رہا تھا ایک

دوسرے کو نیچا دکھا کر۔  
”مگر آپ انوائٹ کرتیں تو کبھی شامل نہ ہوتا، خالہ کو انکار نہیں کر سکا۔“ حجاب کو جانے کیا ہوا

”سنا کو ایسے نہیں کہتے بیٹے، میں نے آپ کو کبھی ان سے بدگمان تو نہیں کیا۔“ انہیں حجاب کے انداز گفتگو نے ہرٹ کیا تھا، حجاب نے گہرا سانس بھرا۔

”سو رہی ماما!“ اس نے سر جھکا لیا، آنکھوں میں آنسو تھے۔  
”اچھا چلو اپنے کمرے میں جاؤ، رات بہت ہو گئی ہے۔“ غانیہ نے اس کی کیفیت سمجھتے اس کا

سر تھپکا، ماں نہیں بیٹی کے شکوے سے لے کر دل کی بات سے بھی آگاہ تھیں، اب ان کی دعاؤں کا رخ اسی کی جانب ہونے والا تھا، سارے کا سارا۔

”والدہ، آپ خفا ہیں مجھ سے؟“ حرم و حجاب کے جانے کے بعد غانیہ بھی اسی کم صم کیفیت میں پلٹی تھیں، جس کا شکار وہ حجاب کی آنکھوں کی نمی کی وجہ سے ہو گئی تھیں، حمدان کی آواز پہ چونکیں اور پلٹ کر تجھیر آ میر نظروں سے اسے دیکھا۔

”نہیں بیٹے، کیوں؟“  
”آپ کو لگتا ہے شاید کہ یہ سب میری کسی انوائٹ کا نتیجہ ہے یا پھر۔“ متاسفانہ سانس بھر

کے کہتا وہ اپنی صفائی پیش کرنا چاہ رہا تھا کہ غانیہ نے بے اختیار اسے ٹوک دیا تھا۔  
”مجھے تو بس اتنا پتہ ہے کہ یہ میری دعاؤں کا ثمر ہے، جو میں نے اپنے بیٹے کے سکون خوشی

اور اچھی زندگی کے لئے رب سے مانگی تھیں۔“ وہ اب مسکرا رہی تھیں، یہ مسکراہٹ اتنی خالص تھی کہ شبہ کیا ہی نہ جاسکتا تھا، پیار سے اس کا کندھا تھپکا۔

”پھر آپ چپ چپ سی کیوں ہیں؟ مجھ سے بات بھی ٹھیک سے نہیں کی۔“ حمدان کا اضمحلال تمام نہ ہوتا تھا، غانیہ نے گہرا سانس بھرا۔

”بیٹے ایک وفا دار عورت کے سکون اور مسرت کی وجہ اس کا شوہر اور اولاد کا اطمینان و سکون ہی ہو سکتا ہے، میں تب بھی مطمئن تھی نہ پر مسرت جب آپ لوگ ناشاد اور نسیب مطمئن پھرا کرتے

تھے، میں اب کیسے مکمل طور پر ریلیکس ہو جاؤں جبکہ زندگی کا سانس اپنی حیات کے سب سے کٹھن مرحلے پہ کھڑا ہے، نسیب کو اپنے رشتے کتنے عزیز اور پیارے رہے ہیں میں گواہ ہوں، آج وہ وقت

ہے کہ سب رشتے ٹوٹے اور دور ہوئے نظر آرہے ہیں، ان کی اذیت میں میرا حصہ از خود نکل آیا ہے، لیکن آپ پریشان نہ ہوں، آپ کی زندگی میں جس انداز میں سکھ داخل ہوا ہے مجھے اپنے رب

پہ بھروسہ اور بڑھ چکا ہے، یہ پریشانیاں بھی اللہ ضرور ختم کرے گا انشاء اللہ۔“ جواب ایسا تھا کہ حمدان کی آنکھیں آپوں آپ کی سے بھر گئیں، وہ بے اختیار ہوتا ان کے گلے لگ گیا تھا۔

”آپ ہمیشہ میرے لئے قابلِ فخر تھیں ماما اور رہیں گی۔“ غانیہ نے اسے گلے لگایا، ماتھا چوما،

ذہیروں دعاؤں سے نوازا تھا۔  
”آپ بھی اب آرام کرو بیٹے، جو حالات ہیں ابھی کچھ دنوں تک تو یہ اعصابی جنگ جاری

رہے گی ہی۔“ انہوں نے اس کا کندھا تھپکا، حمدان تائید اسر ہلانے لگا۔  
☆☆☆

مہتاب تھا کہ ستارہ گر یز پا ہی لگا  
وہ اپنی ذات کے ہر رنگ میں ہوا ہی لگا

اماں لی میرے اندر ہا دل  
بارش رو کے کون  
اماں لی میں نے چاند چرایا  
جیون ہوا اندھیر

اماں لی.....  
اماں لی.....

شام کی سرد ہوا کا جھونکا آیا، تب وہ چوکی، اندھیرا پھیلنے لگا تھا، سورج کب کا ڈوب چکا تھا، اس نے بندھی کھولی، سامنے گلابی پتلی پہ ریڑروشنائی سے لکھا سیل نمبر آگیا، اس نے یوں دانت بھیجے گویا سامنے نمبر نہیں خود حمدان آگیا ہو، ایسی اٹھری تھی کہ تب ہی تو پتھر دل رکھنے والا ایس پی اسے پہلی بار دیکھ کر بہوت رہ گیا تھا، ایسے حسن کے لئے کوئی قتل کر بھی سکتا ہے اور ہو بھی سکتا ہے۔  
اب مزید انتظار لا حاصل تھا، وہ اٹھ کھڑی ہوئی کمرے میں آ کر اپنے پیچھے احتیاطاً دروازہ لا کڑ کیا، سیل فون اٹھا کر اس کا نمبر ملائے مفرد چہرے پہ تناؤ سا ابھر آیا تھا، دوسرے سمت تیل جا رہی تھی، اسے عجیب سا اطمینان ہوا، ورنہ سلیمان کے سیل فون سے اس کا نمبر چراتے یہ حدشہ بھی لاحق ہوا تھا اگر یہ نمبر آف ملا تو۔

”السلام علیکم! ایس پی منصف حمدان اسپیکنگ۔“ رابطہ بحال ہو گیا، بھاری بیس والی مردانہ دلکش آواز اس کی ساعتوں میں اتری تو اسے جیسے آگ لگ گئی۔  
”تم نہ بھی بتاتے تو میں اس منحوس آواز سے پہچان گئی تھی یہ تم ہی ہو سکتے ہو، شب خون مارنے والے۔“ وہ چھوٹے ہی برس پڑی تھی، جانے کتنے دنوں کا غبار تھا جو آتش فشاں لاؤے کی طرح سے ہی ابل کر باہر آیا تھا، دوسری جانب چند ٹائٹوں کو بالکل سناٹا چھا گیا۔  
”شمت اپ کون ہو تم؟“ جوابا حمدان نے تحمل رہتے ہوئے بھی ڈانٹ پلائی، قدر اور ہتھے سے اکھڑی۔

”چال باز ہو تم، کیسے ممکن ہے اگر میں تمہیں پہچان گئی ہوں تو تم..... تم ڈرامہ بند کرو، یہ سمجھئے.....؟“ وہ پھنکارنے لگی تھی، حمدان کے ذہن میں جیسے یلخت جھماکا ہوا۔  
”اور آپ ہیں قدر بی بی؟“ وہ کتنا حیران محسوس ہوا، قدر کے اندر بھڑکتی آگ فروزاں ہوئی۔

”میرا نام بھی اپنی گندی زبان سے نہیں لو گئے تم۔“ وہ کاٹ کھانے کو دوڑی، گویا بس نہ چلنا ہو اس کا سر پھاڑ ڈالے، حمدان کو خود یہ کنٹرول کرنا محال ہوا، سارا دن کتنا مصروف رہا تھا، سر کھانے تک کی فرصت میسر نہ آسکی مگر اس لڑکی کا خیال پھر بھی ذہن پہ دستیک دیتا رہا، دل اس کا ناراض اکھڑا اکھڑا سارو پ دیکھنے کو بار بار بے چین ہوا جاتا تھا مگر، وہ خفا تھی اتنی کہ اس کے ذہن کو بھی تناؤ کی کیفیت میں لے گئی۔

”اگر ایسا ہے تو پھر تمیز سے بات کریں۔“ حمدان نے بھی لحاظ سائیڈ پہ کر دیا، اس کے خیال میں وہ بدتمیزی کی انتہا کر رہی تھی۔

بے تحاشا ہنس پڑی۔  
”اس کا مطلب اب پھر می کو زحمت کرنا پڑے گی۔“

”آپ کو اس کی ضرورت ہی نہ تھی، خواہ مخواہ مشقت میں پڑیں آپ، انرجی ویسٹ کی۔“  
عمر آج اس کی طبیعت صاف کر رہا تھا، بے لحاظ کر رہا تھا، یہ بھی آگ لگانے کا باعث بنی تھی، اگر وہ خوشی تھی اس نے بندھن سے تو اسے یہ جتانے کی کیا ضرورت تھی۔

”آپ کی شادی شانزے سے کرادی جا پیے، جتنے آپ بدتمیز اور بے دید ہو، رہے ہیں اس کے ساتھ خوب بیٹھے گی، بی کو ز شادی ہمیشہ دونوں ایسے لوگوں کو کرنی چاہیے جن کے مزاج ملتے ہوں۔“ اب کے وہ اس کا سراسر مذاق اڑا رہی تھی، آگ لگا رہی تھی اور اسے آگ لگی بھی وہ دھڑ دھڑ جلی بھی اٹھا۔

”صد افسوس، عقل کا دعویٰ کرنے والوں کی عقل یہ ماتم کا مقام ہے، اپنے بھائی کی زوجیت میں رہنے والی کے متعلق اس طرح بات کرتے آپ کو کس قسم تو نہ آئی ہوگی بالکل۔“ عمر نے بھی لگی لپٹی رکھے بغیر کھری کھری سادیں، حجاب اس کی جلن باہر آئی دیکھ کر مخطوط ہوئی۔

”مقام ٹھکر ہے کہ وہ بلا بھائی کے سر سے مل گئی، آپ کو یہ سن کر جانے کیسے گئے مگر ہم بھائی کی شادی پاکستان کی سب سے اسٹراٹجک پارٹی کے سربراہ جناب سلیمان خان کی اکھوتی دختر نیک اختر سے کر رہے ہیں، ہو سکے تو ماما کو مبارک باد کا فون کر دیجئے گا۔“ سلگ سلگ کر ایک ایک لفظ چباتی وہ جتلا رہی تھی، پھر فون بند کر دیا، مزید کچھ بھی کہے نہ بغیر، عمر کی ساعتیں چند ٹائیپے کو ساکت ہو گئیں، ساعتوں میں بار بار ایک ہی فقرے کی بازگشت ہوتی تھی۔

”پاکستان کی سب سے اسٹراٹجک سیاسی پارٹی کے سربراہ جناب سلیمان خان کی دختر نیک اختر..... نیک اختر۔“ فون ہنوز اس کے ہاتھ میں تھا، وہ اس زاویے پہ نچمد بیٹھا تھا۔  
”کیا واقعی؟ مگر یہ کیسے ممکن ہے؟“ سوال اس کے ذہن میں کلبلائے تھے، وہ مزید الجھتا جا رہا تھا۔

☆☆☆

اماں نے میری نیندیں بھاگیں  
مجھ سے کوسوں دور

اماں لی میرے سینے ٹوٹے  
چھٹ گئی سینے پھانس

اماں لی میں پیاس سے تڑپی  
دل دریا کے بچ

اماں لی میری سنہ نہ کوئی  
ہاری کر کر بھین

اماں لی میری کشتی ڈوبی  
عین کنارے پاس

”تم ہوتے کون ہو مجھے یہ بات کہنے والے؟“ وہ اس پہ الٹ پڑی۔

”یہ بات اپنے والد محترم سے پوچھیں کہ ان کی رضا مندی سے کون کون سے آپ کے حقوق مجھے تفویض ہو چکے، ویسے اتنی سپردگی اور معصوم تو آپ بھی نہیں کہ بالکل ہی نادانف ہوں۔“ حمدان ایسے بولا کہ اس کے چودہ قہقہے رونق کر کے رکھ دیے، چند لمحوں کو سہی مگر اس کی طراری ہوا ضرور ہوئی، شاید ایسے جواب کی توقع نہ تھی۔

”تم خود کو کچھ سمجھنے لگے ہو، شاید اوقات بھلا دی اپنی۔“ خود کو سنہال کر وہ پھر میدان میں اتری، تاکہ کر نشانہ لگایا، علی شہر کی بات از بر تھی، وہ اس کی تعجب کی انتہا کر دینا چاہتی تھی۔

”جی نہیں..... ایسا کوئی غیر معمولی واقعہ نہیں ہوا میری زندگی میں کہ میں یہ غلطی کروں، آپ فرمائیے یہ رحمت کس سلسلے کی کڑی ہے؟“ اس کے جواب میں لہجہ بے اعتنا اور خشک و سرد ہوا، اشارہ فون کی طرف تھا، قدر نے کچھ دیر کو ہونٹ جھینچے رکھے، پھر جیسے مجبوراً بولی۔

”تم گھر آؤ، مجھے تم سے بات کرنی ہے۔“ حمدان ایک پل کو استعجاب کی کیفیت میں مبتلا ہوا، اگلے پل وہ صاف انکار کر چکا تھا۔

”معذرت خاتون، میں آپ کا یہ حکم ماننے سے قاصر ہوں۔“ قدر کو دھچکا لگا، اس کے گمان تک بھی نہ تھا ایسے جواب کا۔

”کیوں.....؟ ڈرتے ہو پیارے؟ ویسے میں تمہیں اتنا بزدل تو نہ سمجھتی تھی۔“ اس نے اپنی طرف سے اسے غیرت دلانا چاہی، مردانگی پہ حملہ کیا، مقصد ہر صورت میں اس سے بات منوانا تھا، دوسری جانب حمدان بے ساختہ ہنس کر آیا۔

”خود ساختہ اندازے قائم نہ کریں محترمہ، بعد میں آپ ہی ہاتھ ملیں گی کہ میں ہر کام کو اس کے وقت اور طریقے سے کرنے کا قائل ہوں، تمہوڑا سا انتظار کریں، شادی کے بعد از خود پتا چل جائے گا میں کتنا شیر دل اور بے ہاک ہوں، خود اعتراف نہ کریں تو نام بدل دیجئے گا۔“ اسے صاف محسوس ہوا لہجہ کتنا متبسم ہے، قدر کو ایک ایک لفظ کی معنی خیریت نے آگ لگائی سلگایا اور جلا کر خاکستر کر دیا۔

”اپنی بکواس بند کرو سمجھے، اپنی حدیں نہ پھلانگو تو بہتر ہے۔“ وہ ہنسمک کر بولی تھی، اب کے حمدان باقاعدہ ہنسا۔

”حدیں.....؟“ وہ اور زور سے اور زیادہ ہنسا گیا۔

”ساری حدیں سرحدیں میرے نام ہو چکی ہیں، اصل چیز ہی نکاح ہے، وہ تو ہو بھی چکا ہے غالباً، آپ کی باتوں سے خوب اندازہ ہوتا ہے جب آپ بالکل خواہوں میں تھیں۔“ حمدان نے بھی لحاظ کا دامن چھوڑ دیا، اسے بتانے کو الفاظ کے تناسب کا خیال بھی نہ رکھا، قدر کا پورا وجود سنسنا اٹھا، اس نے ایک دم رابطہ منقطع کیا تھا۔

چہرہ ایسے ہنسنے لگا تھا، گویا وہاں کسی نے آگ دھکا ڈالی ہو، اگلے لمحے وہ چوک گئی، وہ کال بیک کر رہا تھا، قدر کو اس جرأت پہ حیرت ہوئی، غصہ آیا، اس نے مشتعل انداز میں کال کالی، وہ پھر بھی باز نہ آیا، قدر نے تیسری بار بھی کال دی، تب چند لمحوں کے توقف سے اس کا فیکسٹ موصول

ہو گیا تھا۔

”دیر و انقب، کال کیوں ڈسکنکٹ کر دی، ابھی تو بات کرنے کا لطف آنا شروع ہوا تھا، ویسے مگر کیوں بلوار ہی نہیں، باور ہا تو اب مجھ سے بھی نہیں جائے گا تمہارے بغیر، تو کیا خیال ہے اپنے پہلے سے بات کرنا جلدی رخصتی کی۔“ قدر نے ہونٹ سختی سے کاٹ ڈالے، جسم پہ جیسے چوٹیاں سی رہتی محسوس ہونے لگیں، خفت کا بے بسی کا احساس اتنا گہرا تھا کہ پیش کے عالم میں فون دور پھینکتی وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی، اس حد تک گستاخی کی وہ تحمل نہ تھی مگر اس حد تک جرأت اسے بخشنے والی موقع دینے والی بھی تو وہ خود تھی، حمدان کو گالیاں دیتی وہ اب علی شہر کو بھی ساتھ تھپیٹ گئی، اس کے مشورے پر عمل کرنے کا یہ خیال زہ بھگت رہی تھی وہ، یہ معمولی ایس پی اس کی توقع سے زیادہ بے باک اور بہکا ہوا نکلا تھا، وہ شکایت بھی کرتی تو کس سے۔

☆☆☆

آج جانے کی ضد نہ کرو

یونہی پہلو میں بیٹھے رہو

ہائے مر جائیں گے

ہم تو لٹ جائیں گے

ایسی باتیں کیا نہ کرو

آج جانے کی ضد نہ کرو

وہ اپنے کمرے میں تھا، اندھیرے میں ڈوبا ہوا، میزک اور شراب سے دل بہلاتا ہوا جانے شراب ابھی شروع کی تھی یا پرانی لت تھی، ادیس نے خاص حیرت کا مظاہرہ نہ کیا۔

تم ہی سوچو ذرا

کیوں نہ روکیں تمہیں

جان جاتی ہے جب

انھ کے جاتے تو تم

تم کو اپنی قسم جان جاں

بات اتنی میری مان لو

دقت کی قید میں

زندگی ہے مگر

چند ہی گھنٹیاں ہیں جو آزاد ہیں

ان کو کھو کر ابھی جان جاں

عمر بھر نہ ترستے رہو

آج جانے کی ضد نہ کرو

یونہی پہلو میں بیٹھے رہو

ہائے مر جائیں گے

ہم تو لٹ جائیں گے

ایسی باتیں کیا نہ کرو

”لٹ تو گئے ہو کہ وہ ایسی باتیں کر چکے، ہاں باری تمہارے مرنے کی باقی رہ گئی تو جو تمہاری حرکتیں ہیں یقیناً جلد یہ حسرت بھی پوری ہو جائے گی، اس حادثہ سے نکل آؤ۔“ اولیس نے آگے بڑھ کر پہلے ڈیک بند کیا، پھر اس کے ہاتھ سے بوتل چھین کر دور پھینکی تھی، عباس نے چونک کر سرخ آنکھوں سے اسے دیکھا۔

”بہت افسوس ہوا، بجائے روگ لگانے کے تم خود لگا کر بیٹھ گئے، اگر اتنی ہی بات آگے بڑھی ہوئی تھی تو کیوں طلاق دی اسے۔“ اولیس کا قہر ختم نہ ہوتا تھا، عباس نے جواباً اسے سختی سے برہمی سے گھورا، مشتعل انداز میں یکدم اٹھتے اسے زوردار دھکا دیا۔

”تم نے دلوای، تم نے دھوکہ دیا، سبز باغ دکھائے مجھے مگر..... ہوا کچھ بھی نہیں۔“ وہ پاگلوں کی طرح چیخا، اولیس نے سر تا سف سے جھٹکا۔

”صبر نام میں نہیں تم میں، ایسے کاموں میں ہتھیلی پر سرسوں نہیں جتنی، الٹا نقصان ہوتا ہے، میرے بھائی میں پکا اور مضبوط کام کرنا چاہتا ہوں۔“

”مجھے کچھ نہیں بتا، میں بس اتنا جانتا ہوں مجھے حرم چاہیے اور وہ تم مجھے لا کر دو گے۔“ عباس نے پھر اسے دھکا دیا، بلکہ غصے میں کنٹرول کھوتے اس کا کریاں پکڑ لیا۔

”ہاں میں لا کر دوں گا، وعدہ کر چکا ہوں، اس وقت تو مجھیں ایک اور بریکنگ نیوز دینے آیا تھا، مگر تم ہو کہ اپنے غم سے فرصت نہیں۔“ اولیس نے تجسس پھیلاتا چلا جا مگر کامیابی خاطر خواہ نہ ہوئی۔

”ہاں مجھے اپنے غم سے فرصت نہیں، کہا نا، وہ صرف وہ، اور کوئی دلچسپی نہیں۔“ عباس پھر ہنسیانی ہو کر چلایا، اولیس نے مطلق پرواہ نہ کی۔

”مگر اس خبر میں دلچسپی ہوگی، بات دشمنوں کے گھر کی ہے، خاص بات ہے۔“ اولیس نے حرا لیا، عباس کو اس بار چونکانے میں کامیاب رہا۔

”حرم کے متعلق بات ہے؟“

”ہاں، اس کے بھائی کے متعلق، سنا ہے حمدان نے نکاح کسی بہت بڑے آدمی کی بیٹی سے کر رکھا تھا، عین وقت پر شانزے کو جواب دے دیا، کنیز پھپھو اور پھپھا بہت برہم ہیں، ان کے دشمنوں یعنی ہماری صف میں شامل ہو چکے ہیں، ہماری ٹکٹ تو مضبوط ہوئی نا، یعنی کامیابی کے چانسز مزید روشن۔“ وہ اسے آنکھ مار کر کہہ رہا تھا، عباس کا نشہ ہرن ہو گیا۔

”تمہیں کس نے بتایا؟“

”کنیز پھپھو رات کی اپنی فیملی سمیت ہمارے ہاں موجود ہیں، جنہیں اس سے نجات ملے تو کچھ اور خبر ہو پائے۔“ وہ ناگواری سے شراب کی بوتل کو ٹھوکر لگا کر بولا، عباس لمحہ بھر کو شرمندہ نظر آیا۔

”چچا نے کیسے ساتھ دے دیا حمدان کا، وہ تو شانزے کو بہت عزیز رکھتے تھے۔“ عباس کی سمجھ

## قرآن شریف کی آیات کا احترام کیجیے

قرآن مجید کی ہر آیت کا احترام کرنا ہر مسلمان کی فرض ہے۔ اگر کوئی شخص قرآن مجید کی آیت کو ہتھیار بن کر استعمال کرے یا اسے ہتھیار بن کر استعمال کرے تو اس کا عقوبت ہے۔

سے باہر تھا سارا معاملہ، اولیس مسکرانے لگا۔

”ان چکروں کو چھوڑو، ہمیں کیا غرض ان معاملوں سے بھلا؟ تم یہ سوچو کہ ہمارے کام میں کیسی آسانیاں پیدا ہو رہی ہیں، حرم کا حصول مزید آسان ہوا، مبارک ہو۔“ وہ اتنے اعتماد سے بولا تھا کہ عباس نے اختیار کھلکھلا اٹھا۔

”خیر مبارک، میری جان۔“ وہ اس سے لپٹ گیا، اولیس نے جھلا کر اسے خود سے دور ہٹا دیا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر کمرے سے باہر آتا دھڑ دھڑ میڑھیاں اترنے لگا، نیچے جہاں بد دعائیں پڑتی شانزے آنسو بھاتی کنیز اور آف موڈ کے ساتھ کنیز کے شوہر موجود تھے اور فیصہ چوہدری کی ٹیلی کے خوب لٹھے لئے جارہے، ماحول گرم تھا اور خوب مزے کا بھی۔

☆☆☆

”میں دوسوٹ لوں گی اور ہرگز سستے نہیں لوں گی، براہِ نڈ ہونے چاہیں، جانتی ہوں بھابھی بیگم براہِ نڈ بلبوسات ہی پہنچتی ہیں۔“

حرم اور حجاب دونوں اس کے ہمراہ تھیں، وہ انہیں ٹریٹ دینے لایا تھا مگر حجاب شاپنگ کرنے کے لئے نکل گئی تھی، حمدان نے انکار کہاں کرنا تھا، ساتھ مارکیٹ لے آیا۔

”ایک سوٹ بھابھی کے لئے بھی لینا ہیں، لیکن دوں گی اپنی طرف سے۔“ حجاب کی زبان مسلسل چل رہی تھی، حمدان پھر کچھ نہیں بولا۔

”تم بھی ایک اپنی طرف سے لے لینا انہیں گفٹ کرنے کو۔“

جس وقت حجاب حرم کو پٹی بڑھا رہی تھی، یہی وہ لمحہ تھا جب لا پرواہی سے اپنی سمت آتی قدر کی نگاہ حمدان پر پڑی تھی، وہ بے فکر خوش ہاش ہنسی مسکراتی لڑکیوں کے ہمراہ بہت ریلیکس موڈ میں نظر آتا یہ بندہ اسے پتا نہیں کون کون سی آگ میں جھلسا گیا، اس نے لمحے کی تاخیر کے بغیر اس کی جانب پیش رفت کی اور جاتے ہی اس پہ چڑھائی کر ڈالی تھی، بنا سوچے، بنا سمجھے، بنا غفلت برتے۔

”او..... اچھا..... تو یہ کر تو ت ہیں تمہارے، ایک ایک ٹائم میں اتنی لڑکیوں کو بے وقوف بناتے ہو، شرم تو نہیں آتی ہوگی ذرا سی بھی۔“ حملہ اچانک اور شدید تھا، حمدان کیا خاک سمجھتا وہ تو اس کی آمد کی توقع نہیں رکھتا تھا، کجا یہ سامنا اور اس پہ یہ لعنت ملامت اور پھینکار۔

(جاری ہے)

☆☆☆

## محبت خورشید گمان فرحت انصاری



بلاشبہ انسان سراسر خسارے میں ہے، انسان کو جب تک اپنے خسارے کا ادراک ہوتا ہے تب تک وقت کافی گزر چکا ہوتا ہے، انسان چاہے کتنی غلطی یا خسارہ سدھار بھی سکتا ہے، قدرت کی پکڑ ڈھیلی مگر بے حد سخت ہوتی ہے اس کی ڈھیل محدود مدت کے لئے ہوتی ہے قدرت انسان کو کچھ عرصے کے لئے ڈھیل دیتی ہے جب اس کی پکڑ آتی ہے تب انسان نہ تو قدرت سے اپنے گناہوں کی معافی مانگنے کے قابل رہتا ہے اور نہ ہی وہ زندگی بھر سر اٹھا کر کسی سے نظریں ملا پاتا ہے۔

رات کا ہولناک وحشت زدہ سناٹا چہار سو پچھل چکا تھا، کائنات پر تاریکی کی گہری چادر تھی، ایسی تاریکی جو ہر شے کو چھپالے جس میں ہاتھ کو ہاتھ نہ بھائی دے مگر اس تاریکی میں دن کے اجالے میں ہر سو بدنامی بن کر پھیلنے والا جرم و

گناہ چھپا ہوا، انسانی مجسمہ نفس اپنی فتح پر نازاں ہر آسوتا ج رہا تھا، وہ وجد و سرشاری کے عالم میں سرور جھومنے میں مگن تھا۔

وہ رات کی ہولناکی میں کبھی بکھار انسانی شکست پر فلک شکاف قہقہہ لگا لیتا تھا اس کا ہر قہقہہ منزہ کے پردہ سماعت اور دل پر کاری ضربیں لگا رہا تھا، اس کا بویا تو اس کے آگے آیا تھا، پھر وہ بھلا کیسے انسانی مجسمہ نفس کے فتح و کامرانی میں ڈوبے قہقہے برداشت کرتی، اسے مجسمہ نفس کا قہقہہ اور معنی خیز نظریں بخوبی سمجھ میں آ رہی تھیں۔ منزہ کے ہاتھوں میں پھینچا کاغذ پھڑ پھڑا کر رہ گیا، اس کے وجود پر لرزاں طاری تھا، ماضی اس کی آنکھوں کے سامنے اس کے اعمال کی سیاہی دہرا رہا تھا، گزرے وقت کی فلم اس کی آنکھوں کی پٹیوں پر متحرک تھی۔

”ای..... امی پلیز آپ خود کو سنبھالیں،

## مکمل ناول





بھائی زبیرہ کو ڈھونڈ لائیں گے۔“ عازرہ ماں کی دگرگوں حالت پر گہرا کراہیں تلی دیے گی۔

”اسے گھر لانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے وہ جہاں نظر آئے اسے گولی مار دیتا۔“ غیظ و غضب میں ڈھلے دھیمے کے لہجے سے شعلے برستے تھے، وقار اور وقاس بہن کی تلاش میں جانے لگے تو دھیم نے انہیں قطعیت سے حکم دیا، وہ دونوں بھی غصے و غضب میں باپ سے کچھ کم نہ لگ رہے تھے، دھیم کو انہیں ہدایت کرنے کی ضرورت نہ تھی کہ ان کے عزائم بھی یہی ظاہر کر رہے تھے، ان دونوں کے ہاتھ میں پستل تھے منزہ کی ساکت و سجدہ نظر میں لمحہ بھر کو زندگی دوڑی، دھیم برآمدے میں کندھے پر اپنی مخصوص چادر اوڑھے بے چینی سے پتھر لگا رہے تھے۔

”میں اسے جان سے مار دوں گا۔“ منزہ ماں تھی اس کے دل کو شوہر اور بیٹوں کے عزائم سے ہولنے لگا تو اس کے کانوں میں بائیس سال پرانی آواز گونجی۔

”ارے اس نے کام ہی ایسا کیا ہے وہ اسی لائق ہے، آخر اس نے ہمارے منہ پر کالک لی ہے۔“ منزہ کے کانوں میں اپنی ہی بائیس سال پرانی آواز کی ہار گشت ابھری تو اس کا دل کسی نے بری طرح مسل ڈالا تھا، بائیس سال پہلے بھی یہی کچھ ہوا تھا، لیکن وہ آج دھیم کے غصے کو بردھاوانہ دے رہی تھی آج اس کا دل سہا جا رہا تھا دھیم عازرہ پر تھوڑی دیر بعد شعلہ بار نظر ڈالتا تو وہ چڑیا کی طرح سہم جاتی اس کا دل بار بار اچھل کر حلق میں آ جاتا اور وہ بے شکل اپنا خشک حلق تر کر ماتی تھی، آخر وہی تو زبیرہ کے ساتھ دن رات رہتی تھی دونوں بہنوں کا چوبیس گھنٹوں کا ساتھ تھا، پھر بھلا وہ کیسے مشکوک نہ ٹھہرتی۔

”پاپا آپ فکر ہی نہ کریں۔“ وہ دونوں

باپ کو تسلی دیتے باہر نکل گئے، منزہ کا جسم ٹھنڈا ہونے لگا، ماضی اس کی یادداشت پر جاوی ہونے لگا، وہ کچھ بھی تو نہ بھولی تھی، وہ آسانی سے کسی کو معاف کرنے یا کچھ بھی بھلا دینے والے لوگوں میں سے نہ تھی۔

☆☆☆

وہ ہنستے ہنستے اور زندہ دل لوگوں میں بیاہ کر آئی تھی، دھیم پانچ بہن بھائیوں میں سے تیسرے نمبر پر تھے، منزہ کے دو چیتھ اور دو نندیں تھیں، وہ بیاہ کر آئی تو اس کی دونوں جیٹھائیوں اور شادی شدہ نند نے اس پر خوب دل کے ارمان نکالے، اس نے آتے ہی گھر میں فاخرہ بھابھی سے خوب بنائی تھی، دونوں میں جلد ہی گاڑھی چھنے لگی، بڑی جیٹھائی بالائی منزل پر ساس سر کے ساتھ رہتی تھی، جبکہ اس کا اور فاخرہ کا کمرہ نیچے تھا، بڑی نند شادی کے بعد چند دن رہ کر اپنے سرال چاچکی تھی، چھوٹی نند نوشینہ اس کے خوب لاڈ اٹھاتی، نوشینہ کی دھیم سے بھی خوب ہنسی تھی، مگر وہ شروع دن سے نجانے کیوں نوشینہ سے چینی چینی رہتی تھی، اس نے ہمیشہ نوشینہ سے اک فاصلہ رکھا تھا جسے وہ چاہ کر بھی ختم نہ کر پاتی تھی، البتہ فاخرہ بھابھی سے خوب فریکس تھی۔

نوشینہ اسے چینی دینے کی کوشش کرتی تو وہ اسے مکمل نظر انداز کر دیتی تھی اس کے سر کا انتقال ہو چکا تھا اور ساس گھر کے سفید وسیاہ میں بلا شرکت غیرے خود مختار تھیں، تینوں بیٹے ماں کے بے حد فرمانبردار تھے اور ماں کے آگے چوں تک نہ کرتے تھے، منزہ نے آتے ہی یہ بات محسوس کر لی تھی، اس کے دل میں ساس کے لئے بھی بغض تھا۔

☆☆☆

گھر میں ذرا اور ناشتہ سب اکٹھے کرتے

تھے، تینوں بھائیوں کے آنے کی ٹائمنگ الگ لگ تھی، دھیم گھر میں آخر میں آتے تھے اور آتے ناٹنی لوہی دلہن کے پاس آنے کی بجائے ماں کی رمت میں حاضر ہو جاتے اور ان کی واپسی گھنٹہ ر سے پہلے نہ ہوتی، منزہ ان کے انتظار میں سولہ گھار کیے بیٹھی ان کی راہیں تک رہی ہوتی لیکن سے بیوی کا ذرا احساس نہ تھا جب ماں اٹھنے کی بازت دیتی وہ اپنے کمرے میں آ جاتا تھا، پھر بس ڈنر کے لئے نوشینہ بلانے آتی تھی اس کی ادی کو ہمیدہ بھر ہونے کو تھا، اس روز ڈنر پر صالحہ سر نے منزہ کو آگاہ کیا، وہ پرسوں اس سے کھیر لائیں گی۔

صالحہ بیگم کے خاندان میں نئی دلہن سے گھر کا مومن کا آغاز کروانے کے لئے یہ رسم ادا کی گئی تھی اور دلہن سے سب سے پہلے میٹھا پکوا یا

”داؤ کل مزے آئے گا امی۔“ سیکنڈ ایری کی بے نوشینہ نے بچکانہ انداز میں تالی بجا کر خوشی کا مار کیا، نوشینہ کے چہرے کی معصومیت و لونیازی سب کے دل موہ لئے سوائے منزہ کے، وہ بے خشک نظروں سے گھور کر رہ گئی، دھیم نے محبت بہن کے سر پر ہلکی چپٹ لگائی، منزہ کو شوہر کا اسے اظہار محبت بھی ایک آنکھ نہ بھایا تھا۔

”کھیر پکانی کی رسم کیا ہوتی ہے امی۔“ گھر اس کی دونوں جیٹھائیوں صالحہ کو امی کہتی تھیں نے بھی ان کی دیکھا دیکھی انہیں امی کہنا ع کر دیا تھا، منزہ کے خاندان میں ایسی کوئی امی رسم نہ ہوتی تھی اس نے انجان پن سے

”ارے بھابھی کمال ہے آپ کو یہ بھی نہیں ہے۔“ نوشینہ گھر بھر کی لاڈلی اور چینی تھی وہ ادبچپن کے حسین سنگم پر تھی اس کا بچکانہ پن

گھر میں کسی کو برانہ لگتا تھا، بڑی دونوں بھابھیاں اس پر جان لگاتی تھیں اک منزہ ہی اس سے چینی رہتی تھی، نوشینہ کو ہر کسی کے معاملے میں بنا سوچے سمجھے بولنے کی عادت تھی، مگر وہ دل کی بے حد صاف و دکھری اور اچھی تھی، بعض اوقات وہ زبان سے جو کچھ کہہ جاتی وہ اس کے دل میں ہر گز نہ ہوتا تھا، اب بھی اس نے بچکانہ معصومیت سے محض بات برائے بات کی تھی، اس کا مقصد ہر گز منزہ کی انسٹ کرنا نہ تھی، سب کے لبوں پر دھیمی مسکراہٹ رینک گئی۔

”جسٹ شٹ اپ، میں تم سے نہیں امی سے بات کر رہی ہوں۔“ منزہ کو سب کی مسکراہٹ پر سبکی کا احساس ہوا تھا، اس نے غصے سے سینچے مگر دھیمے لہجے میں بظاہر نرمی سے نوشینہ کو ٹوکا، ٹیبل پر لمحہ بھر کو کشیدگی پھیل گئی سب کے مسکراتے لب سکڑ گئے، نوشینہ نا بھی بھری معصومیت سے آنکھیں پٹپٹا کر رہ گئی۔

”منزہ!“ دھیم نے ہی اسے تنبیہ بھری سختی سے اس کے لہجے کی بد صورتی کا احساس سب سے پہلے دلایا، فاخرہ بھی اسے تنبیہ نظروں سے دیکھ رہی تھی، نوشینہ چینی تھی وہ تو چینی نہ تھی پھر خواہ خواہ معمولی بات کو ایٹو بنانے کا ٹانہ۔

”بیٹا ہمارے ہاں نئی دلہن سے گھر کے کاموں کا آغاز کروانے سے پہلے اس رسم کو بطور نیک شگون تصور کیا جاتا ہے۔“ صالحہ کو بھی اس کا لہجہ و انداز بے حد ناگوار گزرا تھا جسے نظر انداز کر کے انہوں نے رسائیت بھری نرمی سے اسے آگاہ کیا، وہ جان چکی تھیں کہ اس کے خاندان میں ایسی کسی رسم کا تصور نہ تھا۔

”عجیب رسم ہے ہمارے ہاں تو ایسی کوئی رسم نہیں ہوتی ہے۔“ صاف کو منزہ نے بلا جھجک تبصرہ کیا، اس کے منہ پھٹ انداز پر فاخرہ اور رمنزہ

متحیر رہ گئیں، زیادہ حیرت رمزہ کو ہوئی تھی وہ گھر کی بڑی بہو بھی اس کی شادی کو آٹھ سال ہوئے والے تھے، صالحہ نے بھی اسے ڈانٹا تھا نہ ہی سچی سے بات کی تھی وہ بھی ان کی بے حد عزت کرتی تھی اور ہر معاملے میں ان کی رائے کو اہمیت دیتی تھی، اس کی شادی کے تین سال بعد فاخرہ دلہن بن کر آگئی، فاخرہ صالحہ کی بھانجی بھی جبکہ رمزہ غیر خاندان سے تھی، صالحہ نے دونوں بہوؤں میں کبھی کوئی فرق نہ کیا تھا، جس سے رمزہ کے دل میں ان کی مزید عزت بڑھ گئی تھی، رمزہ کو رمزہ کی بدتمیزی پر تاؤ آ رہا تھا، وہ مصلحتاً چپ بھی، رمزہ سب کے سامنے صالحہ کو جواب دے سکتی تھی تو وہ کیا حیثیت رکھتی تھی۔

”بہو تم اس گھر کا حصہ بن چکی ہو اب تمہیں اپنے میکے کے طور طریقے بھول کر اس گھر کے طور طریقے اپنانا ہوں گے۔“ صالحہ نے ہنوز نرمی بھری رسائی اور سجاؤ سے اسے سمجھایا تھا، رمزہ خاموشی سے ناک بھوں چڑھا کر رہ گئی، اس کی ناگوارگی کسی سے پوشیدہ نہ تھی۔

☆☆☆

”فاخرہ تم رمزہ کو سمجھاؤ، اسے امی سے اس لہجے میں بات نہیں کرنی چاہیے۔“ رمزہ ڈر سے فارغ ہو کر اپنے کمرے میں آگئی تھی، اس کی دونوں جھٹھانیاں برتن سیٹ کر پکے کے کاموں میں مصروف ہو گئیں، رمزہ کی چائے بنانے کی باری تھی سب گھر والے دن میں تین نام کھانے کے بعد چائے ضرور پیتے تھے، جبکہ فاخرہ برتن دھوئے لگی تھی، چائے بنائی رمزہ نے فاخرہ سے اپنی ناگوارگی کا اظہار کیا، وہ دونوں کی دوستی سے واقف تھی، رمزہ فاخرہ سے بے حد کلوز ہو چکی تھی اور اس سے اکثر اپنے میکے کی باتیں شیئر کرتی رہتی تھی، فاخرہ ایسے میں اکثر رمزہ کو بھی ساتھ بٹھا

لیتی تھی، رمزہ کو رمزہ کی موجودگی ناگوار گزرتی تھی مگر اس نے بھی کبھی فاخرہ کو نہ ٹوکا تھا، وہ گھر کے ماحول کو سمجھ چکی تھی، یہاں سب مل جل کر اور دوستانہ ماحول میں رہتے تھے۔

”بھابھی وہ میری دوست کہاں سے ہو گئی بھلا، بس ہم دونوں میں ذرا بے لگنی بڑھ چکی ہے۔“ برتن دھوتی فاخرہ نے انہیں نور انوک کر جج کی، اسے بھی رمزہ کا لہجہ و انداز بے حد ناگوار گزرا تھا، اسے کم از کم امی سے بدتمیزی نہیں کرنی چاہیے تھی، اس نے یا بھابھی رمزہ نے بھی بھی صالحہ کو کسی بات پر پلٹ کر جواب نہ دیا تھا، صالحہ تو بے حد محبت کرنے والی خاتون تھیں۔

”وہ تم سے زیادہ کلوز ہے تم اسے سمجھا سکتی ہو۔“ رمزہ نے اپنی بات پر زور دیا۔

”چھوڑو میں بھابھی نہیں کیا ضرورت ہے برا بننے کی، وسم اسے خود سمجھا لے گا۔“ فاخرہ نے گفتگو سہمی، اس کی بات میں وزن تھا، ان دونوں کا رمزہ سے رشتہ بے حد نازک تھا، وہ اسے کسا بات پر ٹوک کر بری نہ بنایا جانتی تھی وہ ڈیڑھ ماہ میں رمزہ کو اتنا تو سمجھ چکی تھی کہ وہ دل میں بغض پالنے والوں میں سے ہے، وسم اس کا شوہر تھا، اسے بھی تو بیوی کا ماں سے بدتمیزی کرنا برا لگا،

گا۔

”ہوں کہتی تو تم ٹھیک ہو۔“ چائے تیار ہو چکی تھی رمزہ نے اس کی بات سے اتفاق کر لیا ہوئے برز بند کیا اور چائے کپوں میں ڈالنے لگی۔

☆☆☆

”کیا تمہیں کسی نے چھوئے بڑے۔“ بات کرنے کی تمیز نہیں سکھائی ہے۔“ وسم کمرے میں آیا تو وہ شدید غصے میں تھا، شادی کے ڈیڑھ ماہ کے عرصے میں یہ پہلا موقع تھا کہ اس نے و

کو غصے میں دیکھا تھا وسم نے حسب معمول کمرے میں آتے آتے گیارہ بجادیئے تھے، وہ اس کے انتظار میں بمشکل جاگ رہی تھی، وہ نیند کی چٹکی تھی اور رات دس بجے تک سو جانے کی عادی تھی۔

”میں نے کیا کہا ہے۔“ اس نے معصومیت کی انتہا کر دی، وسم کا غصہ بڑھ گیا۔

”تم نے امی اور لوشینہ سے بدتمیزی کی ہے اور مجھ سے پوچھتی ہو کہ میں نے کیا کیا ہے۔“ وہ غصے سے جھپٹنے لہجے میں غرایا۔

”اوہ تو تمہاری برین واشنگ کر کے بھیجا گیا ہے۔“ رمزہ نے بے نیازی کا اوڑھا چولا اتار پھینکا، اسے وسم کا ماں، بہن کی خاطر خود سے الجھنا برا لگ رہا تھا، وسم نے اس پر پہلی بار لوشینہ کی خاطر غصہ کیا تھا، اس کے دل کا عناد بڑھ گیا۔

”جسٹ شٹ اپ، تمہیں بات کرنے کی ذرا تمیز نہیں ہے۔“ وسم رمزہ کی بدتمیزی و ڈھٹائی پر غصے سے جھپٹنے لہجے میں غرایا، رمزہ پر بھی لڑکی تھی، اسے رمزہ سے جاہلانہ رویے کی قطعاً امید نہ تھی۔

”سچ کڑوا ہوتا ہے۔“ رمزہ ڈھٹائی سے اپنے سوفٹ پراڈی اسے بے خوبی سے دیکھنے لگی اسے وسم کے غصے کی بھی پرواہ نہ رہی تھی، اسے صرف اس بات کا قلق تھا کہ وسم اس کا ساتھ دینے کی بجائے ماں بہن کے لئے بول رہا تھا، اسے وسم کا ان دونوں کا دفاع کرنا آکھ نہ بھایا تھا، اس نے پہلی بار لوشینہ سے یا امی سے دو بدو بات کی تھی کیا تھا اگر وہ نظر انداز کر جاتا۔

”رمزہ!“ وسم کا غصہ رنج و قلق میں ڈھلنے لگا، رمزہ نے لوشینہ کو شروع سے قبول ہی نہ کیا تھا، نجانے اسے لوشینہ سے کیا پیر تھا لیکن قابل اطمینان بات یہ تھی کہ اس نے بھی لوشینہ سے بد

زبانی بھی نہ کی تھی، وسم نہیں چاہتا تھا کہ وہ اس کی معصوم بہن سے زبان درازی شروع کر دے، وسم کے چہرے پر دکھ کے سائے تھے۔

”تم اتنی چھوٹی سوچ کی مالک ہو گی مجھے احساس نہ تھا۔“ وسم کا دکھ مہونے کا نام ہی نہ لے رہا تھا، اسے صالحہ یا لوشینہ نے رمزہ کے خلاف اک لفظ تک نہ کہا، وہ اسے سمجھانا چاہتا تھا کہ اس نے بات کو غلط رنگ دے دیا تھا، وہ رمزہ کی بدگمانی پر ششدر تھا، اس سے کچھ کہنے سننے کا کوئی فائدہ نہ تھا، وہ مزید بدگمان ہو سکتی تھی اس نے غصے سے رخ موڑ کر چار دیوے تک تان کر لیٹ گیا، ان دونوں کی پہلی لڑائی تھی، رمزہ کے دل میں لوشینہ کے لئے شدید نفرت ابھری۔

”وسم آئی ایم سوری، میں آئندہ آپ کو شکایت کا موقع نہ دوں گی۔“ وسم اس سے شدید خفا تھا وہ صبح اس سے بات کیے بنا آؤس چلا گیا تھا، وسم آؤس پہنچتے ہی اسے کال کرتا تھا اس روز وسم نے اسے کوئی کال نہ کی، حالانکہ دن میں دو تین بار کال کرنا اس کا معمول تھا، وہ سارا دن وسم کی کالی کی فکرت رہی تھی، مگر اس کا فون نہ آتا تھا، نہ آیا وہ آؤس واپسی پر بھی غصے سے منہ پھلائے ہوئے تھا، وسم ماں کو سلام کر کے کمرے میں پہنچ کر نے آیا تو رمزہ روکھتی ہی اس کی راہ میں حائل ہو گئی۔

”رمزہ تم اپنے ذہن میں ایک بات کلیئر کر لو، میں اپنی ماں بہن کے خلاف ایک لفظ برداشت نہیں کر سکتا ہوں، انہوں نے کل مجھ سے تمہارے خلاف اک حرف شکایت بھی نہ کہا تھا۔“ وسم کا دل نرم پڑ گیا، وہ اپنی غلطی پر نادم تھی، وسم نے مزید اظہار ناراضگی مناسب نہ سمجھا تھا، کہتے ہیں عورت کے آنسو بہت بڑا ہتھیار ہوتے ہیں جو پتھر سے پتھر دل مرد کو بھی موم کی طرح پگھلا

دیتے ہیں، منزہ نے اسی ہتھیار سے کام لے کر  
وسیم کو موم کیا تھا۔

”سوری وسیم!“ منزہ نے سر اثبات میں  
ہلاتے ہوئے یوں سر ہلایا جیسے وہ وسیم کے لفظ لفظ  
پر ایمان لے آئی ہو، حالانکہ اسے وسیم کی بات پر  
قطعا یقین نہ آیا تھا، وہ چائے کے بعد کافی دیر ای  
کے پاس بیٹھا رہا تھا اور خلاف معمول دیر سے بھی  
آتا تھا، منزہ فی الحال اسے منانا چاہتی تھی، وہ اس  
کی شکل برداشت نہ کر سکتی تھی۔

”سوری وسیم!“ اس نے نرم پڑتے وسیم  
سے دوبارہ معذرت کی اور چہرے پر معنوی  
شرمندگی طاری کر کے اپنے دونوں کان پکڑ  
لئے۔

”جان وسیم تم اب یہ ظلم تو نہ کرو۔“ منزہ کے  
زور سے کان بھینچنے پر اس کے کانوں کی لودیں  
سرخ ہو گئیں تھیں جس سے اس کے رخساروں پر  
سرخ پھیلنے لگی تھی، وسیم نے محبت سے اس کے  
کان چھو ڈائے، منزہ نے معنوی سکون بھری  
سانس لی۔

”پینکلس گاڑ، آپ نے مجھے معاف کر  
دیا۔“ منزہ کے چہرے پر طمانیت پھیلی تھی، وہ وسیم  
کی شکل سے سارا دن پریشان رہی تھی، اس سے  
فاخرہ نے دبے لفظوں پریشانی کی وجہ بھی پوچھی تھی  
جسے وہ سہولت سے نال ٹکی تھی، وہ گھر میں سارا  
دن بولائی بولائی رہی تھی۔

”صرف ایک شرط پر۔“ وسیم نے اسے تنبیہ  
کرنا ضروری سمجھا تھا، وہ نہیں چاہتا تھا کہ منزہ  
دوبارہ گھر میں کسی سے بدتمیزی یا بدزبانی کرے۔  
”اوکے۔“ منزہ بنا جانے اس کی شرط بوجھ  
منی تھی، وہ ماں بہن کا دیوانہ ان کے خلاف کچھ  
برداشت نہ کر سکتا تھا، منزہ نے محبت بھری لگاؤ  
سے اس کے گلے میں بانہیں ڈال دیں وہ لی

الجال وسیم کا موڈ دوبارہ آف کرنا نہ چاہتی تھی۔

”منزہ مجھے دوبارہ شکایت کا موع نہ دینا  
یار۔“ وسیم نے اسے جوا محبت سے سینے میں پیچ  
لیا، منزہ نے اثبات میں سر ہلا دیا، اس کا شاطر  
ذہن اور چال سوچ رہا تھا جس سے سانپ بھی مر  
جائے اور لاشی بھی نہ لوٹے۔

☆☆☆

”کیا ہو رہا ہے بھابھی؟“ صالحہ کی بڑی  
بہن کو ہارٹ ایک ہوا تھا، وہ فون پر اطلاع لیتے  
ہی پھلتے بنے ندیم ک ساتھ بیٹا اور روانہ ہو گئی  
تھیں، ندیم کو حال ہی میں کبھی کی طرف سے  
گاڑی ملی تھی، انہیں اپنی بڑی بہن سے بے حد  
محبت تھی، انہی کی بیٹی فاخرہ بھابھی تھیں۔

نوشینہ نے کالج سے چھٹی کی تھی تاکہ رزمہ  
بھابھی کا گھر کے کاموں میں ہاتھ بٹا سکے وہ  
بھابھی کے ساتھ ناشتے کے بعد کچن سیٹ کر  
فارغ تھی بھابھی گھر کی صفائی کرنے لگیں تو وہ  
نچلے پورشن کی صفائی کرنے کے لئے نیچے آ گئی،  
نوشینہ صفائی سے فارغ ہوئی تو منزہ کے پاس  
چلی آئی تھی۔

”تم اندھی تو نہیں ہو۔“ منزہ اپنی بڑی بہن  
سے فون پر بات کر رہی تھی، اس کی کال ٹیٹ  
ورک پر ایلم کی وجہ سے کافی تاخیر سے ملی تھی، ابھی  
اس کی کال ملے کچھ دیر ہی گزری تھی کہ نوشینہ  
کچن پڑی تھی وہ سخت بد مزہ ہو کر طنز کر گئی، ار  
نے وسیم کی ہدایت بھی بھلا دی تھی، بلکہ اسے  
وسیم کی ماں بہن کے متعلق کسی نصیحت یا ہدایت  
دل سے عمل ہی نہ کرنا تھا۔

”سوری بھابھی..... وہ.....“ منزہ کی طنز  
وکاٹ دار لہجہ و نظروں نے اچھی خاصی با اعتنا  
نوشینہ کو گڑبڑائے پر مجبور کر دیا تھا، منزہ کال ہول  
پر کیے اس کے جانے کی منتظر تھی، منزہ صبح

فارغ گھر میں بور ہو رہی تھی، اس نے وسیم کو موج  
آفس جاتے ہوئے امی کی طرف چھوڑنے کو کہا تو  
اس نے صاف انکار کر دیا کہ امی کی غیر موجودگی  
میں اس کا گھر چھوڑ کر جانا مناسب نہ تھا، منزہ دل  
میں پیچ و تاب کھا کر رہ گئی، وہ وسیم کے جانے کے  
بعد کمرے سے نہ نکلی تھی اور نہ ہی اس نے مروا  
رزمہ بھابھی اور نوشینہ کا ہاتھ ہٹانے کی کوشش کی  
تھی، رزمہ بھابھی اپنے دو ماہ کے بیٹے کو بھی  
سنہال رہی تھیں، نوشینہ نے شرمندگی سے لب  
چپکے۔

”آپ کال کریں میں پھر آ جاؤں گی۔“  
نوشینہ کا حساس دل منزہ کی بے بسی دیکھ گئی  
نوٹ گیا، وہ اگلے قدموں دروازے سے پلٹ گئی  
تھی، اس کا دل بھر بھر کر آ رہا تھا، آنسو آنکھوں  
میں اکٹھے ہو رہے تھے۔

”نوشینہ کیا ہوا؟“ رزمہ بھابھی اور سدرہ  
آلی کی اکٹھے شادی ہوئی تھی، سدرہ آپنی وداع ہو  
کر گئی تو بھابھی نے آ کر ان کی کمی پوری کر دی،  
انہوں نے حقیقتاً کبھی امی یا نوشینہ کو سدرہ کی کمی  
محسوس نہ دہنے دی تھی، رزمہ کی نظر دیکھی نوشینہ  
پر پڑی تو وہ پوچھے بنانہ رہ سکی تھیں۔

”کچھ نہیں بھابھی!“ نوشینہ انہیں نال کر  
آگے بڑھ گئی۔

”کیا منزہ نے کچھ کہا ہے؟“ وہ نیچے صفائی  
کرنے لگی تو بالکل ٹھیک تھی، یقیناً منزہ نے اس کو  
کچھ کہا ہوگا، رزمہ نے محبت سے قریب آ کر اس  
کے کندھے پر ہاتھ رکھا، نوشینہ کے پلوں پر اگلے  
آنسو محبت کی ہلی آج سے پھل گئے، وہ نمبٹوں  
سے گندھی نرم دل لڑکی تھی، منزہ چاہتی تو اسے  
محبت سے نکل کر سکتی تھی، مگر منزہ نے اسے اسی  
قابل ہی نہ سمجھا تھا اور آتے ہی اس سے ہیر  
باندھ لیا تھا۔

”میں اس سے پوچھوں گی تم اس کی بات  
دل پہ نہ لو۔“ رزمہ نے اسے ہچکانہ انداز میں  
پچکارے ہوئے اس کے آنسو صاف کیے۔

”آپ کو ان سے بات کرنے کی کوئی  
ضرورت نہیں ہے بھابھی، وہ آپ سے بھی  
بدتمیزی کریں گی اور میں نہیں چاہتی کہ آپ کی  
میری وجہ سے اسلٹ ہو۔“ نوشینہ نے قطعیت  
سے اسے منع کر دیا، منزہ جیسی بد لحاظ لڑکی سے کچھ  
بہید نہ تھا کہ وہ ان کی بھی اسلٹ کر دیتی، آج  
منزہ کی کھیر لکائی کی رسم تھی مگر صالحہ کو بیٹا اور جانا پڑ  
گیا تھا، صالحہ بھی منزہ سے محتاط ہو گئی تھیں۔

”اچھا تم اندر جا کر آرام کرو۔“ رزمہ نے  
محبت سے اس کا کندھا تھپکا، انداز سراسر نالنے کا  
تھا، وہ اس کی بات پر عمل کا کوئی ارادہ نہ رکھتی  
تھیں، رزمہ منزہ کی نیچر سمجھ چکی تھی اس نے وسیم  
کے سامنے منزہ سے بات کرنے کا فیصلہ کر لیا،  
تاکہ اس کے دل میں کوئی بدگمانی جگہ نہ بنائے  
اور ساری بات اس کے سامنے ہو، رزمہ اسے  
تاکید کر کے کچن کی طرف بڑھ گئی اس دو پہر کا  
کھانا تیار کرنا تھا۔

”بھابھی میں آپ کا کچن میں ہاتھ بنا رہی  
ہوں۔“ نوشینہ اس کے لاکھ منع کرنے کے باوجود  
کچن میں اس کا ہاتھ بنانے لگی، رزمہ کو اس پر  
نوٹ کر پیار آیا، وہ احساس کرنے والی لڑکی تھی  
اور اسے منزہ پر غصہ عود کر آنے لگا، وہ منزہ کے  
روئے کو کھوتی نوشینہ کے ساتھ سبزی کاٹنے لگی،  
اس نے نوشینہ سے دوبارہ رونے کی وجہ نہ پوچھی  
تھی۔

☆☆☆

”منزہ! تم نے آج نوشینہ سے کیا کہا تھا۔“  
وہ سارا دن کمرے سے باہر نہیں نکلی تھی، وسیم گھر  
آیا تو وہ اسی کے ساتھ باہر آئی تھی، نوشینہ نے ہر

کام میں اس کا برابر کا ہاتھ بنایا تھا، اس نے فاخرہ کے حصے کے کام از خود اپنے ذمے لے لیے تھے اور رمزہ کو فاخرہ کی کی محسوس نہ ہونے دی تھی، ڈر پر نعیم بھی موجود تھے رمزہ نے بات کرنے کا یہی موقع مناسب سمجھا تا کہ رمزہ کو کوئی بات بتانے کا موقع نہ ملے، اس سے کچھ بعید نہ تھا وہ معصومیت کا ڈرامہ رچا کر وسیم کو بھڑکا دیتی۔

”بھابھی پلیز۔“ کھانا کھاتے نعیم اور وسیم کی استفہامیہ نظریں رمزہ سے ہو کر رمزہ پر لگی تھیں، نوشہینہ نے چٹکی سے اسے ٹوک دیا، اسے اندازہ نہ تھا کہ رمزہ کی خاموشی بلاوجہ ہے ورنہ وہ خود اسے ساری بات بتا کر کسی کو بھی نہ بتانے کی تاکید کر دیتی، رمزہ اس نے خواہ مخواہ کا بھر باندھے ہوئے تھی وہ اس سے مزید بدگمان ہو سکتی تھی اور نوشہینہ کو یہ ہرگز گوارا نہ تھا، اسے رمزہ بھی بڑی دونوں بھابیوں جیسی عزیز اور پیاری تھی، وہ اس سے فاصلے کم کرنا چاہتی تھی، رمزہ کڑوا کر رہ گئی، وہ اس حملے کے لئے ذہنی طور پر تیار نہ تھی سو اسے فوراً کوئی بہانہ نہ سوچ سکا۔

”رمزہ بھابھی کیا پوچھ رہی ہیں؟“ وسیم نے اس کی مسلسل خاموشی پر غصیلے کاٹ دار لہجے میں سوال کیا تھا، مگر بات خاصا ایٹو بن چکی تھی، نوشہینہ بھابھی کی ساری بات بتا چکی تھی اور بھابھی نے عدالت سجا لی تھی۔

”وہ میں..... وسیم نوشہینہ میرے کمرے میں آئی تھی میں آپ سے بات کر رہی تھی شاید نوشہینہ کو برا لگا کہ میں اسے وقت نہ دے پالی تھی۔“ رمزہ نے کمال ہوشیاری سے ساری بات کو نوشہینہ پر الٹ دی تھی، وہ نوشہینہ کے احتجاج کو نہ سمجھ سکی تھی۔

”نوشہینہ تم مجھے صاف بات بتاؤ اور خبردار جو رمزہ کی طرح جھوٹ بولا۔“ وسیم کا رونے لگنا

بہن کی سمت تھا، اسے رمزہ کی بات کا رتی بھر اعتبار نہ آیا تھا، رمزہ بھونچ کر رہ گئی اسے اپنا جھوٹ کی آمیزش والا بیچ نہ دامت سے چر کر گیا، وہ احساس چپک سے سرخ ہو گئی تھی، وسیم نے اس کی بات کو رتی بھراہیت نہ سمجھی تھی اور سب کے سامنے پر ملا انظہار بھی کر دیا تھا، کوئی نہ دامت سی نہ دامت تھی، رمزہ نے کھا جانے والی نظروں سے نوشہینہ کو گھورا۔

”بھائی وہ.....“ نوشہینہ بری طرح پھنسی تھی وہ اس گھڑی کو کونے کی جب رمزہ بھابھی نے اس کے آنسو دیکھے تھے، وہ ہٹا کر خشک غلط تر کرنے لگی، رمزہ کے دل میں نفرت و عناد کی آگ بھڑکنے لگی۔

”بھائی وہ۔“ نوشہینہ نے خشک ہونٹوں پر زبان بھیرتے ہوئے ساری حقیقت اگل دی کہ اس کے بنا کوئی چارہ بھی نہ تھا، وہ وسیم بھائی سے بھی کچھ چھپا ہی نہ سکتی تھی، وسیم نے غصیلی شعلہ بار نگاہ رمزہ پر ڈالی جو سانس روک کے کھانا کھانا بھول چکی تھی اس کا ٹھکانا زک دل وسیم کے رد عمل کے تصور سے سہا چارہ تھا، رمزہ اور نعیم کی خاموش نظروں میں بھی اس کے لئے ملامت بھرا تاسف تھا، وہ نظریں جھکائے مجرمانہ انداز میں بلاوجہ پلیٹ میں بیچ ملائے جا رہی تھی، اس کے پاس اپنی صفائی میں کہنے کو اک لفظ نہ تھا کہ وسیم نے اس کی بات رد کر کے اسے پہلے ہی بے مول کر دیا تھا۔

☆☆☆

گھڑی کی سوئیاں رات کا ایک بج رہی تھیں وسیم نوشہینہ کو لئے نجانے کہاں گیا ہوا تھا کہ گھر آنے کا نام ہی نہ لے رہا تھا، وہ جیلے پیر کی بلی کی طرح سارے کمرے میں پکراتی پھر رہی تھی، وسیم نے اسے تین روز قبل ہی تو اسے امی اور

نوشہینہ سے بدتمیزی نہ کرنے کی ہدایت کی تھی، وہ بہن سے نادم تھا، اسے بیوی کا ذرا خیال نہ آیا تھا کہ جاتے سے اسے بھی جھوٹے منہ ہی سہی، آفر کر دیتا، رمزہ کے اندر بھانپڑ چلے تھے، رات کے سوادو بجے دونوں کی داپسی ہوئی۔

”نوشہینہ تم اپنی بھابھی کی باتوں کو دل پر نہ لیا کرو، میں تم سے اس کی طرف سے معافی مانگتا ہوں۔“ وسیم نوشہینہ کو اس کے کمرے تک چھوڑنے گیا تھا، اس نے نوشہینہ کے اندر داخل ہونے سے پہلے اس کا گال محبت و نرمی سے تھپتھا کر اس سے معذرت کی تھی، اپنے کمرے کے دروازے سے چپکی رمزہ کے حساس کالوں نے وسیم کا جملہ فوراً کچج کر لیا تھا تو اس کے سر پر لگی اور بیروں پر بھی، اس نے کوئی ٹھٹھ نہ کیا تھا کہ وسیم اس چٹکی سے معافی مانگ رہا تھا، وہ جیلے دل سے دروازے سے ہٹ گئی کہ وسیم ادھر ہی آ رہا تھا۔

وسیم نے اس پر نگاہ غلط تک ڈالنا بھی گوارا نہ کیا اور سیدھا دواش روم گھس گیا وہ چند لمحوں بعد آیا اور چادر لے کر صوفے پر دراز ہو گیا، رمزہ کا دل دھک سے رہ گیا، وہ اس سے شدید غصا تھا۔

”وسیم!“ وہ دل کے ہاتھوں مجبور اس کے سر ہانے جا کھڑی ہوئی، وسیم نے اس کی پکار کا کوئی جواب نہ دیا۔

”وسیم!“ رمزہ نے چند ثانیے انتظار کے بعد اس کا بازو ہلایا، دوسری جانب ہنوز خاموشی چھائی تھی، رمزہ کی آنکھوں میں آنسو جمع ہونے لگے، شمع آپنی نے اس کی کاٹ دار آوازیں کر اس، نوکتے ہوئے وسیم کی ناراضگی کی طرف بھی توجہ دلائی تھی مگر اسے اپنی محبت پر یقین تھا، اسے مان تھا کہ وہ محبت کی طاقت سے شوہر کو سوم کرے گی مگر وسیم نے تو پہلے مرحلے پر ہی نوشہینہ کو اس پر نفیقت دے کر اسے چاروں شانے چت کر دیا

تھا، اس کا اعتماد متزلزل ہو چکا تھا اور دل اس کی خفگی سے ہراساں تھی، وہ بہن کا دیوانہ بہن کا خاطر بیوی سے دوسری بار الجھ پڑا تھا۔

”وسیم پلیز۔“ اب کے اس نے وسیم کے پاؤں پکڑ لئے، وسیم نے ناگواری سے پاؤں جھٹکتے ہوئے سر چادر سے باہر نکال کر اسے مجسم کر دینے والی نگاہ سے گھورا۔

”تم نوشہینہ سے معافی مانگو مگر وہ تم سے خوش ہو جائے تو میں بھی تم سے راضی ہوں۔“ وسیم نے زہر خند لہجے میں بات مکمل کر کے دوبارہ چادر اوڑھ لی تھی، وہ اپنی جگہ سن رہی تھی۔

☆☆☆

وہ چار بہنیں اور ایک بھائی تھے ان کے والد کا برسوں قبل انتقال ہو گیا تھا، امی لکھنی بھابھی کو بے حد چاؤ سے بیاہ کر لائی تھیں، وہ ان کی اکلوتی بہو تھی انہوں نے سارے ارمان نکالے تھے، ان چاروں بہنوں نے بھی بھابھی کے خوب لاڈ اٹھائے تھے، شروع میں کچھ عرصہ وقت صبح گزرا، پھر لکھنی بھابھی ان سب سے پیٹی پیٹی رہنے لگی تھیں، آپنی کی شادی کی ڈیٹ نکس ہو چکی تھی مگر بھابھی کو کسی کی کوئی پرواہ نہ تھی انہوں نے شادی کی تیاریوں میں بالکل دلچسپی نہ لی، وہ شادی سے قبل الگ گھر شفٹ ہو جانا چاہتی تھیں تاکہ بھیا کی تنخواہ شادی کے اخراجات میں کم سے کم صرف ہو، انہیں بالکل پرواہ نہ تھی کہ بھیا کے الگ ہونے سے شادی کے اخراجات کیسے پورے ہوں، مگر میں آمدنی کا کوئی دوسرا ذریعہ بھی نہ تھا، بھابھی بے حس کی انتہا پر تھیں، ستم در ستم کہ بھیا نے بھی الگ شفٹ ہونے کا فیصلہ کر لیا تھا، امی اندر سے ٹوٹ کر رہ گئیں، امی نے بھیلے دقتوں میں آپنی اور رمزہ کا کافی جہیز اکٹھا کر رکھا تھا، امی نے سینے پر پتھر کی سل رکھ کر انہیں اجازت دے دی، وہ

حالات کا رخ دیکھ رہی تھیں، وہ مخالفت کی پوزیشن میں نہ تھیں اور پھر بھلا چلے گئے، وہ ماں بہنوں کی ذمہ داریوں سے بالکل غافل ہو گئے، اسی بیمار رہنے لگی تھیں، انہیں منزہ سارا اور زارا کی فکر کھائے جانی تھی، انہی پریشان کن گزرتے دنوں میں آپ کی شادی ہو گئی، بھیا اور بھابی نے مہمانوں کی طرح شرکت کی تھی اس کی رہی سہی امید بھی دم توڑ گئی تھی، بالآخر بھیا کی بے اعتنائی نے اسی کی جان لے لی، بھیا اور بھابی کو معاشرے کی وجہ سے مجبوراً دوبارہ واپس آنا پڑا، وہ تین جوان بہنوں کو تنہا نہ چھوڑ سکتے تھے، منزہ نے ماسٹر مکمل کرتے ہی جاب کر لی تھی، بھیا بھابی نے جھوٹے منہ بھی اس نہ روکا، غالباً وہ ابھی بھی چاہتے تھے کہ منزہ اپنا اور بہنوں کا خرچ اٹھائے، زارا سارا ٹھنڈا ایر اور نوٹھ ایر میں تھیں، منزہ نے ان کے تعلیمی اخراجات خود اٹھا لئے، وہ بہنوں کو خود مختار دیکھنا چاہتی تھی نہ کہ بھابی کی غلامی کرتا، بھابی کا رویہ روز بروز بد سے بدتر ہوتا جا رہا تھا، انہیں تینوں ننڈیں بری طرح ٹھکنے لگی تھیں۔

منزہ کے اندر محرومی و خود ترسی پلنے لگی، بھیا بہنوں پر بے جا روک ٹوک اور سختی کرتے تھے ان کے منہ میں بیوی کی زبان تھی، بھابی ان سے من جا یا فیصلہ پا آسانی کروا کر ان تینوں کا جینا حرام کیے ہوئے تھیں، منزہ کے کوئی نوٹھ دنا رک دل میں بے پناہ جذبے و خواہشیں تھیں جو بقول بھیا "اپنے چو نیلے اگلے گھر جا کر پورے کرنا" کے مصداق دل میں دبی رہ گئیں، منزہ بیاہ کر سسرال آئی تو یہاں لوشینہ اس کے حق پر غاصب تھی وہ اب اپنے خوابوں و خواہشوں سے کسی قیمت پر دستبردار ہونے کو تیار نہ تھی، اسے ہر قیمت پر

لوشینہ کو دبا کر اپنا حق وصول کرنا تھا۔

اسے ہار نہ ماننا تھی، وہ آسانی سے اپنے خوابوں سے دستبردار ہونے کو قطعاً تیار نہ تھی، وہ اک عزم سے آنسو پونچھتی کھڑی ہو گئی، وہ لوشینہ سے معافی مانگنے کا فیصلہ کر چکی تھی اسے کچھ پانے کے لئے کچھ کھونا بھی تھا اور وہ اپنے تھوڑے نقصان پر راضی تھی، وہ دل میں مصمم ارادہ کیے بیڈ پر لیٹ گئی، اسے شکست تسلیم نہ تھی، الگ گھر اس کی ترجیحات میں نہ تھا، یہاں اس پر کوئی سختی یا بلاوجہ کی روک ٹوک نہ تھی، اسے صرف اپنے ادھورے سپنے عزیز تھے جو اسے ہر قیمت پر پانا تھے۔

☆☆☆

"لوشینہ سوری، مجھے تم سے بدترینی نہیں کرنا چاہیے تھی۔" ناشتے پر سبھی موجود تھے، منزہ نے سوچی سمجھی سکیم کے تحت سب کی موجودگی میں اسی سے معافی مانگ لی، اس کا رواں رواں احساس تو بہن سے سلگ رہا تھا، لیکن یہ تو بہن اس ذلت سے کہیں کم تھی جو رات و نیم نے اس کی بات جھٹلا کر اسے دی تھی، وہ اپنی تو بہن بھولی نہ تھی اسے لی الحال اپنی تو بہن بھلا کر آگے کا سوچنا تھا وہ بھابی کو بھگت چکی تھی اس نے مصلحتاً مصالحت کی راہ اپنائی تھی۔

"ارے بھابی سوری کیسی، میں آپ سے خفا تو نہیں ہوں۔" خالہ کی ڈسجھ ہو گئی تھی اسی، بھایا اور فاخرہ بھابی و ہیں رک گئے تھے، لوشینہ نے ان کی واپسی تک چھینوں کا پروگرام بنالیا تھا تاکہ روضہ بھابی پر کام کا برڈن نہ پڑے، لوشینہ نے صاف گوئی سے محبت کا اظہار کیا، وہ منزہ سے بالکل خفا نہ تھی اور نہ ہی اس کے دل میں منزہ کے لئے کوئی میل یا بغض و عناد تھا۔

"تو تم نے مجھے معاف کر دیا۔" منزہ

مصنوعی پن سے خوشی سے کھل اٹھی، وہ متواتر کن اکھیوں سے دیم کو دیکھ رہی تھی، دیم کا سارا دھیان ادھر تھا، بظاہر ناشتہ کرنے میں مگن دیم نے اک نظر منزہ کے خوشی سے کھلے چہرے پر ڈالی، اس کے اندر اطمینان پھیل گیا، منزہ اس سے وابستہ رشتوں کو اہمیت دیتی تھی اس کے لئے یہی کافی تھا۔

"بھابی میں آپ سے بالکل خفا نہیں ہوں۔" لوشینہ اس کے ہار ہار معافی مانگنے پر شرمندہ ہو رہی تھی، معصوم لوشینہ منزہ کی مکاری سمجھ ہی نہ سکی تھی۔

"ٹھیک پوسوچ سوچ سسر۔" منزہ نے اسے خود سے پلٹا کر اس کے گال مونیت سے چوم لئے، دیم مطمئن سا آفس جانے لئے اٹھ کھڑا ہوا، منزہ کے لبوں پر کمرہ مسکراہٹ کھینے لگی، اس کی پوسوچ نگاہوں نے دیم کا دو تک پیچھا کیا تھا

☆☆☆

"اسی آپ ممبر کریں، آپ حوصلہ ہاریں گی تو فاخرہ کو کون حوصلہ دے گا۔" صالحہ پشاور سے لوٹ آئی تھی، روضہ اور لوشینہ ان کے گرد جمع تھیں منزہ بھی کچھ دیر بعد آ گئی، صالحہ بہن کو یاد کر کے رو رہی تھیں، منزہ نے منہاس بھری محبت سے انہیں تسلی دیتے ہوئے فاخرہ کو دیکھا، ندیم بھائی ڈرائیجنگ سے خاصا تھک چکے تھے وہ فریش ہونے آرام کے لئے کمرے میں چلے گئے تھے، فاخرہ آنسو بہانے میں مگن تھی آخر ماں سے جدائی کا غم کچھ کم تو نہیں ہوتا ہے۔

"فاخرہ تم بھی جا کر آرام کرو۔" صالحہ نے آنسو پونچھتے ہوئے فاخرہ کو کمرے میں جانے کا اشارہ کیا، وہ ہفتہ بھر میں ہی خاصا کمزور ہو گئی تھی، اسے وہاں بھی آرام کا موقع نہ ملا تھا، ہفتہ بھر پر سہ دینے والوں کا رٹس رہا تھا، فاخرہ نے اپنا رو

روکر برا حال کر رکھا تھا، وہ ماں سے بے حد قریب تھی، اسے ماں کی کمی نے غم سے ادھ موا کر دیا تھا، فاخرہ سہلائی اٹھ گئی۔

"اسی! آئی کی طبیعت اچانک بگڑی تھی یا وہ ہارٹ پشٹ تھیں۔" منزہ، صالحہ سے آئی کی ڈسجھ اور بیماری کی تفصیلات پوچھنے لگی۔

"بیٹا اسے ہارٹ کا کوئی مسئلہ نہ تھا پہلا ایک ہی جان لیوا ثابت ہوا۔" صالحہ کا گلا بہن کے ذکر پر بندھ گیا، منزہ افسردہ ہو گئی، اسے اپنی ماں یاد آ گئی تھی، اس کی امی کو بھی پہلا ایک ہی جان لیوا ثابت ہوا تھا۔

"ادھ۔" اس نے طویل سرد آہ بھری، ماحول پر بوجھل خاموشی طاری ہو گئی تھی۔

"روضہ بیٹا دوپہر ہونے کو ہے تم کھانا تیار کرو جا کر۔" دن رفتہ رفتہ ڈھل رہا تھا، ندیم بھوک کا کچا تھا انہوں نے وقت نکل پڑنا دیکھ کر روضہ کو کھانا پکانے کا کہا تھا، وہ اٹھ کر کچن میں چلی گئی لوشینہ بھی اس کا ہاتھ بنانے کی غرض سے اٹھ گئی، منزہ صالحہ کا غم بنانے کے لئے ان سے ہاتھوں میں مگن ہو گئی۔

☆☆☆

انہیں آئے کی روز گزر گئے تھے، فاخرہ ابھی تک اداس اور پریشان تھی، اس کا غم وقت کے ساتھ ہی کم ہوتا تھا، صالحہ اس سے گھر کا کام کم کرداتی تھیں، لوشینہ روضہ کا ہاتھ بنانے کے لئے روز روز کالج سے چھٹی نہ کر سکتی تھی، صالحہ نے اس روز منزہ سے کھیر پکائی کی رسم کردائی تاکہ وہ بھی گھر کے کاموں میں حصہ لے سکے، وہ سارا دن اپنے کمرے میں بند رہتی تھی اور مردانہ بھی گھر کے کسی چھوٹے موٹے کام کو ہاتھ نہ لگاتی تھی، لوشینہ کالج سے آکر مقدور بھر روضہ کا ہاتھ بناتی تھی اور خود ان کی بوڑھی ہڈیوں میں اتنا دم نہ رہا

تھا کہ وہ بہو کا ہاتھ بنا سکیں، وہ شوگر کی مریضہ تھیں اور رمزہ کا ہاتھ حصّہ سبزی پیاز یا لہسن کاٹنے تک بنائی تھیں، رمزہ گھر کے کاموں کے ساتھ بیٹے کو بھی سنبھالتی تھی جس سے اسے خاصی ٹھکن ہو جاتی تھی، انہیں خود بہو کی تھکاوٹ کا احساس تھا، سو انہوں نے رمزہ سے کھیر لپکائی کی رسم کروائی۔  
نوشینہ نے اس روز پچھل چھٹی کی تھی وہ اور رمزہ اس کا ہاتھ بنانے کے لئے بچن میں اس کے ساتھ مصروف تھیں، فاخرہ گھر کی صفائی اور صالحہ پوتے کو سنبھالنے میں لگی تھیں۔

”بھابھی آپ آج کیا پیشکش بنا رہی ہیں؟“  
نوشینہ نے لہسن چھیلنے ہوئے تو رمزہ تیار کر لی رمزہ سے پوچھا تھا، رمزہ تو رمزہ ڈسپنیل رائس کوٹنے اور شامی کباب بنا رہی تھی اور وہ بیٹھے میں کسٹرز تیار کر کے جنے کے لئے فریج میں رکھ چکی تھی، رمزہ اسے پیاز چھیل کر اور رائس کے لئے سبزیاں کاٹ کر دے رہی تھی، نوشینہ کا اشارہ بیٹھے کی طرف تھا کہ وہ صبح سے تمام ٹنگین ڈشز تیار کر رہی تھی۔

”میں کسٹرز تیار کر کے فریج میں رکھ چکی ہوں۔“ رمزہ کو رمزہ کی موجودگی میں نوشینہ کا سوال سخت زہر لگا محروم گھر میں نوشینہ کی اہمیت کا بخوبی واقفیت رکھتی تھی اسی لئے اس نے کڑھتے ہوئے بظاہر چہرے پر مسکراہٹ طاری کر کے نرمی سے جواب دیا۔

”کسٹرز کیا پیشکش ہے یہ تو میں بھی بنا لوں بھابھی۔“ نوشینہ کو کسٹرز خاص پسند نہ تھا اس نے برا سامنا نہ بنایا، وہ کوئنگ میں حصہ نہ لیتی تھی محروم چند چھوٹی موٹی ڈشز لودلز، کسٹرز وغیرہ بنا لیتی تھی، وہ بیٹھے میں کوئی خاص ڈش چاہ رہی تھی، اس نے بھابھی کی رسم انجوائے کرنے کے لئے بطور خاص چھٹی کی تھی اور کھانے میں کسٹرز مل رہا

تھا اس کا منہ لٹک گیا۔

”نوشینہ تم جا کر امی کے ساتھ فیضان کو سنبھالو، میں اور رمزہ باقی سب کام کر لیں گے۔“  
رمزہ کو اس کا بے لاگ تہنہ پسند نہ آیا تھا، اس کے چہرے سے ناگواری کے واضح تاثرات جھلک رہے تھے، رمزہ نے حفظ مانتھم کے طور پر نوشینہ کو دہاں سے کھسکایا مگر رمزہ پھر اسے کچھ نہ کہہ دے، نوشینہ اٹھ کر چلی گئی ویسے بھی اسے صرف لہسن چھیلنا تھا جو وہ چھیل چکی تھی۔

”رمزہ تم بیٹھے میں فروٹ ٹرانگل بنا لو، میں تمہارے ساتھ سیلپ کرواتی ہوں۔“ رمزہ نے اس کے جانے کے بعد رمزہ کو کھنداری سے مشورہ دیا، رمزہ کو صرف کسٹرز بنانا آتا تھا، وہ گوگو ٹنگش میں تھی۔

”سب نے مل کر نوشینہ کا دماغ خراب کر رکھا ہے، مجھے اس کا دماغ جلد ٹھکانے لگانا ہو گا۔“ رمزہ سخت بد مزہ تھی، اس کا کام ختم ہونے کو تھا، وسیم نے ہاف لیو لے کر گھر آتا تھا وہ اس کے آنے سے پہلے خود تیار ہو جانا چاہتی تھی، نوشینہ نے فرمائش کر کے اس کا کام بڑھا دیا تھا، وہ فروٹ ٹرانگل کی ترکیب جانتی تھی مگر بنایا بھی نہ تھا، وہ فرسٹ ٹائم بناتے ہوئے ہچکچا رہی تھی، نجانے کیسا بے اور کسی کو پسند آئے یا نہ آئے، وہ کسٹرز بنانے میں ماہر تھی اور اس کے ہاتھ کا بنا کسٹرز گھر میں سب شوق سے کھاتے تھے حتیٰ کہ ہر بات پر ناک بھوں چڑھانے والی لبتی بھابھی بھی اس کے بنے کسٹرز کی کھلے دل سے تعریف کرتی تھیں۔

رمزہ بھابھی اس کا موڈ آف دیکھ کر خود فروٹ ٹرانگل بنانے لگ گئیں ناچار اسے ان کی مدد کروانا پڑی بلکہ رمزہ نے رمزہ سے پوچھ کر خود بنایا تھا۔

”بھابھی آپ کھانا لگا دیجئے گا، میں ذرا فریش ہو آؤں۔“ وسیم کے آنے میں وقت کم تھا رمزہ تیار ہونے کے لئے چلی گئی، وہ تیار ہو کر آئی تو نہ صرف وسیم آکا تھا بلکہ کھانا بھی لگ چکا تھا، نسیم بھائی نے چھٹی کی تھی جبکہ نسیم بھائی آفس قریب ہونے سے بچ بریک میں گھر آ گئے تھے۔

”واؤ فروٹ ٹرانگل۔“ رمزہ نے وسیم کے قریب کرسی سنبھالی ہی تھی کہ نوشینہ کی چپکٹی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی، وہ رمزہ کے گلے میں پھنسی ہڈی بن چکی تھی جو نہ ٹنگے بن پارہی تھی اور نہ اٹکتے، رمزہ نے اسے یکسر نظر انداز کر کے وسیم کی طرف خوش دلی سے تو رمزہ کی ڈش بڑھائی تھی۔

”زبردست یار۔“ وسیم نے پہلا ٹوالہ لیتے ہی کھلے دل سے اس کی تعریف کی، رمزہ کو لگا اس کی محبت وصول ہو گئی ہے، اس نے باری باری سب ڈشز وسیم کو پکھا میں، اس کے ہاتھ میں بہت ذائقہ تھا، سب کو کھانا بہت پسند آیا تھا اور سبھی نے خوب سیر ہو کر کھایا تھا۔

”بس اب مجھے بیٹھا دو ورنہ میں کھا کھا کر پھٹ جاؤں گا۔“ رمزہ نے راستہ کے ساتھ شامی کباب وسیم کی طرف بڑھائے تو اس نے مزید کھانے سے انکار کر دیا، وہ پہلے ہی تین کباب کھا چکا تھا۔

”فروٹ ٹرانگل بھی مزے کا ہے۔“ وسیم نے بیٹھے کا پہلا بیج منہ میں ڈالتے ہی تعریف کی، سب نے تائید میں سر ہلایا، رمزہ کی ٹھکن سب کو سیر ہو کر کھانا دیکھ کر اترتی تھی۔

”بھیا! فاخرہ بھابھی زیادہ مزے کا بناتی ہیں۔“ نوشینہ نے سادگی سے رائے دی تھی تو نوشینہ پھر رمزہ کے ضبط کے لئے کڑا احتجاج ثابت ہوئی تھی اس نے بمشکل خود کو کچھ کہنے سے روکا تھا، وہ اسے بچی سمجھ کر نظر انداز یا درگزر کرنے پر

ہرگز تیار نہ تھی، وہ لبتی کے بعد نوشینہ کے ہاتھوں بری طرح زنج ہوئی جا رہی تھی، رمزہ کے منہ کے زاویے بگڑ کر رہ گئے۔

”بری بات نوشینہ، رمزہ نے بھی بہت مزے کا بنایا ہے۔“ صالحہ نے بچی کو نور اخص سے ڈانٹ دیا، وہ اپنے بیٹھنے میں رمزہ کے منہ کے بگڑے زاویے نہ سمجھ سکتی تھی، صالحہ ماں تھیں وہ اسے بچی سمجھ کر نظر انداز کر سکتی تھیں مگر رمزہ برائی تھی وہ آسانی سے دل سے میل نہ نکالتی تھی، صالحہ نے دنیا دیکھی تھی وہ پانی سر سے اوپر نہ ہونے دینا چاہتی تھیں۔

”امی میں نے کیا کہا ہے۔“ نوشینہ ماں کی ڈانٹ پر شرمندہ ہو گئی، اسے لاکھ غور کرنے پر بھی اپنی غلطی سمجھ نہ آئی تو وہ احتجاج کے بنا نہ رہ سکتی تھی اس نے تو محض اپنی رائے کا اظہار کیا تھا۔

”بہو کھانا واقعی بہت مزے کا تھا یہ تمہارا انعام۔“ رمزہ نے پکلی بار ہر ڈش بہترین تیار کی تھی، صالحہ نے کھلے دل سے سراہتے ہوئے اسے ہزار کا ٹوٹ دیا اور پھر نسیم بھائی اور نسیم بیہانے بھی اسے انعام دیا تھا، جبکہ رمزہ بھابھی اور فاخرہ بھابھی نے محبت سے اسے گلے لگا کر اس کی ڈشز کو کھلے دل سے سراہا تھا۔

☆☆☆

”نوشینہ تمہیں بیچ کرنا آتی ہے؟“ وہ سر پہر ڈھلے لان میں چائے سے لطف اندوز ہوتے ہوئے اکٹائس کی بک میں جو تھی، فاخرہ بھابھی شام کے لئے سبزی کاٹ رہی تھیں، رمزہ کچھ دیر پہلے دونوں کے لئے چائے بنا کر لائی تھی، فاخرہ سے باتوں میں جو رمزہ نے اچانک اسے مخاطب کیا، اس نے سر اٹات میں ہلا دیا۔

”تم میرے کمرے میں آ کر میری بیچ کر دو۔“ رمزہ کو رات کو صرف چائے بنانا بھی سوادہ



فارغ تھی، وہ دونوں چائے پی چکیں تو منزہ کپ اٹھا کر چلی گئی۔

لوہینہ بیچ کریم بنا کر منزہ کے کمرے میں آ گئی اور اس کی بیچ کرنے لگی، لوہینہ نے ابھی اس کی بیچ ختم ہی کی تھی کہ منزہ کے سیل پر کال آنے لگی۔

”لوہینہ ذرا میرا سیل دینا۔“ منزہ کا سیل بیڈ کے دوسرے کونے پر تھا لوہینہ اس کا سیل اٹھانے چلی گئی، منزہ نے موقع پاتے ہی بیچ کی زائد مقدار چہرے پر فالتو بالوں سے آگے نکالی، لوہینہ نے اسے سیل تھمایا تو اس کی کال بند ہو چکی تھی۔

”کال کٹ گئی ہے چلو دوبارہ آ جائے گی تم جاؤ۔“ منزہ نے مایوسی سے سر ہلا کر اسے جانے کی اجازت دی، لوہینہ اس کے چہرے پر غور کیے بناڑ گئی۔

”یہ تم نے بیچ کی ہے، اگر جہیں کرنا نہیں آتی تھی تو تم انکار کر دیتی، کم از کم میرا چہرہ تو خراب نہ ہوتا۔“ منزہ غصے سے گرجی وہ اس کی دھاڑ نما چیخ پر ٹھک کر رک گئی، منزہ کے چہرے فالتو بالوں کے سامنے والے حصے پر بھی بیچ لگی ہوئی تھی، وہ تھمسی پٹلی۔

”بھابھی میں نے تو صرف فالتو بالوں پر لگائی تھی مجھے نہیں پتہ یہ کیسے لگ گئی۔“ لوہینہ ناگہبی سے ہنسنے لگی اس کے قریب آ گئی۔

”میں بھی تو یہی پوچھ رہی ہوں کہ تم نے میرا چہرہ کیوں خراب کیا ہے۔“ منزہ نے اسے خونخوار نظروں سے گھور کر لفظ لفظ چہایا۔

”بھابھی وہ میں۔“ لوہینہ نے ہٹلا کر اپنی صفائی دینا چاہی تھی۔

”کیا بات ہے منزہ، کیوں شور مہر رہا ہے۔“

صالحہ شور سن کر آگئیں، منزہ غصے سے سرخ چہرہ لئے لوہینہ پر برہم تھی۔

”ای دیکیں اس نے میرے چہرے کا کیا حشر کیا ہے۔“ منزہ نے معصومیت سے ان کے سامنے لوہینہ کی شکایت لگائی، لوہینہ بیچ کریم اپنے کمرے سے ساتھ لے کر آئی تھی اور اس نے ایکسٹرا کریم کا استعمال نہ کیا تھا، منزہ کے پاس بیچ کریم ختم تھی، اسے سمجھ نہ آ رہا تھا کہ نجائے کیسے بھابھی کا چہرہ خراب ہو گیا۔

”لوہینہ سوری کر دو بھابھی سے۔“ صالحہ نے منزہ کا چہرہ دیکھا تو غصے سے بچی کو ڈانٹا، منزہ کے تن من میں ٹھنڈک پڑنے لگی، اس نے سوچتی سمجھتی سکیم کے تحت لوہینہ سے جھوٹ بولا تھا کہ بیچ ختم ہے، ساری پلائنگ اس کی مرضی کے مطابق ہوئی تھی، لوہینہ کو اس نے شرمندہ بھی کر دیا تھا اور کسی کو اس پر شک بھی نہ گزرا تھا، منزہ کا موڈ لچرزم پڑنے لگا تھا۔

”ای میں نے تو زیادہ کریم نہ لگائی تھی۔“ لوہینہ نے روٹھ کر صفائی دی۔

”تو پھر منزہ کا چہرہ کیسے خراب ہوا۔“ ای نے کڑے تیروں سے بچی پر نظریں جمائیں اس بات کی تو لوہینہ کو بھی سمجھ نہ آ رہی تھی، بھابھی کے پاس کریم نہ تھی، اس نے مناسب کریم استعمال کی تھی تو پھر چہرہ کیسے خراب ہو گیا۔

”سوری بھابھی۔“ لوہینہ کے پاس معافی کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا، سوا سے معذرت کرنا ہی پڑی تھی۔

”اٹس او کے لٹل سسٹر، کوئی بات نہیں غلطی انسان سے ہی ہوتی ہے۔“ منزہ کے لہجے میں شیرینی گھل گئی اس نے محبت سے لوہینہ کو گلے لگا لیا۔

صالحہ اسے تاکید کر کے کمرے سے نکل

سیں، لوہینہ بھی بچھے دل و چہرے سے ان کے پیچھے تھی، نشو سے چہرہ صاف کرتی منزہ کے چہرے پر مکروہ مسکراہٹ پھیل گئی تھی، ابھی تو اسے پہلی کامیابی ملی تھی، اسے مزید کامیابیوں کی تمنا تھی۔

☆☆☆

لوہینہ کے سینڈ انیر کے ایگزامز قریب تھے، وہ ان دنوں گھر پائی جاتی تھی، وہ میڈیکل انٹر کے فرسٹ انیر میں شاندار نمبرز سے کامیاب ہوئی تھی، وہ میڈیکل میں ایڈمیشن کے لئے دن رات پڑھاتی تھی، جتنی تھی، اس روز صالحہ اور فاخرہ پڑوس میں میلاد میں گئی ہوئی تھیں، منزہ کی کھانا پکانے کی باری تھی، وہ کچن میں مصروف تھی اسے بالک گوشت بنانا تھا سو وہ ناشتے سے فارغ ہو کر بالک کاٹنے بیٹھ گئی تھی۔

”بھابھی ذرا نمک چکھیں۔“ منزہ سے سالن میں اکثر نمک تیز ہو جاتا تھا اس نے بیچ میں سالن ڈال کر منزہ کی طرف بڑھایا، وہ بیٹے کے لئے دودھ گرم کرنے کچن میں آئی تھی، کچن میں کھانے کی اشتہا انگیز خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔

”مرچ بالکل ٹھیک ہے نمک ذرا کم ہے، تم سالن کا کریڈٹ میں چھک کر نمک ڈال لیانا۔“ سالن میں ابھی تھوڑا پانی تھا جس کے سوکھے پر نمک بیج ہونے کا امکان تھا، فیضان دودھ کے لئے رو رہا تھا، رزمہ بھولت دودھ ٹھنڈا کر کے فیڈر میں ڈال کر چلی گئی اسی اثناء میں لوہینہ اپنے کمرے سے باہر نکل آئی، اپنے کمرے کی طرف تیزی سے بڑھتی رزمہ اسے باہر نکلتا دیکھ چکی تھی، منزہ کے لئے یہ موقع فہیمت تھا، لوہینہ پانی پینے کے لئے کچن میں آگئی تھی اسے آواز دے کر بلانا بھی نہ پڑا۔

”لوہینہ ذرا نمک چکھنا۔“ وہ پانی پی کر

پلٹنے لگی تو منزہ نے اسے پکار لیا، سالن میں پانی کافی کم رہ گیا تھا، منزہ دوبارہ نمک چھک چکی تھی نمک ابھی بھی معمولی کم تھا اس کے شاطر ذہن نے فوراً پلان ترتیب دے ڈالا تھا۔

”بھابھی نمک معمولی کم ہے۔“ لوہینہ نے نمک چھک کر بیچ سائیڈ میں رکھ دیا۔

”لوہینہ تم اپنے حساب سے ڈال دو۔“ منزہ نے نمک کا ڈبہ اس کی طرف بڑھایا لوہینہ نے ہاتھ سے چٹکی بھر نمک سالن میں چھڑک کر ڈبہ کاؤنٹر پر رکھ دیا اور پلٹ گئی، سالن پک کر تیار تھا، منزہ نے نمک چکھا، نمک ٹھیک تھا اس نے دانستہ سالن میں نمک تیز کر دیا، تھوڑی دیر تک صالحہ اور فاخرہ لوٹ آئیں، منزہ روٹیاں تیار کر چکی تھی، اس نے ان کے آتے ہی کھانا ٹیبل پر جن دیا۔

”منزہ تم نے آج پھر نمک تیز کر دیا ہے۔“ گھر میں افراد خانہ اچھے کھانے کے دیوانے تھے، معمولی تیز نمک بھی کسی کو برداشت نہ ہوتا تھا، صالحہ نے پہلا لقمہ منہ میں ڈالتے ہی ناگواری کا اظہار کیا۔

”ای میں نے آخر میں لوہینہ کو سالن چکھایا تھا اور اسی نے نمک ڈالا تھا۔“ منزہ نے کمال ہوشیاری سے تمام لمحہ لوہینہ پر ڈال دیا۔

”بھابھی میں نے اپنے حساب سے چھک کر چٹکی بھر نمک ہی ڈالا تھا۔“ لوہینہ نے فوراً اپنی صفائی دی، اس نے نمک کی اتنی مقدار نہ ڈالی تھی کہ نمک سالن میں اس قدر تیز ہو جاتا۔

”تم نے سالن میں پانی کا حساب نہ رکھا ہو گا۔“ رزمہ نے نرمی سے لوہینہ کی صفائی رد کی، منزہ کا پلان کامیاب رہا تھا۔

”لوہینہ تمہیں نمک کم ڈالنا چاہیے تھا۔“ صالحہ نے بچی کو بری طرح گھر کا، وہ روٹھ گئی،

نمک تیز ہونے کی وجہ سے اس کی سمجھ میں نہ آ رہی تھی، بھلا چنگی بھر نمک سے سالن میں نمک کیسے اس قدر تیز ہو گیا، منزہ صاف بچ گئی تھی۔

”پلیس ای آپ کھانا کھائیں میں اس میں ابھی آلو ڈال لیتی ہوں۔“ منزہ نے کمال ہو شکاری و معصومیت سے لڑھکیا۔ لڑھکیا اب بھی لڑھکیا کو دوسروں کی نظر میں برا بنانے میں کامیاب رہی تھی، صالچہ کے ماتھے کی سلوٹیں صاف ظاہر کر رہی تھیں کہ انہیں بچی پر سخت غصہ ہے، رمزہ اور فاخرہ بھی کھانا زہر مار کر رہی تھی، صرف وہی تھی جسے سالن لذیذ لگ رہا تھا۔

☆☆☆

لڑھکیا کے ایگزٹریم ہو گئے تھے، اس کے پیچھے بہت اچھے ہوئے تھے، وہ میڈیکل میں ایڈمیشن کے لئے پرامید تھی، وہ آخری پیپر دے کر آئی تو لمبی تان کر سوئی، اسے شام کو منزہ نے آکر جگایا تھا وہ اس کے لئے چائے بنا کر لائی تھی، لڑھکیا چائے دیکھ کر کھل اٹھی، اسے حقیقتاً چائے کی طلب ہو رہی تھی۔

”شکریہ کیسا یار، میں تمہاری بڑی بہنوں جیسی ہوں۔“ منزہ نے معنوی لگاؤ سے اسے خود سے لپٹا لیا، وہ اس کی راہ کا کاٹھا تھی، ویم کی محبتوں کا مرکز، منزہ ان بیویوں میں سے تھی جو شوہر کی توجہ کا ارتکاز صرف اپنی ذات کے گرد پسند کرتی ہیں انہیں شوہر کی توجہ کا مرکز کہیں اور ہو، بالکل پسند نہیں آتا، خواہ وہ ان کی ماں اور بہن ہی کیوں نہ ہو، وہ شوہر کی نگاہ کا مرکز صرف خود کو دیکھنا پسند کرتی ہیں اور پھر منزہ کو تو اس کی وجہ سے ویم کی نظروں میں گر کر اس کی ناراضگی بھی سہنا

پڑی تھی پھر وہ بھلا کیسے اسے آسانی سے معاف کر دیتی، وہ دھیرے دھیرے اپنی سازشوں کے جال کی بنت جاری رکھے ہوئے تھی اور دوسری طرف معنوی لگاؤ و محبت سے ویم، لڑھکیا اور امی کا دل بھی جیتے ہوئے تھی، اس کی خوش قسمتی تھی کہ اس کی مکاری و فریب کو صالچہ جیسی جہاندیدہ عورت کی نگاہ میں نہ بھانپ سکی تھیں، اسی لئے اسے کھل کر اپنی سازش پر عمل کرنے کا موقع مل گیا تھا۔

”تمہارا پیپر کیسا ہوا؟“ منزہ ہر بار اس کے پیپر دے کر آنے پر اس کے پیپر کا ضرور پوچھتی تھی۔

”زبردست بھابھی! مجھے پوری امید ہے کہ میرا میڈیکل میں ایڈمیشن ہو جائے گا۔“ لڑھکیا کے تمام پیپرز بہترین ہوئے تھے اسے فائنل ایئر میں بھی بہترین مارکس کی امید تھی، اس کے چہرے پر پرامید مسکراہٹ پھیل گئی۔

”انشاء اللہ۔“ منزہ نے غلوں سے کہا، اس کا مقصد اسے گھروالوں اور خصوصاً شوہر کی نظروں میں گرانا تھا اسے لڑھکیا کی کامیابیوں سے نہ کوئی لینا دینا تھا اور ہی کوئی حسد، اسے کوئی فرق نہ پڑتا تھا کہ لڑھکیا کا ایڈمیشن میڈیکل میں ہوتا ہے یا نہیں۔

☆☆☆

”لڑھکیا تم رمزہ کے ساتھ مشین لگا لو۔“ صالچہ کو دو روز سے بخار تھا، وہ ہر دیک ایڈ پر بچی کے ساتھ مشین لگاتی تھیں اور ہفتے بھر کے سب افراد خانہ کے کپڑے دھو ڈالتی تھیں اس روز فاخرہ کی کھانا اور منزہ کی صفائی کی باری تھی، رمزہ کو کھانے کے برتن دھونا تھے جو صالچہ نے فاخرہ اور منزہ کو مل کر دھونے کا کہا تھا، لڑھکیا پیپر سے فراغت کے بعد رزلٹ کے انتظار میں تھی اس کی

منج نو بجے سے پہلے نہ ہوتی تھی، لڑھکیا سو کر اٹھی تو صالچہ نے بچی کو مخاطب کیا، لڑھکیا نے ناشتہ کرنے کے بعد رمزہ کے ساتھ واشنگ مشین لگا لی۔

صفائی کرتی منزہ کو داؤد روم میں جگے ویم کے ان دھلے نئے سوٹ کا خیال آیا تو وہ سوٹ دینے اور چل آئی، ان کے ہاں کپڑوں کی دھلائی سمجھت پر کی جاتی تھی، رمزہ غالباً فیضان کو سلا رہی تھی، امی اپنے کمرے میں جبکہ لڑھکیا واش روم میں تھی رمزہ کو موقع غیبت لگا، مشین ابھی لگی تھی اور اس میں سارے ہلکے رنگوں کے مردانہ سوٹ دھل رہے تھے ویم کے سوٹ کا رنگ تیز تھا اس نے سوٹ نظر بچا کر مشین میں ڈال دیا اور تیزی سے نیچے آگئی۔

صالچہ نا سازی طبیعت کے باعث پوتے کو سنبھالنے کی پوزیشن میں نہ تھیں، فیضان کے سونے کا ٹائم تھا وہ سویا تو رمزہ مشین کا بزرگ کر باہر آگئی۔

”لڑھکیا میں نے تم سے کہا تھا کہ ہلکے مردانہ رنگوں کے کپڑے مشین میں ڈالو تم نے ویم کا نیا تیز کمر کا سوٹ بھی ڈال دیا، سارے سوٹ خراب ہو گئے ہیں۔“ ویم کا سوٹ پہلی بار دھل رہا تھا اس کا رنگ نکل کر دوسروں کے کپڑوں پر چڑھ گیا تھا، سارے سوٹ بد رنگ اور خراب ہو گئے تھے، لڑھکیا واش روم سے نکلی تو رمزہ غصے سے اس پر چڑھ دوڑی، فیضان رو رہا تھا، وہ اسے کپڑے مشین میں ڈالنے اور سرف کی مقدار سمجھا کر فیضان کو سلائے چلی گئی تھی، وہ واپس لوٹی تو کپڑوں کا حشر ہو چکا تھا، منزہ تک اوپر سے آوازیں صاف پہنچ رہی تھیں، مگر وہ اپنے کمرے میں بیٹھی رہی۔

”بھابھی یہ سوٹ میں نے نہیں ڈالا ہے۔“

لڑھکیا بھی اپنے دفاع میں ڈٹ گئی، اس نے ہلکے رنگوں کے کپڑے ہی ڈالے تھے، وہ بھابھی کی بتائی سرف کی مقدار ڈالنے کے بعد واش روم میں کپڑے پہنچ کرنے چلی گئی تھی، تاکہ کپڑے دھونے کے بعد صاف کپڑے پہن لے۔

”میں تم سے پہلے فیضان کو سلائے چلی گئی تھی، یہاں صرف تم تھی۔“ رمزہ کو اس کی ڈھٹائی پر غصہ آ گیا، مشین کے پاس کوئی آیا بھی نہ تھا تو پھر اس کے علاوہ یہ کام اور کس کا ہو سکتا ہے اور وہ تھی کہ صاف منکر ہو رہی تھی۔

”بھابھی آپ نے مشین میں پانچ سوٹ ڈالنے کو کہا تھا، میں نے پانچ ہی ڈالے تھے چھ سوٹ مجھے نہیں علم کس نے ڈالا ہے، میں واش روم میں تھی۔“ لڑھکیا حقیقت بیان کرنے سے باز نہ آئی، اس نے سنر سے سوٹ نکال کر باقاعدہ گئے، وہ جھٹکتے۔

”لڑھکیا تم جاؤ میں کر لوں گی۔“ وہ اپنی بات پر ڈٹی تھی رمزہ کو شدید غصہ آ گیا۔

”بھابھی آپ.....“

”تم جاؤ یہاں سے۔“ رمزہ غصے سے اس کی بات کاٹ کر دھاڑی، وہ خفگی سے منہ موڑ کر کپڑے بیچ لے پانی میں ڈبوئے لگی، لڑھکیا بے بسی سے اپنے اگلیاں مردوئی رہی، اس کا دماغ ماؤف ہوا جا رہا تھا، لیکن اسے بھولے سے بھی یاد نہ آیا تھا کہ اس نے چھ سوٹ ڈالے ہیں، ان سوٹس میں سب سے زیادہ ویم بھائی کا پسندیدہ سوٹ خراب ہوا تھا۔

”کیا ہوا بھابھی؟“ رمزہ اس کی موجودگی نظر انداز کیے بیچ میں ڈبوئے کپڑے چانچ رہی تھی کہ رمزہ چہرے پر معصومیت طاری کیے چلی آئی، رمزہ آف موڈ سے اسے خراب کپڑوں کے متعلق بتانے لگی۔

”منزہ تم بھابی کے ساتھ کپڑے دھلوا دو،  
نوشہ میرے ساتھ برتن دھلوا دے گی۔“ فاخرہ  
بھابی بھی ان کی ادنیٰ آوازوں پر اوپر آگئی  
تھیں، منزہ کے چہرے پر دسم کے نئے سٹس  
خواب ہونے کا سن کر بھی کوئی تشویش نہ تھی،  
فاخرہ کو شک گزرا لیکن اس کے پاس کوئی ثبوت نہ  
تھا، اس نے پریشان کھڑی نوشہ کا ہاتھ پکڑا اور  
منزہ کا جواب سنے بغیر نیچے آگئی، وہ منزہ سے کلوز  
ہونے سے اس کی نیچر کو کافی سمجھ چکی تھی، منزہ بچو  
تاب کھا کر رہ گئی، وہ خود بری طرح چنسی تھی۔  
”منزہ تم دسم کا سوٹ صاف کرو۔“ رمزہ  
مشین کا بڑا بچنے پر اٹھ گئی، مشین کا دوسرا راؤنڈ  
بھی مکمل ہو چکا تھا، منزہ مطمئن تھی کہ کسی کو اس پر  
شک نہیں گزرا ہے۔

☆☆☆

”نوشہ جنہیں شرم آتی چاہیے تم کتنی ڈھٹائی  
سے مکر رہی ہو۔“ دسم اپنے پسندیدہ سوٹ کا حشر  
دیکھ کر آگ بگولہ ہوا جا رہا تھا، نوشہ نے اپنی  
صفا کی دینا چاہی تو دسم غصے سے اس پر الٹ پڑا،  
دسم پہلی بار نوشہ پر برساتا یہی منزہ کی بڑی  
کامیابی تھی۔

”دسم تم اس پر ضرورت سے زیادہ غصہ کر  
رہے ہو، بچی ہے وہ۔“ صالحہ نوشہ کے آئے دن  
کی شکایتوں سے زچ ہو چکی تھیں انہوں نے اس  
معاملے میں چپ سادھ لی تھی، انہوں نے اسے  
مناسب پر سمجھنا زیادہ بہتر سمجھا تھا، فاخرہ مسلسل  
اس کی طرف نگاہ کر رہی تھی نہ جانے کیوں اسے  
منزہ پر شک تھا مگر وہ بغیر کسی نمونہ ثبوت کے اس  
کا نام بھی نہ لے سکتی تھی۔

”دسم آپ اب جانے بھی دیں جب سے  
آئے ہیں اسے ڈانٹنے چلے جا رہے ہیں۔“ منزہ  
نے دھلے کپڑے تہہ کر کے دانستہ وار ڈروپ میں

نہ رکھے تھے تاکہ دسم کی خود نظر پڑ جائے اور وہ  
شکایت لگا کر بری نہ بنے کہ اسے دسم کی نظروں  
میں اپنا مقام بھی بچانا تھا، منزہ نے دسم کے خوب  
دل کی بھڑاس لگانے تک چپ سادھ رہی، پھر  
وہ نوشہ کی حمایت کے لئے میدان میں کود پڑی،  
وہ نوشہ کی ہمدردی بھی چیتنا چاہتی تھی، وہ ایک  
تیز سے دو شکار کھیل رہی تھی، نوشہ بھابی کے  
ڈانٹنے پر صدمے سے گنگ تھی، نوشہ کو دکھ  
ڈانٹ پڑنے کا نہ تھا اسے سارا دکھ دسم سے  
ڈانٹ پڑنے کا تھا، دسم تو اس پر جان چھڑکتا تھا،  
دسم کو لمحہ بھر کو ندامت ہوئی، نوشہ نے پہلی بار  
مشین لگائی تھی اسے کپڑے دھونے کا تجربہ نہ تھا،  
وہ اسے ضرورت سے زیادہ ڈانٹ چکا تھا، وہ لب  
بھینچے کمرے سے نکل گیا، منزہ نوشہ کو دلاسا  
دینے لگی، فاخرہ کو اس کے ڈھکوسلے سے چڑ  
ہونے لگی وہ کھانا لگانے اٹھ گئی۔

☆☆☆

نیم بھابی کی پردوشن ہوئی تھی، انہیں کبھی  
نے بھگدیا تھا، وہ نئے گھر میں شفٹ ہو رہے  
تھے، صالحہ بے حد افسردہ تھیں وہ اپنے تینوں  
بیٹوں کو اکٹھا دیکھنا چاہتی تھیں، انہوں نے بیوی  
کے کئی سال انہی بیٹوں کے سر پر کائے تھے، ان  
کی اولاد نہ بھی انہیں مایوس نہ کیا تھا، وہ تینوں  
ماں کے بے حد فرمانبردار تھے اس روز نصیم نے  
نئے گھر شفٹنگ کے لئے آفس سے چھٹی کی تھی،  
صالحہ صبح سے کئی بار چپکے چپکے آنسو بہا چکی تھیں۔  
”امی آپ ہمارے ساتھ رہیں۔“ نصیم نے  
وقت رخصت غلوں دل سے پاں کو پیش کش کی  
اس نے تہہ دل سے خواہش کی تھی کہ ماں ان کے  
ساتھ رہے، وہ بھی بھابیوں سے الگ ہونے پر  
افردہ تھا۔

”نہ بیٹا میں بیاہ کر اس گھر میں آئی تھی میرا

جنازہ یہیں سے اٹھے گا۔“ صالحہ منہ پر دوپٹہ رکھ  
کر رو دیں، نوشہ نے بھی ماں کے ساتھ آنسو بہانے  
لگی۔

رمزہ، فاخرہ اور منزہ بھی افسردہ تھیں، منزہ  
کی دونوں جیٹھانیوں سے کوئی پر خاش نہ تھی، رمزہ  
کے جانے پر اداسی گھر کا ماحول عجب بو بھل سا  
تھا۔

”امی اللہ آپ کا سایہ ہمیشہ ہمارے سروں  
پر سلامت رکھے۔“ نصیم نے تڑپ کر ماں کے  
لبوں پر ہاتھ رکھا، اس نے عمری میں باپ کو کھویا  
تھا وہ ماں کو نہ کھونا چاہتا تھا۔

”نوشہ تم میرے ساتھ ہی چلو۔“ نصیم نے  
روتی ہوئی بہن کو اپنی محبت بھری آغوش میں سمولیا  
تھا، نصیم کا اپنا دل بھی بھر بھر کر رہا تھا۔

”میں امی کے ساتھ رہوں گی، وہ اکیلی ہو  
جائیں گی۔“ نوشہ نے قطعیت سے انکار کر دیا۔

”امی آپ چند روز رہ کر آجائے گا، اب  
انکار نہ کیجئے گا۔“ نصیم نے دھونس بھری محبت سے  
ماں کا ہاتھ پکڑ کر کھڑا کر دیا، وہ انکار نہ کر سکیں۔

”اب تو چلو گی نا جنگلی بی۔“ نصیم نے پیار  
سے بہن کی ناک دبا لی، وہ مسکرا دی، صالحہ کا دل  
اولاد کی کامیابیوں پر شاداں اور دعا کو تھا۔

☆☆☆

فاخرہ بالائی منزل پر شفٹ ہو گئی تھی، منزہ کو  
نیچے کا مکمل پورشن مل گیا، نوشہ بھی کھانے نیچے کا  
چکر لگا رہی تھی، اس کا دل ننھے فیضان کے بغیر نہ  
لگتا تھا، وہ فیضان سے بے حد اچھی تھی، وہ بھی  
اپنی توہلی زبان میں پھپھو، پھپھو کہتا نہ تھا،  
صالحہ بھی ہر وقت پوتے کو یاد کرتی رہتی تھیں،  
فاخرہ کی شادی کو ساڑھے پانچ سال ہو چکے تھے،  
وہ ابھی تک اولاد جیسی نعمت سے محروم تھی، وہ  
فیضان کے جانے سے اولاد کی کمی مزید شدت

سے محسوس کرنے لگی تھی وہ صالحہ اور نوشہ کی  
زبان سے ہر وقت فیضان کا نام سن کر بھی احساس  
کسری میں گھر نہ لگتی تھی۔

دل عجب بو بھل اور اداس رہنے لگا تھا کہ  
قدرت کو اس پر رحم آگیا اس کی طبیعت گری گری  
تھی صالحہ اسے ڈاکٹر کے پاس لے گئیں تو ڈاکٹر  
نے چند نمٹ کے بعد انہیں جو خوشخبری سنائی اس  
نے صالحہ اور فاخرہ کی آنکھیں نم کر دیں، فاخرہ  
کے آنسو غننے کا نام نہ لیتے تھے اس نے گھر آتے  
ہی شکرانے کے نوافل ادا کیے تھے، حسن اتفاق کہ  
انہی دنوں منزہ بھی پریکٹس ہو گئی تھی صالحہ اور  
نوشہ کے مارے خوشی کے پاؤں زمین پر نہ لگتے  
تھے، انہی خوشیوں بھرے گزرتے دنوں میں  
نوشہ کا ایف ایس سی کا رزلٹ بھی آگیا وہ  
شاندار مارکس سے پاس ہوئی تھی اسے با آسانی  
شہر کے معروف میڈیکل کالج میں داخلہ مل گیا،  
رمزہ دیورائیوں کو مبارکباد دینے بطور خاص آئی  
تھی اور دونوں کو کوئی مفید مشورہ بھی دیتے تھے۔

تینوں بھائیوں نے بہن کے ایڈمیشن کی  
خوشی میں شہر کے فائو سنار ہوٹل میں چھوٹی سی کس  
گیدرنگ کی تھی جس میں قریبی لوگ مدعو تھے،  
منزہ اولاد جیسی خوشی یا کر بھی نوشہ کے لئے دل  
میں وسعت نہ پیدا کر سکی تھی اسے ہوٹل کا آئیڈیا  
پسند نہ آیا تھا ہوٹل میں زیادہ خرچے کا اندیشہ تھا،  
وہ گھر میں پارٹی کرنے کے حق میں تھی، دسم بہن  
کی پارٹی ہوٹل میں کرنے کے لئے سب سے  
زیادہ پر جوش تھا منزہ لاکھ چاہ کر بھی حرف  
اعتراض زبان پر نہ لاسکتی تھی اور اسے یہ کڑوا  
گھونٹ پینا ہی پڑا تھا۔

☆☆☆

”دسم کیا ضرورت تھی آپ کو اتنی فضول  
خرچی کی۔“ وہ نوشہ کی پارٹی سے ابھی گھر لوٹی

تھی، محدود گید رنگ کے باوجود پینتیس چالیس افراد ہو گئے تھے جن میں تینوں یہودوں کے میکے آپنی کے سرسالی اور قریبی رشتے دار تھے، وسم کی پھیمو نہ تھی صرف ایک چچا تھا جبکہ نصیال میں تین خالہ اور دو داموں تھے، اس کے دونوں ماموں اور دو خالائیں امراڈ سیکل تھے جبکہ تیسری خالہ فارہ بھابھی کی امی تھیں، پارٹی پر پچیس ہزار لگ گئے تھے، تینوں بھائیوں نے برابر ہینٹ کی تھی، منزہ کو شوہر کے آٹھ ہزار بھی کافی کھل رہے تھے، وسم فریش ہو کر دانش روم سے نکلا تو منزہ نے فوراً اعتراض جڑ دیا تھا۔

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ وسم بہن کے خلاف بھی کبھی ایک حرف سننے کا بھی روادار نہ رہا تھا، ماں بننے کی خوشخبری یا کہ منزہ خوش فہمی کا شکار ہو کر کھلم کھلا اعتراض جڑ گئی تھی، اس کی خوش گمانی تھی کہ وسم اب اس کے زیادہ خرچے اٹھائے گا آخر وہ اس کے بچے کی ماں بننے والی تھی اس کا وسم پر زیادہ حق تھا وسم رشتوں میں اعتدال کا قائل تھا اس نے کرکشی سے بیوی کی خوش گمانی دور کی تھی۔

”وہ میرا مطلب تھا کہ اب دیکھیں نا آٹھ ہزار کا خرچہ ہو گیا ہے، ہماری اپنی فیملی.....“ منزہ کی خوش گمانی کسی حد تک قائم تھی جیسی تو اس نے اعتدال سے اپنا نقطہ نظر واضح کرنے کی کوشش کی تھی۔

”منزہ آگے ایک لفظ مت کہنا، ہماری فیملی بننے کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ میں اپنی فیملی کے لئے بچت کے چکر میں ماں بہن سے غافل ہو جاؤں۔“ وسم نے اس کا نقطہ نظر فوراً پک کر کے اسے سختی سے وارن کیا تھا، اس کا موڈ بری طرح بگڑا تھا، وہ ہوٹل سے کافی خوشگوار موڈ میں لوٹا تھا۔

”سوری وسم میں تو ایسے ہی ایک بات کر رہی تھی مجھے نہیں پتہ تھا کہ آپ خفا ہو جائیں گے۔“ منزہ نے منافقت سے پیشتر ابدلا، وہ وسم کا موڈ آف نہ کرنا چاہتی تھی دراصل اسے بے بی کی شاپنگ کرنے چاہنا تھا وسم نکلی میں صاف انکار کر کے اسے امی کو ساتھ لے جانے کا بھی کہہ سکتا تھا جبکہ وہ وسم کے ساتھ شاپنگ کرنے چاہتی تھی۔

”ہماری شادی کو سال ہونے والا ہے مگر تمہیں نہ جانے کب پتہ چلے گا کہ لوہینہ میرے لئے کیا ہے۔“ وسم کا غصہ کم ہوا تھا مگر ٹھنڈا نہ ہو سکا تھا، وہ نکلی سے چادر اوڑھ کر لیٹ گیا، منزہ ہار ماننے والوں میں سے نہ تھی، وہ نہ تو دل سے لوہینہ کے لئے کدورت مٹا سکتی تھی اور نہ ہی وسم کے دل سے بہن کی چاہت کم کر سکتی تھی۔

”وسم میں سوری کر رہی ہوں نا۔“ وہ میک اب صاف کر چکی تھی سولائٹ آف کرنی بید پر آ گئی، اس کے لہجے سے ٹھکر عیاں تھا۔

”او کے اب سو جاؤ، مجھے صبح آفس بھی جانا ہے۔“ وسم نے موڈ خوشگوار کر لیا۔

ڈاکٹر نے منزہ کو نمینشن لینے سے منع کیا تھا، وہ نہیں چاہتا تھا کہ منزہ کسی قسم کی نمینشن لے سو اسے اپنا موڈ بحال کرنا ہی پڑا تھا، وہ سونے کے لئے لیٹ گئی۔

☆☆☆

”منزہ تم ڈار اور سارا کے لئے کہیں کوشش کرو۔“ آپنی کا نون آیا تھا، وہ دونوں چھوٹی بہنوں کے لئے بے حد شکر تھیں بھائی بھابھی اپنی دنیا میں مگن تھے انہیں دونوں کی پرواہ نہ تھی بھابھی تو غیر تھیں لیکن بھائی تو اپنے تھے مگر وہ بھی بہنوں کے فرائض سے آنکھیں بند کیے ہوئے تھے، دونوں ماسٹرز کے بعد پرائیویٹ سکول میں جاب

کر رہی تھیں اور گھر میں بچوں کو ٹیوشن بھی پڑھا رہی تھیں، دونوں کی آمدنی کا خاصا معقول ذریعہ تھا، وہ بھابھی کو بھی گھر خرچ کے لئے ہر ماہ معقول رقم دیتی تھیں، آپنی اور منزہ کی دونوں کی عمروں میں شادیاں طے ہو چکی تھیں جبکہ ابھی ان دونوں کے رشتوں کا سلسلہ بھی شروع نہ ہوا تھا، آپنی میکے گئی تھیں تو بھائی بھابھی کی لا پرواہی پر سوائے کڑھنے کے کچھ نہ کر سکتی تھیں، انہوں نے اپنے حلقہ احباب میں بہنوں کے لئے رشتے دیکھنے شروع کر دیے تھے، انہیں کوئی معقول رشتہ نہ مل رہا تھا، اسی لئے انہوں نے منزہ کو بھی اس ہم میں شریک کر لینے کی ٹھانی تھی۔

”جی آپنی میں خود دونوں کے لئے پریشان ہتی ہوں۔“ منزہ سے میکے کے حالات پوشیدہ نہ تھے، وہ سرال میں کسی سے ذکر بھی نہ کر سکتی تھی کہ اس نے تو آتے ہی لوہینہ سے بیر ہاندھا ہوا تھا، بہن کا شیدائی وسم تو اسے فوراً طعنہ دینے سے بچتا تھا اسے بھی چھوٹی بہنوں کی بے حد فکر رہتی تھی، امی زندہ ہوتیں تو یقیناً حالات مختلف ہوتے۔

وہ بیٹیوں کی کمائی کے ذریعے ہی ان کا ناصا چھیر تیار کر چکی ہوتیں، دونوں بہنوں نے اپنا شتر کہ بینک اکاؤنٹ کھلویا ہوا تھا، جس میں ہر ماہ ہزاروں روپے جمع ہوتے تھے، منزہ کو اطمینان فاکر رشتے طے ہونے پر دونوں بھائی بھابھی کے پیسے کی محتاج نہ ہوں گی۔

”خالی پریشان رہنے سے کچھ نہیں ہو گا، تم کوشش بھی کرو منزہ، کامیابی ہمیشہ کوشش سے ملتی ہے۔“ آپنی نے رسائیت سے تدبیرانہ لہجہ اپنایا۔

”آپ پریشان نہ ہوں اللہ بہتر کرے گا۔“ نزہ نے اسے تسلی دی، اسے دونوں بہنوں کی فکر تو می مگر اسے خود ان کے لئے رشتے تلاش کرنے

کا خیال نہ آیا تھا، اگر آپنی اسے احساس نہ دلاتی تو شاید اسے بھی خیال بھی نہ آتا۔

”بھابھی چائے۔“ لوہینہ چائے لئے آ گئی، اس کے ہاتھ میں دو کپ تھے اس کا ارادہ منزہ کے ساتھ چائے پینے کا تھا۔

”آپنی اللہ حافظ پھر بات کریں گے۔“ وہ لوہینہ کے سامنے اس ٹاپک پر کوئی بات نہ کرنا چاہتی تھی، اس نے الوداعی کلمات ادا کر کے فون بند کر دیا اور گھونٹ گھونٹ چائے پینے لگی، لوہینہ اس سے باتوں میں مگن تھی، وہ غائب دماغی سے ہوں ہاں کیے جا رہی تھی اس کا دھیان آپنی کی باتوں میں انکا تھا، اب اسے کچھ کرنا تھا آپنی کی فکر بے وجہ نہ تھی خاندان میں زارا سارا کی ہم عمر کزنز ممکن شدہ ہو چکی تھیں جبکہ ان دونوں کی بھیا کو کوئی فکر ہی نہ تھی۔

☆☆☆

زارا کی سالگرہ تھی، منزہ اسے کوئی قیمتی گفٹ دینا چاہتی تھی، ان کے ہاں بھی سالگرہ کے لئے اہتمام نہ ہوا تھا وہ دونوں بہنوں کو ان کے برتھ ڈے پر گفٹ دے دیا کرتی تھی اس کی شادی کے بعد زارا کی پہلی سالگرہ تھی، منزہ نے شاپنگ کا پروگرام بنالیا وہ اس کے لئے سوٹ لینا چاہتی تھی اس روز وسم آفس سے لوٹا تو وہ مارکیٹ جانے کے لئے تیار تھی، وسم چنچ کیے بنا اس کے ساتھ ہولیا۔

”وسم لوہینہ کے لئے یہ سوٹ کیسا رہے گا؟“ منزہ کے چالاک ذہن میں پلان مکمل تھا، لوہینہ کو آفس گلابی رنگ بالکل پسند نہ تھا جبکہ زارا کا یہ فیورٹ کالر تھا اور اس کی گوری مائل گندمی رنگت پر چچا بھی خوب تھا، وہ پچھلے دو گھنٹوں سے سوٹ سلیکٹ کرنے کے لئے خوار ہو رہی تھی مگر اسے پسند نہ رہا تھا اور جو پسند آیا اس کی قیمت

آسمان سے ہاتھیں کرتی، وہ وسم کے ڈر سے سوٹ نہ خریدی، وہ لوهينه کی پارٹی ہوٹل میں کرنے پر خرچے پر اعتراض کر چکی تھی اب زارا کے لئے ہنگامہ سوٹ خرید کر وسم کی نظروں سے نہ گرنا چاہتی تھی، اسے آگئی گلابی کمر کا فیس کڑھائی کا جدید سٹائلش سوٹ پسند آگیا تھا۔

”لوھینہ کو یہ کمر پسند نہیں ہے تم کوئی اور دیکھ لو۔“ وسم نے سوٹ ریجیکٹ کر دیا، منزہ آسانی سے سوٹ سے دستبردار ہونے والی نہ تھی، اس کے ذہن میں پلان مہمل تھا۔

”آپ اس کا ڈیزائن دیکھیں، کتنا زبردست اور سٹائلش ہے، لوھینہ کی گوری رنگت پر کمر خوب سوٹ کرے گا۔“ منزہ نے ڈیپلے پر لگی ٹیبل کا دامن پھیلایا۔

”وہ تو ٹھیک ہے مگر تم کوئی اور ڈیزائن دیکھ لو لوھینہ کو یہ کمر پسند نہیں ہے۔“ وسم کمر کی وجہ سے ہنگامہ رہا تھا، لوھینہ ڈیزائن پسند آ جانے کے باوجود سوٹ کمر کی وجہ سے ریجیکٹ کر دیتی۔

”ہم دو اڑھائی گھنٹوں سے خوار ہو رہے ہیں کوئی ڈھنگ کا ڈیزائن نہیں ہے۔“ منزہ اپنی شاہجہاد مہمل کر چکی تھی اسے زارا کے لئے سوٹ پسند نہ آیا تھا اسے بمشکل یہ سوٹ پسند آیا تھا۔

”یار اس ڈیزائن میں اور کمر دیکھاؤ۔“ وسم نے اس کی بات سنی ان کی کمر کے سبز بوائے کو مخاطب کیا جو ان کی کمرار سے اکٹرا کر دوسری گاہک خواتین کی طرف متوجہ ہو چکا تھا، سبز بوائے نے اس ڈیزائن میں تین مختلف کمر کال کر کاؤنٹر پر رکھ دیئے۔

”وسم یہ ڈیزائن نیا اور سٹائلش بھی ہے اور اس کمر میں خوب فنج بھی رہا ہے۔“ وسم ہنس لگا ہوں سے سوٹس کا جائزہ لے رہا تھا کہ منزہ نے اپنی بات پر زور دیا، وسم اس کی بات سے متفق تھا

اسے بھی یہ ڈیزائن اسی کمر میں پسند آ رہا تھا۔  
”یار یہ کمر بیک کر دو۔“ وسم نے چند ٹاپے سوچنے کے بعد سبز بوائے کی طرف سوٹ بڑھایا تو منزہ کا چہرہ اندرونی خوشی سے مہل اٹھا، وسم کو توقع تھی کہ لوھینہ رند نہ کرے گی، وہ ہاروت لڑکی تھی، منزہ تصور میں زارا کو یہ سوٹ زیب تن کیے دیکھ رہی تھی، اس کے لبوں پر بار بار مکارانہ مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

☆☆☆

”یہ تمہارے لئے لوھینہ۔“ انہیں گھر لوٹتے گیارہ بج گئے تھے، سب ان کے انتظار میں بھوکے تھے منزہ نے آتے ہی فاخرہ کے ساتھ کھانا لگایا اور کھانے کے بعد فاخرہ کے ساتھ کچن سیٹ کر آئی تو پونے بارہ ہو چکے تھے، ندیم بھائی اور وسم سونے جا چکے تھے، لوھینہ شاہجہاد دیکھنے کے اشتیاق میں جاگ رہی تھی اور اس نے امی کو بھی زبردستی ساتھ بٹھا رکھا تھا، حالانکہ انہیں شدید نیند آ رہی تھی، منزہ نے ساری شاہجہاد دیکھانے کے بعد شاہجہاد پنک کمر کا خوبصورت سٹائلش ڈیزائن کا سوٹ لوھینہ کو بٹھایا جسے اس نے اشتیاق سے تمام لیا اور بچوں کی سی بے تابی سے کھولنے لگی۔

”یہ کمر بھابھی۔“ جونہی سوٹ شاہر سے پھسل کر اس کی کمر میں گر اس کا منہ ذرا سالنگ گیا، وہ کھول کر ڈیزائن دیکھنے لگی، اسے ڈیزائن بے حد پسند آیا تھا بلاشبہ ڈیزائن شاندار تھا لیکن کمر۔

وہ شاہجہاد کے دوران اکثر اپنے کمری پسند کردہ سوٹس شخص کمر کی وجہ سے چھوڑ دیتی تھی اس کے تاثرات چاہتی منزہ کا دل مطمئن تھا لوھینہ لاڈلی تھی وہ اپنی پسند پر کمر ومانز نہ کرتی تھی۔

”ٹھیک یو بھابھی۔“ وہ ہاروت، بالفاظ اور محبت کرنے والی لڑکی بھی تھی اسے رشتے بھانا

آتے تھے وہ منزہ کا اطمینان رخصت کرتی سوٹ شاہجہاد بیک میں ڈالنے لگی، منزہ کا پلان ناکام رہا تھا، اسے سو فیصد یقین تھا کہ لوھینہ سوٹ واپس کر دے گی اور وہ وسم سے لوھینہ کے خلاف کئی گلے کھوکے کر کے سوٹ زارا کو بٹھا دیتی، یوں وہ ایک تیر سے دو شکار کر لیتی، وسم بہن سے بھی بدظن ہو جاتا کہ وہ پہلی بار لوھینہ کے لئے کچھ خرید کر لائی تھی اس نے زارا کی خاطر اسی کمر پر اصرار کیا تھا حالانکہ اس ڈیزائن میں میرون کمر بھی بے حد اچھا لگ رہا تھا اور وہ یہ سوٹ زارا کو بٹھا دیتی، وہ آپ اپنے جال میں یوں پھنسی تھی کہ پر بھی نہ پھڑ پھڑا پاتی تھی، منزہ مردانہ اس بھی نہ سکی تھی۔

☆☆☆

لوھینہ کی کلاسز شارٹ ہو چکی تھیں، وہ باقاعدگی سے کالج جانے لگی تھی، اس کی پرانی سہیلیوں میں سے زیادہ تر نے لی ایس سی میں ایڈمیشن لیا تھا اور جو میڈیکل میں گئی تھیں ان کا ایڈمیشن مختلف کالجز میں ہوا تھا، سو اس کے ساتھ کوئی پرانی دوست نہ تھی، اسے نئی دوست بنانے میں خاصی دلچسپی نہ تھی، وہ اپنے کام سے کام لیتی تھی اور کلاس فیلوز سے ضرورت بات کرتی تھی۔

”ایکسکوز می۔“ لوھینہ فری پر پریڈ میں لان میں بیٹھی اسٹڈی میں تھی اس کی کلاس فیلو طاہرہ آگئی، لوھینہ نے سر اٹھایا طاہرہ چہرے پر دوستانہ مسکراہٹ لئے کھڑی تھی۔

”جی ا۔“ لوھینہ اتنی بد لحاظ بھی نہ تھی کہ کسی کی دوستی و غلوں کا جواب برتا کر انداز میں نہ دے سکی، اس نے جواباً ہی مسکراہٹ چہرے پر سجاتے ہوئے ہک بند کر دی۔

”آج میری دوست نہیں آئی، میں تنہا ہو رہی تھی مجھے آپ تنہا نظر آئیں تو میں ادھر آ

گئی۔“ طاہرہ نے بے تکلفی سے اس کے سامنے براجمان ہوتے ہوئے گویا اپنی آمد کا مقصد بتایا، اس کی بیسٹ فرینڈ بھابھی اس نے دودن کی لیو لی تھی، جواباً لوھینہ کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔

”کیا آپ کا کوئی دوست نہیں ہے۔“ طاہرہ کو یہ لڑکی پہلے روز سے بے حد بھائی تھی، وہ لوھینہ کی ریپر روڈ طبیعت کی وجہ سے اس سے فریج نہ ہو پاتی تھی، اسے آج قدرت نے موقع دیا تھا، اس نے گفتگو کا آغاز کیا۔

”نہیں۔“ لوھینہ نے مختصر جواب دیا، اس کے لہجے و انداز سے بے زاری مترشح نہ تھی، مگر وہ طاہرہ کی کہنی کو انجوائے بھی نہ کر رہی تھی۔

”کیا میں آپ کی دوست بن سکتی ہوں؟“ طاہرہ نے دوستانہ انداز میں اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

”شیر وائے ناٹ۔“ لوھینہ نے اس کا ہاتھ تھام لیا، وہ پہلی لڑکی تھی جس نے اسے دوستی کی آفر کی تھی، اس کی بیسٹ کلاس فیلوز لئے دیئے رہتی تھیں اس نے بھی کسی کو دوستی کی آفر نہ کی تھی۔

”ہم آج سے دوست ہیں، الوینہ تو برسوں آئے گی، میں آپ کو اس سے بھی ملاؤں گی۔“

طاہرہ نے دبے جوش کا اظہار کیا، وہ اپنے اکلوتے انجینئر بھائی کے لئے رشتے دیکھ رہی تھی، مگر اسے کوئی لڑکی بھابھی نہ رہی تھی، اگر الوینہ اکیچھ نہ ہوتی تو وہ بیسٹ فرینڈ کو بھابھی بنا لیتی، اسے لوھینہ بے حد پسند تھی مگر وہ اس کے متعلق کچھ نہ جانتی تھی، طاہرہ دو بہن بھائی تھے، والدین نے اکلوتی بہن کو اکلوتی بھابھی کے انتخاب کا کھلی اختیار دے رکھا تھا، وہ ویل آف ٹیبل کا حصہ تھی اسے لوھینہ بھی ویل آف ٹیبل کی گئی تھی، اس نے دو تین بار لوھینہ کو گاڑی میں کالج آتے جاتے دیکھا تھا۔

”شیور“ نوہین نے سر اثبات میں ہلا کر اسے سند دوستی دے دی تھی۔

☆☆☆

”ارے تم“ طاہرہ اور نوہین کی چند روز میں ہی بے حد بے تکلفی ہو گئی تھی، طاہرہ دو روز سے نوہین کے گھر آنے کا اصرار کر رہی تھی، وہ اپنے والدین کو بھی نوہین سے ملوانا چاہتی تھی نوہین نے اسے اپنے گھر کا ایڈریس سمجھا دیا، اسے امی نے کسی فیملی کی آمد کا بتایا تو وہ تجسس سے اپنے کمرے سے باہر نکلی، وہ طاہرہ سے لپٹ گئی اسے طاہرہ کی اتنی جلد آمد کی توقع نہ تھی۔

”بہن جی، آذر میرا اکلوتا بیٹا ہے وہ مشہور کمپنی میں بہترین پوسٹ بریلور انجینئر جاب کر رہا ہے، آپ جیسے چاہیں اپنی تسلی کر سکتی ہیں، بس ہمیں انکار نہ کیجئے گا۔“ نوہین چائے و دیگر لوازمات مہمانوں تک پہنچا کر طاہرہ کو اپنے کمرے میں لے کر چلی گئی، ندیم اور وسیم آفس میں تھے، سو طاہرہ کے والدین کو صالحہ نے ڈرائنگ روم میں بٹھایا تھا، فاخرہ بھی وہیں تھی، منزہ کو نئے مہمانوں کی آمد پر کھدبہ ہو رہی تھی وہ بھی اوپر چلی آئی اس کا اندازہ درست تھا، مہمانوں کی آمد بلاوجہ نہ تھی، اسے نوہین سے بیک وقت حسد بھی محسوس ہو رہا تھا اور اس کی قسمت پر رشک بھی آ رہا تھا وہ ابھی اٹھارہ سال کی ہوئی تھی اور اس کے لئے بہترین رشتہ آگیا تھا، جبکہ زارا اور سارا کو ماسٹرز کیے دو تین سال گزر گئے تھے اور کوئی مناسب رشتہ نہ مل پایا تھا، آبی اور وہ دونوں کے لئے رشتے تلاش کر رہی تھیں دونوں کو اپنی ایجوکیشن اور اونچے خواب رکھنے والی بہنوں کے لئے کوئی رشتہ پسند نہ آ رہا تھا، آبی کو پچھلے ہفتے زارا کے لئے ایک رشتہ پسند آ گیا تھا لڑکا ماسٹرز کے بعد کسی کمپنی میں جاب کر

رہا تھا، اس کی بے بہترین تھی مگر فیملی بڑی تھی، زارا نے سنتے ہی صاف انکار کر دیا تھا زارا جیسی اونچے خواب بننے والی لڑکی کے لئے بڑی فیملی میں ایڈجسٹ ہونا مشکل امر تھا۔

”آپ کی بات ٹھیک ہے، بہن لیکن ابھی ہماری بچی کی عمر ہی کیا ہے، ابھی اس کا پہلا سال شروع ہوا ہے۔“ صالحہ بچی کو جلد پانچنے کے حق میں نہ تھی وہ کم از کم اس کی تعلیم مکمل کروانا چاہتی تھیں۔

”ہمیں اس کی پڑھائی پر کوئی اعتراض نہیں ہے وہ طاہرہ کے ساتھ پڑھتی رہے۔“ طاہرہ کی والدہ ان کے انکار پر مایوس ہو گئیں، انہیں بھی نوہین بے حد پسند آئی تھی۔

”بہن دراصل شادی کے بعد بچوں کی توجہ پڑھائی سے ہٹ جاتی ہے۔“ صالحہ کو ان کی فیملی ویل آف اور مہذب لگی تھی، وہ خاصے دولت مند بھی تھے، انہیں انکار کرتے دکھ ہو رہا تھا، اگر یہی رشتہ دو تین سال بعد آتا تو وہ ممکن کر کے شادی تعلیم مکمل ہونے تک ٹال دیتیں، وہ اب ممکن کے حق میں بھی نہ تھیں جبکہ طاہرہ کے فیملی پتھلی پر سروس جمائے شادی کا ذکر کر رہے تھے۔

”آپ کو ہم سے بالکل کوئی شکایت نہ ہوگی بہن جی، ہم نوہین کی پڑھائی کا پورا خیال رکھیں گے۔“ طاہرہ کے والد نے بھی گفتگو میں حصہ لیا، انہیں ان کی فیملی کا رکھ رکھاؤ بے حد پسند آیا تھا، انہوں نے ملنسار و مہمان نوازی کی انتہا کر دی تھی۔

”آپ آذر کو دیکھ لیں ہمیں یقین ہے آپ انکار نہ کر سکیں گی۔“ طاہرہ کی والدہ کا بس نہ چل رہا تھا کہ ان سے ہاں کروا کر ہی انہیں، صالحہ سخت شکوک میں تھیں، فاخرہ ان کی مشکل سمجھ رہی تھی ان کی جگہ کوئی بھی بیٹی کی ماں ہوتی تو یقیناً اس

کے لئے فیصلہ اتنا ہی مشکل ہوتا۔

”آئی پلیز..... آپ۔“ فاخرہ نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا، صالحہ بار بار انکار کر کے ٹرمنڈگی محسوس کر رہی تھیں، فاخرہ نے ان کی مدد کرنا چاہی تھی۔

”بیٹا آپ ہمارا کارڈ رکھ لیں اور اس رائیڈ لے کو آپ ہماری طرف الوائیٹ ہیں۔“ بسیم بیگم فیصلہ کر چکی تھیں، وہ نوہین کو بہو بنانا چاہتی تھیں، انہوں نے فاخرہ کی بات کاٹ کر بس سے کارڈ نکال کر میز پر رکھا اور کھڑی ہو گئیں، دروازے پر گفتگو سنی منزہ کے سینے پر مانپ لوٹ رہے تھے، وہ سرعت سے پیچھے ہٹ گئی، صالحہ اور فاخرہ مہمانوں کو کھٹ تک رخصت کرنے لگیں، منزہ تیزی سے اندر گھس گئی۔

محمد کمال احمد، پستیر پارٹس مرچنٹ  
ماڈن ٹاؤن، بلاک نمبر 1، بنگلہ نمبر 402 لاہور  
رابطہ نمبر

منزہ نے کارڈ چند گھنٹوں میں حفظ کر کے میز رکھ دیا اور بے قدموں نیچے لوٹ گئی تھی۔

☆☆☆

”کیسی ہو منزہ؟“ وہ آبی کو فون کر کے میکے نے کی تاکید کر کے میکے آگئی تھی، آبی اس کے نیچے سے پہلے وہاں موجود تھیں، زارا اور سارا دل لگی ہوئی تھیں، سوئے اتفاق بھابھی میکے گئی تھیں اس نے آنے سے پہلے بھابھی کو فون پر آمد کی اطلاع دے دی تھی، وہ گھبراتے، بھابھی، محبت سے اس کی خیریت پوچھی، بھابھی بھلے لں کے فرائض سے غافل سہی لیکن وہ ان سب سے بے حد محبت کرتے تھے، وہ بیوی کی پڑھائی ل کے باوجود آبی اور اس کی میکے آمد پر ان کی ب خاطر تواضع کرتے تھے بلکہ ان کے ساتھ مادقت بھی گزارتے تھے۔

”ٹھیک ہوں بھیا، آپ کو اب ہماری کیا پروا کا شایہ زندہ ہوتیں۔“ منزہ کو بھابھی کی غیر موجودگی میں کل کر گلے شکوے کرنے کا موقع مل گیا تھا، بھابھی شرمندگی سے جھپک رہے۔

”بھیا آپ کا بزنس کیسا چل رہا ہے؟“ آبی نے منزہ کو تیلیف نظروں سے گھورتے ہوئے گفتگو کا رخ بدلا، وہ بھیا سے بہنوں کی شادیوں کے متعلق صاف بات کرنا چاہتی تھی، بھیا کا موڈ نہایت خوشگوار تھا اگر وہ غصے میں آ کر خفا ہو جاتے تو دونوں بہنوں کا آنا بے کار جاتا۔

”اللہ کا شکر ہے وقت بہترین گزر رہا ہے۔“ بھیا نے خوشدلی سے جواب دیا، آبی اور منزہ کو بیک وقت بھابھی پر غصہ آیا تو ناشرے پن کا ہر وقت مظاہرہ کرتے ہوئے خرچے کی تنگی کا رد و ناردلی رہتی تھیں اور نندوں سے ہر ماہ خاصی رقم ایشہ لیتی تھیں، بھیا نے چند ماہ پیشتر جاب کے ساتھ سائیڈ بزنس شروع کیا تھا جو خاصا پھل پھول رہا تھا۔

”آپ پھر بھابھی کو منع کریں وہ ہر ماہ زارا اور سارا سے رقم کیوں لیتی ہیں بھیا دونوں کے پاس رقم ہوگی تو انہی کی شادیوں کے وقت کام آئے گی۔“ منزہ کی زبان کو بھلی ہوئی۔

”کیا لٹی ان دونوں سے رقم لیتی ہے؟ وہ تو مجھ سے ہر ماہ دونوں کے جب خرچ کے ضمن میں کئی ہزار لے لیتی ہے۔“ بھیا حیرت کی زیادتی سے چیخ اٹھی، وہ دونوں بھابھی کی غلط بیانی پر سلگ اٹھیں، لٹی شوہر سے سارا، زارا کا نام لے کر خاصی رقم لیتی تھی، بھیا غصے و بے یقینی و شرمندگی سے دونوں سے نظریں نہ ملا پارہے تھے، انہوں نے لٹی کو گھر کے تمام معاملات کا کلی اختیار دے رکھا تھا، وہ ان سے غلط بیانی یا دھوکہ دہی کرے گی انہیں گمان تک نہ تھا۔



”میں لہجے سے بات کروں گا۔“ بھیا کا رنگ غصے سے سرخ ہوا جا رہا تھا۔

”بھیا رہنے دیں بھیا بھی اپنا بھاڑا پھونٹے رہ جائے شرمندہ ہونے کے الٹا انہی دونوں پر بگڑے گی۔“ آپنی نے ان کا غصہ ٹھنڈا کر دیا، بھیا بھی آہ بھر کر رہ گئے، وہ غلط نہ کہہ رہی تھی وہ لہجے کی نیچر سے واقف تھے، لہجے نے امی کی لہجہ کے بعد انہیں چھوٹی بہنوں کے فرائض سے بالکل غافل کر دیا تھا، وہ خاصی آمدنی ہونے کے باوجود ہر وقت منگائی کا رونا روتی رہتی تھی بھیا دل میں بہنوں کے فرائض سے غافل ہونے پر نادم تھے۔

”بھیا آپ نے دونوں کے رشتوں کے متعلق کیا سوچا ہے۔“ آپنی نے لوہا گرم دیکھ کر چوٹ لگائی، منزہ اسے لوشینہ کے لئے آئے رشتے اور صالحہ کے تذبذب کے متعلق بتا چکی تھی، وہ منزہ کے پلان میں شامل تھی، دونوں اتنے بہترین رشتے کو چھوڑنے کے حق میں نہ تھیں، ان کی آمد بھی اسی کمین میں تھی، وہ بھیا سے رشتہ ڈسکس کرنا چاہتی تھیں۔

”میں نے لہجے سے ذکر کیا تھا کہ وہ دونوں کے رشتے دیکھئے۔“ بھیا نے دھیمے لہجے میں جواب دیا ان کے لہجے سے ندامت جھلک رہی تھی، وہ لہجے پر اندھا اعتماد کرتے تھے اور لہجے انہیں دھوکہ دے رہی تھی۔

”پھر بھیا بھی نے کیا کہا۔“ منزہ نے دلچسپی سے پوچھا، لہجے کی شادی میں رتی بھر دلچسپی نہ تھی، وہ شوہر کی آمدنی کا ایک دھیلا بھی دونوں کی شادی پر خرچنے کی روادار نہ تھی، وہ دونوں کی آمدنی سے معقول رقم اکٹھی ہونے تک چپ سادھے رکھنا چاہتی تھی۔

”میں لہجے سے بات کروں گا۔“ بھیا کا رنگ غصے سے سرخ ہوا جا رہا تھا۔

”بھیا رہنے دیں بھیا بھی اپنا بھاڑا پھونٹے رہ جائے شرمندہ ہونے کے الٹا انہی دونوں پر بگڑے گی۔“ آپنی نے ان کا غصہ ٹھنڈا کر دیا، بھیا بھی آہ بھر کر رہ گئے، وہ غلط نہ کہہ رہی تھی وہ لہجے کی نیچر سے واقف تھے، لہجے نے امی کی لہجہ کے بعد انہیں چھوٹی بہنوں کے فرائض سے بالکل غافل کر دیا تھا، وہ خاصی آمدنی ہونے کے باوجود ہر وقت منگائی کا رونا روتی رہتی تھی بھیا دل میں بہنوں کے فرائض سے غافل ہونے پر نادم تھے۔

”بھیا آپ نے دونوں کے رشتوں کے متعلق کیا سوچا ہے۔“ آپنی نے لوہا گرم دیکھ کر چوٹ لگائی، منزہ اسے لوشینہ کے لئے آئے رشتے اور صالحہ کے تذبذب کے متعلق بتا چکی تھی، وہ منزہ کے پلان میں شامل تھی، دونوں اتنے بہترین رشتے کو چھوڑنے کے حق میں نہ تھیں، ان کی آمد بھی اسی کمین میں تھی، وہ بھیا سے رشتہ ڈسکس کرنا چاہتی تھیں۔

”میں نے لہجے سے ذکر کیا تھا کہ وہ دونوں کے رشتے دیکھئے۔“ بھیا نے دھیمے لہجے میں جواب دیا ان کے لہجے سے ندامت جھلک رہی تھی، وہ لہجے پر اندھا اعتماد کرتے تھے اور لہجے انہیں دھوکہ دے رہی تھی۔

”پھر بھیا بھی نے کیا کہا۔“ منزہ نے دلچسپی سے پوچھا، لہجے کی شادی میں رتی بھر دلچسپی نہ تھی، وہ شوہر کی آمدنی کا ایک دھیلا بھی دونوں کی شادی پر خرچنے کی روادار نہ تھی، وہ دونوں کی آمدنی سے معقول رقم اکٹھی ہونے تک چپ سادھے رکھنا چاہتی تھی۔

”بھیا آپ نے دونوں کے رشتوں کے متعلق کیا سوچا ہے۔“ آپنی نے لوہا گرم دیکھ کر چوٹ لگائی، منزہ اسے لوشینہ کے لئے آئے رشتے اور صالحہ کے تذبذب کے متعلق بتا چکی تھی، وہ منزہ کے پلان میں شامل تھی، دونوں اتنے بہترین رشتے کو چھوڑنے کے حق میں نہ تھیں، ان کی آمد بھی اسی کمین میں تھی، وہ بھیا سے رشتہ ڈسکس کرنا چاہتی تھیں۔

”بھیا آپ نے دونوں کے رشتوں کے متعلق کیا سوچا ہے۔“ آپنی نے لوہا گرم دیکھ کر چوٹ لگائی، منزہ اسے لوشینہ کے لئے آئے رشتے اور صالحہ کے تذبذب کے متعلق بتا چکی تھی، وہ منزہ کے پلان میں شامل تھی، دونوں اتنے بہترین رشتے کو چھوڑنے کے حق میں نہ تھیں، ان کی آمد بھی اسی کمین میں تھی، وہ بھیا سے رشتہ ڈسکس کرنا چاہتی تھیں۔

”بھیا آپ نے دونوں کے رشتوں کے متعلق کیا سوچا ہے۔“ آپنی نے لوہا گرم دیکھ کر چوٹ لگائی، منزہ اسے لوشینہ کے لئے آئے رشتے اور صالحہ کے تذبذب کے متعلق بتا چکی تھی، وہ منزہ کے پلان میں شامل تھی، دونوں اتنے بہترین رشتے کو چھوڑنے کے حق میں نہ تھیں، ان کی آمد بھی اسی کمین میں تھی، وہ بھیا سے رشتہ ڈسکس کرنا چاہتی تھیں۔

”بھیا آپ نے دونوں کے رشتوں کے متعلق کیا سوچا ہے۔“ آپنی نے لوہا گرم دیکھ کر چوٹ لگائی، منزہ اسے لوشینہ کے لئے آئے رشتے اور صالحہ کے تذبذب کے متعلق بتا چکی تھی، وہ منزہ کے پلان میں شامل تھی، دونوں اتنے بہترین رشتے کو چھوڑنے کے حق میں نہ تھیں، ان کی آمد بھی اسی کمین میں تھی، وہ بھیا سے رشتہ ڈسکس کرنا چاہتی تھیں۔

”بھیا آپ نے دونوں کے رشتوں کے متعلق کیا سوچا ہے۔“ آپنی نے لوہا گرم دیکھ کر چوٹ لگائی، منزہ اسے لوشینہ کے لئے آئے رشتے اور صالحہ کے تذبذب کے متعلق بتا چکی تھی، وہ منزہ کے پلان میں شامل تھی، دونوں اتنے بہترین رشتے کو چھوڑنے کے حق میں نہ تھیں، ان کی آمد بھی اسی کمین میں تھی، وہ بھیا سے رشتہ ڈسکس کرنا چاہتی تھیں۔

”بھیا آپ نے دونوں کے رشتوں کے متعلق کیا سوچا ہے۔“ آپنی نے لوہا گرم دیکھ کر چوٹ لگائی، منزہ اسے لوشینہ کے لئے آئے رشتے اور صالحہ کے تذبذب کے متعلق بتا چکی تھی، وہ منزہ کے پلان میں شامل تھی، دونوں اتنے بہترین رشتے کو چھوڑنے کے حق میں نہ تھیں، ان کی آمد بھی اسی کمین میں تھی، وہ بھیا سے رشتہ ڈسکس کرنا چاہتی تھیں۔

”بھیا آپ نے دونوں کے رشتوں کے متعلق کیا سوچا ہے۔“ آپنی نے لوہا گرم دیکھ کر چوٹ لگائی، منزہ اسے لوشینہ کے لئے آئے رشتے اور صالحہ کے تذبذب کے متعلق بتا چکی تھی، وہ منزہ کے پلان میں شامل تھی، دونوں اتنے بہترین رشتے کو چھوڑنے کے حق میں نہ تھیں، ان کی آمد بھی اسی کمین میں تھی، وہ بھیا سے رشتہ ڈسکس کرنا چاہتی تھیں۔

”بھیا آپ نے دونوں کے رشتوں کے متعلق کیا سوچا ہے۔“ آپنی نے لوہا گرم دیکھ کر چوٹ لگائی، منزہ اسے لوشینہ کے لئے آئے رشتے اور صالحہ کے تذبذب کے متعلق بتا چکی تھی، وہ منزہ کے پلان میں شامل تھی، دونوں اتنے بہترین رشتے کو چھوڑنے کے حق میں نہ تھیں، ان کی آمد بھی اسی کمین میں تھی، وہ بھیا سے رشتہ ڈسکس کرنا چاہتی تھیں۔

”بھیا آپ نے دونوں کے رشتوں کے متعلق کیا سوچا ہے۔“ آپنی نے لوہا گرم دیکھ کر چوٹ لگائی، منزہ اسے لوشینہ کے لئے آئے رشتے اور صالحہ کے تذبذب کے متعلق بتا چکی تھی، وہ منزہ کے پلان میں شامل تھی، دونوں اتنے بہترین رشتے کو چھوڑنے کے حق میں نہ تھیں، ان کی آمد بھی اسی کمین میں تھی، وہ بھیا سے رشتہ ڈسکس کرنا چاہتی تھیں۔

ڈراپ کرنے آتا تھا، طاہرہ نے تو الوینہ سے بھی دونوں کے رشتے کا ذکر نہ کیا تھا۔

”آذر بھی بہت اچھے ہیں وہ تمہارا بہت خیال رکھیں گے نوشینہ۔“ طاہرہ کا بس نہ چل رہا تھا کہ حالات کو اپنے موافق کر لیتی، مہربانیا کی جلد شادی کرنا چاہتی تھیں وہ پانچ سال انتظار کرنے کے موڈ میں قطعاً نہ تھیں۔

”انہیں کہو پھر میرا انتظار کر لیں۔“ نوشینہ نے سرسری مذاق کیا تھا، نوشینہ کو اپنے گھر والوں کا ہر فیصلہ دل و جان سے قبول تھا، اسے بھی شادی کی کوئی جلدی نہ تھی، ڈاکٹر بننا اس کا خواب تھا وہ ہر صورت اپنا خواب پورا کرنا چاہتی تھی وہ بھی امی کی بات سے سو فیصد متفق تھی کہ شادی کے بعد لڑکی کی توجہ بٹ جاتی ہے، اسے گھر اور شوہر کو بھی بھرپور وقت دینا پڑتا ہے۔

طاہرہ برا مان کر اٹھ گئی، وہ ناراض ہو چکی تھی، نوشینہ جانتی تھی کہ اس کی خفگی چند گھنٹوں سے زیادہ کی نہ تھی سو وہ اطمینان سے کوک کے سیپ لیتی رہی۔

☆☆☆

”محمد کمال احمد، ماڈل ٹاؤن۔“ منزہ نے مطلوبہ بنگلہ کے سامنے کھڑے ہو کر نیم پلیٹ پر لکھا ایڈریس پڑھ کر مکمل تسلی کے بعد تیل پر انگلی رکھ دی وہ گھر میں آئی کے گھر جانے کا تا کر آئی تھی وہ کنزنی کو گھر کھٹنے سے پہلے کال کر کے تیار رہنے کی ہدایت کر چکی تھی دونوں کو مطلوبہ بنگلہ ڈھونڈنے کے لئے زیادہ تنگ و دو نہ کرنا پڑی تھی۔

”آپ کو کس سے ملنا ہے؟“ چوکیدار نے دو انجان لڑکیوں کو سرتا پا کڑے تیوروں سے گھورا۔

”مسز کمال گھر ہیں؟“ منزہ نے چہرے پر

نشو پھیرتے ہوئے حلق تر کیا، پنہان چوکیدار کی خونخوار کنزی نظروں نے اس کا حلق خشک کر دیا تھا، وہ ہراساں نظروں سے بنگلہ کا طائرانہ جائزہ بھی لے رہی تھی چوکیدار کوئی جواب دیئے بنا گیٹ بند کر کے اندر چلا گیا۔

”آف۔“ آپنی اور منزہ نے بیک وقت اپنا رکاساں بھال کیا، وہ دونوں گیٹ کے اوپر سے نظر آتے بنگلہ کا جائزہ لینے لگیں، بنگلہ نہایت شاندار اور یکینوں کی امارت و عمدہ ذوق کا عکاس تھا، دونوں کی نظروں میں واضح پسندیدگی جھلک رہی تھی، وسیع و عریض بنگلہ اپنی مالیت کا خود منہ بولتا اشتہار تھا، منزہ کو نوشینہ سے حسد محسوس ہوا۔

”آئیں۔“ چوکیدار چند لمحوں بعد آ کر انہیں اپنی محبت میں لے کر اندر چلا گیا اور انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھا کر پلٹ گیا۔

”السلام علیکم ا“ وہ دونوں بیش قیمت ڈیکوریشن پیمز اور کارپٹ سے سجے ڈرائنگ روم کا جائزہ لینے میں محو تھیں کہ مسز کمال آئیں۔

”وعلیکم السلام ا“ دونوں ڈرائنگ روم کا جائزہ لینے کے بعد قیمتی فرنیچر کی مالیت کا تخمینہ لگا رہی تھیں کہ آواز پر چونک کر اچھل پڑیں، دونوں کی زبانوں سے بیک وقت پکلاہٹ زدہ جوابا سلامتی نکلی۔

”ارے آپ۔“ مسز کمال کنزنی کو پہچان کر ریتاک انداز میں آگے بڑھیں، ان کی خوش قسمتی تھی یا شاید قسمت ان کی راہ ہموار کر رہی تھی مسز کمال کنزنی کی پڑوسن کی نند لگی تھیں، وہ ناصرہ کے ہاں دو چار بار مسز کمال سے مل چکی تھی۔

”آپ۔“ کنزنی خلاف توقع تبسم ہاجی کو دیکھ کر خوشگوار حیرت میں گھر گئی، شاید قدرت ان پر مہربان تھی، منزہ کو کھد بھر ہو رہی تھی، وہ تو آپنی کو اپنے توسط سے یہاں لائی تھی جبکہ ادھر تو معاملہ

ہی الٹ لگتا تھا۔

”ہاجی یہ میری بہن منزہ ہے، ہم ادھر سے گزر رہے تھے اچانک ہمیں پیاس لگی تو ہم نے آپ کی بٹل بجا دی۔“ کنزنی نے کمال صفائی سے بہانہ کھڑا بھی اسے یہی بہانہ ناصرہ سے بھی کرنا تھا، ہاجی کا مہینہ میں دو تین بار بھائی کے گھر چکر لگ جاتا تھا، وہ اس سے ان کی آمد کا ذکر کر سکتی تھیں۔

”کوئی بات نہیں یہ تمہارا اپنا گھر ہے۔“ تبسم نے محبت سے اسے ٹوکا، اس کی کنزنی سے چند بار ملاقات ہوئی تھی، وہ کنزنی سے مل کر خاصی متاثر بھی ہوئی تھیں انہیں کنزنی کی لمباں اور رکھ رکھاؤ اور محبت بھری نیچر نے بے حد متاثر کیا تھا، انہوں نے اپنا سیت بھری خفگی سے اسے گھورا، جیسے دونوں میں برسوں کی شناسائی ہو، کنزنی ہنس کر رہ گئی۔

”ہاجی آپ نے خواہ خواہ تکلف کیا۔“ ملازمہ حمودہی نے ریتاک کو لڈا رکس اور دیگر لوازمات سے کچی لڑائی لئے آگئی، انہوں نے خاصا تکلف کر ڈالا تھا۔

”تکلف کیسا کنزنی۔“ تبسم مسکرا کر پائیں۔ ہنجر پر جھٹنے لگیں پھر انہوں نے دونوں کو کو لڈا ڈرنکس پیش کیں، منزہ نے کنزنی کی واقفیت نکل آنے پر مصطفیٰ خاموشی سا دھ رکھی تھی، اس کا کام توقع سے زیادہ آسان ثابت ہوا تھا۔

”آئی آپ کے بچے کتنے ہیں؟“ کنزنی ان سے ادھر ادھر کی باتوں میں من مگن تھی، منزہ خاموشی بھر ہو رہی تھی گھر پر جو بھل خاموشی چھائی ہوئی تھی صرف انہی دونوں کی گفتگو کی آوازیں تھیں۔

”ہماری مختصر فیملی ہے ایک بیٹا اور بیٹی، بیٹا اور شوہر آفس ہیں جبکہ بیٹی اپنے کمرے میں

اسٹڈی کر رہی ہے۔“ وہ منزہ کی بوریت بھانپ چکی تھیں انہوں نے تفصیلاً جواب دیتے ہوئے اسے شریک گفتگو کیا۔

”ہاجی آپ کے گھر کتنی خاموشی ہے آپ بہو لے آئیں۔“ کنزنی نے اصل گفتگو کی راہ ہموار کی، انہوں نے بہو کا ذکر نہ کیا تھا کنزنی نے فوراً بہانے سے مشورہ دے ڈالا تھا۔

”میں آذر کے لئے ایک رشتہ دیکھ رہی تو ہوں دیکھو کب بات بنتی ہے۔“ تبسم نے خوشدلی سے ان کے مشورے کو قبول کیا وہ دونوں ان کا اشارہ سمجھ گئی تھیں۔

”آئی کیا کوئی مسئلہ ہے؟“ منزہ نے بے چینی سے پہلو بدل کر خالی گلاس ٹیبل پر رکھا اس نے صرف کو لڈا رنگ پینے پر اکتفا کیا تھا۔

”لڑکی کی عمر خاصی کم ہے، اس کے گھر والے اپنی بچی کی جلد شادی کرنے کے حق میں نہیں ہیں۔“ تبسم کے لہجے سے نری عیاں تھی، انہیں ملنے جلنے والے اکثر گھر کی تہائی دور کرنے کے لئے بہو لانے کا مشورہ دیتے رہتے تھے انہوں نے اسے بھی اپنے معاملات میں مداخلت جان کر برانہ مانا تھا۔

”پھر آپ نے کہیں اور رشتہ دیکھا ہاجی۔“ آپنی نے انہیں ٹولا وہ ان کی بہم گفتگو سے کوئی نتیجہ اخذ کرنے میں ناکام رہی تھی۔

”میں نے ان لوگوں کو اپنے ہاں فرائینڈ سے کو لو ایٹ کیا تھا مگر وہ نہیں آئے، میں نے انہیں فون پر دوبارہ الو ایٹ کیا ہے۔“ تبسم کی کنزنی سے خاصی بے تکلفی تھی وہ انہیں بے تکلفی سے ہر بات بتا رہی تھیں، آذر اور کمال کی جگہ کو چھٹی ہوئی تھی، وہ چاہتی تھیں کہ لڑکی والے آذر کو بھی دیکھ لیں انہیں یقین تھا کہ لڑکی والوں کے فیصلے میں آذر سے ملنے کے بعد تہدیل آ جاتی مگر وہ

آنے پر ہی رضا مند نہ تھے۔

”آئی آپ کہیں اور رشتہ دیکھ لیں۔“ منزہ حسد سے جل کر خاک ہوئی چارہی مٹی وہ اپنی بہن کی راہ ہموار کرتا چاہتی تھی جبکہ تبسم کی آنکھوں میں صرف نوشہہ جھج چکی تھی، وہ نوشہہ کو بہو بنانے کی آس میں کہیں اور رشتہ ڈھونڈنے یا دیکھنے تک کی روادار نہ تھیں۔

”آج کل اچھے رشتے کہاں ملتے ہیں۔“ تبسم نے مایوسی سے سر ہلایا۔

”آئی آپ ہماری چھوٹی بہن زارا دیکھ لیں وہ ماسٹرز کر چکی ہے پھر آپ کو شادی کی جلدی بھی ہے۔“ منزہ سے زیادہ دیر مبر نہ ہوسکا، اس نے ڈھٹائی سے ذکر کر دیا، کنزئی نے اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا، اسے منزہ کی جلد بازی پر ہمیشہ تاؤ آتا تھا، وہ سجاد سے بات کرنے کو مٹی کی منزہ بول پڑی تھی، اس نے آنے سے پہلے منزہ کو مٹی کی جلد بازی سے کام لینے سے روکا تھا، جلد بازی میں اکثر جتنے کام بگڑ بھی جاتے ہیں، وہ نہیں چاہتی تھی کہ جلد بازی انہیں مہنگی پڑے تبسم کے چہرے کے زاویے بدل گئے۔

”باجی دراصل اس کا مطلب ہے کہ آپ کو تو بیٹے کی شادی کی جلدی ہے اور لڑکی والے آپ کے ہاں آنے تک کے روادار نہیں ہیں تو ان کا انتظار فضول ہے آپ بیٹے کے لئے اور رشتہ دیکھ لیں۔“ کنزئی کی بات سننے والے کی کوشش کی تبسم کو منزہ پر غصہ آنے لگا تھا، انہوں نے کنزئی کی بردقت پر غصہ جھڑپ پر چہرے پر جبری مسکراہٹ طاری کی تھی، انہیں منزہ کا انداز کچھ خاص پسند نہ آیا تھا۔

”کنزئی تم کتنی بہنیں ہو؟“ تبسم نے منزہ کو سرتاپا دیکھتے ہوئے کنزئی سے استفسار کیا منزہ

کے چہرے پر ندامت کا کوئی سایہ تک نہ تھا، وہ کنزئی سے یکسر مختلف تھی، کنزئی نرم خو، ملنسار اور ہمدرد طبیعت کی صاف دل لڑکی تھی تو منزہ خود پسند، منہ پھٹ اور کینہ توڑ طبیعت کی مالک تھی، منزہ نے زارا کا ذکر کیا تھا نہ جانے وہ کنزئی کا پر تو تھی کہ منزہ کا۔

”باجی ہم چارہ نہیں اور ایک بھائی ہیں، ہم دو بہنیں اور ایک بھائی شادی شدہ ہیں اور زارا کے لئے رشتہ دیکھ رہے ہیں۔“ کنزئی ان کے سوال کا مقصد سمجھ کر کسی خوش گمانی کا شکار نہ ہوئی تھی، تبسم کن اکیلیوں سے ہار ہار خاموش بیٹھی منزہ کا جائزہ لے رہی تھیں۔

”تم دونوں نے تو کولڈ ڈرنک کے علاوہ کچھ اور تو لیا ہی نہیں۔“ تبسم کو یکا یک حق میزبانی نبھانے کا خیال آیا تو انہوں نے شای کباب اور روٹر سے بھری پلٹیں دونوں کے سامنے رکھیں، دونوں نے اخلاقی مسکراتے ہوئے روٹر اور شای کباب اٹھا لئے، تبسم کے سنجیدہ چہرے سے کچھ بھی اخذ کرنا مشکل تھا، انہوں نے کھٹکوں کا رخ بدل ڈالا تھا۔

☆☆☆

منزہ کے ہاں وقار اور فاخرہ کے ہاں توصیف نے جنم لیا تھا، صالحہ بیگم بے حد خوش تھیں، ان کا آگاہی بچوں کی گفتگوؤں سے گونج اٹھا تھا، منزہ جھلے کے بعد میسر رہنے آئی ہوئی تھی، صالحہ نے فون کر کے تبسم سے معقول الفاظ میں معذرت کر لی تھی، وہ شرمندہ تھیں کہ وہ ان کا مان نہ رکھ سکی تھیں تبسم نے مجبوراً بیٹے کے لئے لڑکیاں دیکھنا شروع کر دی تھیں، انہیں کنزئی کی بہن کا خیال آیا تو انہوں نے ناصرہ سے کنزئی کا فون نمبر لے کر اس سے رابطہ کیا تھا، کنزئی زیادہ دن گزرنے اور منزہ کے منہ پھٹ جلد باز انداز پر

مایوس ہو چکی تھی، تبسم کے فون نے اس میں زندگی کی نئی لہر دوڑا دی تھی، وہ خوشی سے منگ رہی تھی۔

”ضرور باجی آپ جب چاہیں میری طرف آجائیں، میں آپ کو اپنے ساتھ لے چلوں گی۔“ کنزئی کا مارے خوشی سے برا حال تھا اس کا رواں رواں زارا کی خوش نصیبی کے لئے دعا گو تھا۔

”میں کل ناصرہ کی طرف آؤں گی، ہم کل ہی چلتے ہیں۔“ تبسم کے خاندان میں آذر کی ہم عمر لڑکیاں نہ تھیں، کمال اکلوتی اولاد تھے، انہیں بیٹے کا رشتہ غیر خاندان میں مجبوراً کرنا پڑ رہا تھا، تبسم کو کنزئی کی بہن دیکھنے میں کوئی حرج نہ لگا تھا، انہوں نے جھٹ پر وگرام طے کرنے کے بعد فون بند کر دیا، کنزئی کو بے چینی سے اگلے دن کا انتظار تھا۔

☆☆☆

”کنزئی تم اپنے بھیا اور بھابھی کے ساتھ کبھی ہمارے ہاں آؤ۔“ تبسم اگلے روز ہی طاہرہ کو لے کر آئیں دونوں کو زارا پسند آئی تھی، وہ کنزئی کی پر تو تھی اس میں منزہ جیسی نخوت دینہ توڑی نہ تھی، دلکش زارا مدھم مسکراہٹ ہونٹوں پر بکھیرے بے حد بھائی تھی، لکھی بھابھی مہمانوں کی آمد پر چونک گئی تھیں لیکن اس نے بڑھ چڑھ کر مہمانوں کی خاطر مدارت کی تھی وقت رخصت تبسم زارا اور لکھی کی بیٹی کو ہزار ہزار روپے کے نوٹ ختمائیں تھیں، تبسم و طاہرہ کے قیمتی ملبوسات اور زیورات سے امارت جھلک رہی تھی، تبسم جاتے جاتے سند پسندیدگی دے گئی تھیں، منزہ کی خوشی دیدی تھی۔

”ضرور باجی ہم اسی دیک اینڈ پر چکر لگائیں گے۔“ کنزئی کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا تھا۔ انہیں زارا کے لئے توقع سے بڑھ کر اچھا رشتہ ملا

تھا، تبسم کافی دیر بیٹھی رہی تھیں انہوں نے تفصیلاً ان کے گھر والوں کے متعلق معلومات حاصل کی تھیں، طاہرہ بھی زارا سے خاصا کھل گئی تھی۔

اور پھر کنزئی بھائی بھابھی کے ساتھ کمال احمد کے گھر ہو آئی منزہ اپنے سسرال جا چکی تھی دونوں طرف شادی کی جگت تھی سو مہینہ بھر میں زارا پیار کر اپنے گھر چلی گئی، امارت میں صالحہ اور فاخرہ تبسم اور کمال کو دیکھ کر ٹھٹھکیں، انہیں منزہ پر شک ہوا۔

”ماں جی! منزہ نے اچھا نہیں کیا۔“ فاخرہ کو منزہ کی ذہنیت سے دکھ پہنچا تھا، صالحہ کا ملال لہجہ بھر کا تھا، وہ رشتے سے انکار کر چکی تھیں لڑکے والے اپنے بیٹے کا جہاں چاہتے رشتہ کر دیتے، فاخرہ کا ملال کم نہ ہو رہا تھا۔

”آئی آپ۔“ فاخرہ خصوصاً سلج پر چاکر تبسم سے ملی تھی، وہ اپنے رشتے داروں کے ساتھ بیٹے اور بہو کے ہمراہ تصاویر کھنچوا رہی تھیں، فاخرہ نے اتفاقی ملاقات پر حیرت کا اظہار خوشگواریت سے کیا۔

”کنزئی میری بھابھی کی پڑوس ہے زارا اس کی بہن ہے۔“ تبسم نے مسکراتے ہوئے بہو سے ملوایا تھا، فاخرہ کو کوئی ثبوت نہ مل سکا تھا، منزہ صاف جھج گئی تھی۔

☆☆☆

وقت گزرتا رہا، منزہ کے ہاں وقار کے بعد زہیرہ اور فاخرہ کے ہاں تو قیر نے جنم لیا دونوں کی زندگیاں کافی مصروف ہو چکی تھیں، نوشہہ کا میڈیکل کا تیسرا سال تھا، اس کا اکیڈمک ریکارڈ بہترین تھا، وہ دل و جان سے ڈاکٹری کی ڈگری کے حصول میں جچی تھی، صالحہ بیگم کوشگر نے گھیر لیا تھا ان کا شوگر لیول اکثر ہائی رہتا تھا، سارا کا رشتہ کہیں طے نہ ہوسکا تھا، کنزئی اور منزہ شد و مد سے

اس کے لئے رشتے دیکھ رہی تھیں لیکن کہیں بات نہ بن پاری تھی، سارا کو زارا جیسا گھر نہ چاہیے تھا، لڑکا لکھوتا اور مالدار ہوتا کہ وہ بھی زارا کی طرح اپنے گھر میں راج کر سکے۔

انہی دنوں نوشینہ کے لئے کالونی کے نیازی صاحب کے بیٹے کا رشتہ آیا، جواد پائلٹ تھا، وہ دو بھائی اور دو بہنیں تھے، جواد کے بہن بھائی کی شادیاں ہو چکی تھیں مسز نیازی جواد کے لئے رشتے دیکھ رہی تھیں، انہوں نے کالونی کے بارک میں صالحہ اور نوشینہ کو واک کرتے اکثر دیکھا تھا، وہ نوشینہ کا ہاتھ مارنے لگتی تھیں۔

”بہن ہمیں سوچنے کا موقع دیں، ہم جلد آپ کو کوئی جواب دیں گے۔“ مسز نیازی نے اپنا مدعا بیان کیا تو صالحہ انکار نہ کر سکیں، ان کی بھاری بڑھتی جارہی تھی نوشینہ کا تھڑا سیر ختم ہونے کو تھا، وہ چاہتی تھیں کہ وہ نوشینہ کی منگنی کر دیں اور شادی کے لئے سال ڈیڑھ سال کا وقت لے لیں، مسز نیازی کو بھی شادی کی جلدی نہ تھی، انہوں نے شادی کی کوئی تیاری نہ کی تھی۔

”یہ میری چھوٹی بہنوئی ہے۔“ فائزہ میکی مٹی ہوئی تھی مسز نیازی کے لئے چائے بنا کر لے آئی، مسز نیازی سے صالحہ نے مسز نیازی کا تعارف کروایا، وہ مسکراتی وہیں تک گئی، مسز نیازی جواد کے متعلق تفصیلاً بتانے لگیں، مسز نیازی جواد پسند آیا تھا، یہ شخص اتفاق تھا کہ اسے سارا کے لئے جو رشتہ چاہیے تھا وہ تمام خوبیاں جواد میں موجود تھیں اور یہ بھی اتفاق ہی تھا کہ آذری کی طرح جواد کا رشتہ بھی نوشینہ کے لئے آیا تھا۔

”ایلیسیکو زی۔“ ذہیرہ رونے لگی تھی وہ معذرت کرتی اٹھ گئی، اس کو اب جلد کچھ کرنا تھا، صالحہ نے اس بار صاف انکار نہ کیا تھا، اس کے دل میں یہ قلق اٹھ رہا تھا کہ جیسے رشتے انہیں زارا

اور سارا کے لئے درکار تھے ویسے رشتے نوشینہ کے لئے کیوں آتے تھے، ان دونوں کے لئے کیوں نہیں، وہ بھول گئی تھی کہ کچھ فیصلے تقدیر کے ہوتے ہیں اور انسان کو ہر حال میں تقدیر کے فیصلے کو ماننا پڑتا ہے انسان تقدیر سے لڑ نہیں سکتا، وہ صرف کوشش کر سکتا ہے، مسز ایک بار پھر کوشش کرنے پر آمادہ تھی آخر وہ پہلے بھی تو صاف بچ کر کامیاب ٹھہری تھی۔

☆ ☆ ☆  
”امی میں نیازی صاحب کی فیملی کو ذاتی طور پر جانتا ہوں، وہ شریف مہذب اور سلیجے ہوئے لوگ ہیں۔“ صالحہ نے تینوں بیٹوں کو جواد کے رشتے کے متعلق مشورہ کرنے کے لئے بلوایا تھا، نعیم نے اعتماد کا اظہار کر دیا، جواد کا بڑا بھائی نعیم کا کلاس فیلورہ چکا تھا، دونوں کی برسوں سے دوستی تھی گزرتے وقت میں پڑھتی مصروفیات نے دونوں کو دور کر دیا، وہ دورانِ تعلیم اکثر ان کے گھر جاتا رہتا تھا، مسز نیازی اسے بیٹوں کی طرح چاہتی تھیں، نعیم کو یہ رشتہ بے حد پسند آیا تھا۔

”امی آپ ہاں کر دیں، منگنی اور پھر شادی کی تیاریوں میں سال دو سال لگ جاتے ہیں ان لوگوں کو شادی کی جلدی بھی نہیں ہے وہ انتظار کر لیں گے۔“ ندیم بھی اس رشتے پر متفق تھا جواد پڑھا لکھا، برسرِ روزگار اور سبھی طبیعت کا مالک تھا، وہ آذر کے رشتے پر بھی راضی تھا مگر امی کے صاف انکار کے بعد اس نے امی سے اختلاف مناسب نہ سمجھا تھا، ان کی بات میں بھی وزن تھا، نوشینہ کی اسٹڈی کیسٹ ہونے میں دو سال تھے وہ آسانی سے تعلیم مکمل کر سکتی تھی۔

”امی اگر وہ شادی کے لئے بھی کہیں تو آپ انکار نہ کیجئے گا، مجھے رشتے آسانی سے نہیں ملتے ہیں۔“ یہ وہیم تھا آذر کے بعد سب کے لئے

چائے بنائی مسز تک آوازیں بچ رہی تھیں، مسز کے سینے پر سانپ لوٹنے لگے، وہیم اس کے ارادوں سے بے خبر جلد شادی کرنے پر بھی راضی تھا، صالحہ شوگر اور ہائی بلڈ پریشر تھا، ان کا بی بی اکثر شوٹ کر جاتا تھا، وہ چاہتا تھا کہ نوشینہ امی کی زندگی میں اپنے گھر بار کی ہو جائے۔

”بیٹا میری بھی یہی خواہش ہے کہ اب نوشینہ کی شادی ہو جانی چاہیے، میری زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں ہے، آج ہوں کل رہوں نہ رہوں۔“ صالحہ کے لہجے میں پابست در آئی، وہ اپنی زندگی میں نوشینہ کو اس کے گھر بار کا کرنا چاہتی تھیں ان سے مسز کا نوشینہ سے بھرپور شیدہ نہ تھا، فائزہ اپنی تھی وہ نوشینہ کو بہنوں جیسا چاہتی تھی۔

”میں مسز نیازی سے جلد رابطہ کرتی ہوں۔“ مسز چائے لے کر اندر آ گئی، انہوں نے گفتگو سمیٹ دی، مسز سب کو چائے سرد کرنے لگی، فائزہ ان سے بارہا کہہ چکی تھی کہ امی مسز نے آذر کا رشتہ چھینا ہے ہم سے، بظاہر اس کا کوئی کردار نہ تھا اور نہ ہی اس پر بلا جوت شک کیا جا سکتا تھا، مگر وہ اب محتاط ہو چکی تھیں وہ زارا کی ٹاڈی میں مسز کا بطور بہو تعارف کروانے پر تبسم کی آنکھوں میں ابھرنے والی حیرت بھانپ گئی تھیں، تبسم نے مسز کے متعلق اک حرف نہ کہا تھا اور دونوں میں صرف مسکراہٹوں کا تبادلہ ہوا تھا، تبسم کی آنکھوں کا تحیر صالحہ کے دل میں گڑ گیا نا۔

”مسز بیٹا نوشینہ کو بھی یہیں بلوا لو۔“ حسینہ اپنے کمرے میں ٹی وی دیکھ رہی تھی، وہ اُن کا چائے کا کپ اس کے کمرے میں لے آنے لگی تو صالحہ نے اسے مخاطب کیا، وہ بعداری سے سر ہلا کر چلی گئی۔

☆☆☆

”مسز تم پہلے صاف بچ گئی ہو، ضروری نہیں کہ اب بھی بچ جاؤ، وہ تمہارا گھر ہے تمہیں اس کی خیر خواہی سوچنی چاہیے۔“ وہ میکی کی ہوتی تھی سارا صحن میں بچوں کو ٹیوٹن پڑھا رہی تھی، اس کے پاس بچوں کی تعداد کافی بڑھ چکی تھی، جتنا وہ زارا کے ساتھ مل کر کمائی تھی اب وہ اتنا تنہا کمائی تھی، اس نے اپنی آمدنی کے ذم میں بھابھی کے رعب میں رہنا بھی چھوڑ دیا تھا، وہ سکول سے آ کر گھر کے کسی کام کو ہاتھ نہ لگاتی تھی بھابھی کو اکیلے سارے گھر کا کام کرنا پڑتا تھا، وہ زارا سے مختلف تھی زارا بھابھی کے رعب میں بھی تھی اور ان کا گھر کے کاموں میں تھا کاٹ کے باوجود ہاتھ بٹاتی تھی، وہ تینوں بہنیں کمرے میں تھیں بھابھی ان کے پاس سے ٹھوڑی دیر پہلے اٹھ کر گئی تھیں، مسز کو بات کرنے کا موقع مل گیا تھا، کنزنی آپی سننے ہی بھڑک اٹھی، مسز کینڈا توڑ اور کدورت رکھنے والی تھی، آپی کو اندازہ نہ تھا کہ وہ شادی کے تین سال بعد بھی نوشینہ کو دل سے معاف نہیں کر سکی ہے، نوشینہ کو اپنی نف اسٹڈی کی وجہ سے مسز کے پاس بیٹھنے تک کی فرصت نہ تھی، وہ اس کے لئے آپا دوسرا رشتہ بھی اچکنے کی فکر میں تھی، وہ پہلی بار صاف بچ کر خاصی بڑھ چکی تھی۔

”آپی آپ کو آخر بیچاری نوشینہ سے اتنا پیار کیوں ہے وہ وہیم بھائی کی بہن ہے کیا ہوا اگر وہ اس سے محبت کرتے ہیں۔“ بیٹے کو ٹھک ٹھک کر سلانے میں ناکام زارا نے بھی اسے ٹوکا، وہ آذر کے ساتھ بے حد خوش تھی مگر تبسم اسے گاہے بگاہے مسز کے منہ بٹھ ہونے کا طعنہ دے دیتی تھیں وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کی ساس کو مسز کے ارادے کی بھنگ بھی پڑے، تبسم بہت سلیج طبیعت کی مالک تھیں لیکن انہیں زارا کا مسز سے زیادہ

**گھبراہٹ** میں پسند نہ تھا، منظرہ اپنے سرال سے  
**تھیں** دھیمی مبادا وہ بہن کو بھی الٹی سیدھی پٹیاں  
 پڑھا شروع کر دے۔

”ہوں..... بہن..... محبت، وسیم نے ہمیشہ  
 اسے مجھ پر نفی دے دی ہے۔“ منظرہ کے لہجے سے  
 نفرت کے شعلے لپک رہے تھے وہ وسیم کی محبت اور  
 بچہ کو سمجھ ہی نہ پاتی تھی وہ رشتوں میں اعتدال کا  
 قائل تھا اس نے بھی منظرہ کے حقوق سے غفلت نہ  
 برتی تھی جبکہ منظرہ شوہر کو سمجھے بنا نوہینہ سے حسد  
 کرتی تھی۔

”منظرہ تم نے جو کرنا ہے تمہارا میں اس بار  
 تمہارے ساتھ شامل نہیں ہوں گی۔“ آپ نے  
 صاف انکار کر دیا، وہ زارا کے لئے ان دونوں بے  
 حد فکر مند تھیں، اسی لئے مجبوراً منظرہ کے پلان میں  
 کامیاب ہو گئی تھیں، وہ سارا کے لئے فکر مند تھی  
 سارا، زارا سے کہیں بڑھ کر حسین اور دراز قامت  
 تھی اور پھر وہ بہا اپنے اکاؤنٹ میں تیس سے  
 زائد جمع کر داتی تھی، اس کے لئے رشتوں کی کمی  
 نہ تھی پھر وہ نوہینہ کا حق کیوں مارے۔

”منظرہ آپ، آپ نوہینہ کو اب بخش دیں۔“  
 منظرہ نے آپ سے مایوس ہو کر زارا کو مدد طلب  
 نظروں سے دیکھا تو وہ بیٹے کو کندھے سے لگا کر  
 چلی گئی گویا اس نے بھی منظرہ کو ہری جھنڈی دکھا  
 دی تھی، منظرہ غصے سے دانت کچکا کر رہ گئی۔  
 صالحہ اب فوراً کوئی فیصلہ کرنا چاہتی تھیں  
 اس کے پاس وقت کم تھا اسے اب تمنا ہی کچھ کرنا  
 تھا، وہ زارا کی پشت کو غصے سے گھورتی رہ گئی۔

☆☆☆

سپر ڈھل کر شام کے سرسبز اندھیروں  
 میں چلنے لگی تھی، سورج کا کچھ سہرا بھی باقی تھا،  
 منظرہ کے تیر قدم کالونی کے پارک کی طرف اٹھ  
 رہے تھے، اسے سارا پارک کے گیٹ پر کھڑی دور

سے نظر آگئی، وہ اسے ساتھ لئے اندر آگئی، صالحہ  
 نوہینہ کے ساتھ صبح و شام پارک میں واک کے  
 لئے آتی تھیں وہ آج مصروفیت کی وجہ سے پارک  
 نہ جاسکی تھیں، منظرہ کی دوست کا گھر کالونی کے  
 آخری سرے پر تھا وہ سارا کو اپنی کالونی کے  
 پارک فوراً پہنچنے کی تاکید کر کے اگلی سے دوست  
 کے گھر جانے کا بہانہ کر کے پارک آگئی تھی۔

”آئی کیا ایئر چنسی پڑ گئی تھی آپ کو؟“ سارا  
 ٹیوشن کی آخری شفٹ کے بچوں کو چھٹی دے کر  
 بجلی تیار ہو کر اس کالونی منتے ہی بھاگتی آئی تھی  
 پارک میں خاصا رشتہ تھا منظرہ کی متلاشی نظریں کسی  
 گھرے تالی سے ڈھونڈ رہی تھیں سارا بے زار  
 ہونے لگی، رفتہ رفتہ منظرہ کی آنکھوں میں مایوسی  
 پھیلنے لگی، سارا پوچھے بنا نہ رہ سکی تھی، اس کے  
 خوبصورت و دلکش چہرے پر کوفت نمایاں تھی،  
 ڈھلتے سورج کی ہلکی شعاعیں اس کی دودھیا  
 رنگت کو سنہرا پن دے رہی تھیں، وہ لاکھوں میں  
 نمایاں تھی دفعتاً منظرہ کی آنکھوں میں چمک ابھری  
 وہ سارا کا ہاتھ پکڑ کر تیزی سے واکنگ ٹریک پر  
 لوگوں کے درمیان سے گزرنے لگی۔

”السلام علیکم آئی!“ اس کے قدم کچھ دور جا  
 کر ڈھیلے پڑ گئے اور وہ متوازن چال چلتی آگے  
 بڑھنے لگی، سارا کا ہاتھ اس کی مضبوط گرفت میں  
 تھا، وہ اس کے پیچھے ہمتی چلی جا رہی تھی، منظرہ  
 نے دانستہ اچانک نظر دائیں طرف ڈالی، مسز  
 نیازی سامنے سے آ رہی تھیں وہ بھی اسے دیکھ چکی  
 تھیں، منظرہ خوشدلی کا مظاہرہ کرتی ان سے گفتگو  
 ہوئی۔

”علیکم السلام، کیسی ہو بیٹا نوہینہ اور امی  
 کیسی ہیں؟“ مسز نیازی نے اپنے مخصوص پر  
 شفقت لہجے میں مسکراتے ہوئے جواب سلامتی  
 بھیجی، وہ کافی دیر سے واک کر رہی تھیں اور خاصی

تھک چکی تھیں، وہ ستانے کے لئے واکنگ  
 ٹریک سے اتر کر سبزے پر آ گئیں۔

”آئی اللہ کا شکر ہے، سب ٹھیک ہیں آپ  
 سنا کیں۔“ منظرہ نے دانستہ ہاتھ کھینچ کر سارا کو  
 سامنے کیا، سارا کوفت سے ہنسنے چلی گئی، وہ صبح  
 سے بھوکھی تھی، اس نے لچ بھی نہ کیا تھا، وہ جلد از  
 جلد گھر پہنچنا چاہتی تھی۔

”یہ کون ہے؟“ منظرہ کی محنت بے کار نہ گئی۔  
 تھی، مسز نیازی کی دلچسپ نظریں سارا کی بیزار  
 مگر من موہنی صورت پر ٹکی تھیں، انہیں بکھرے  
 بالوں کی لٹیں کالوں کے پیچھے اڑتی سارا خاصا  
 بھالی تھی۔

”میری چھوٹی بہن ہے سارا، ماسٹرز کے  
 بعد گھر پہ بچوں کو ٹیوشن پڑھاتی ہے۔“ منظرہ نے  
 آدھا جھپٹا ہوا سارا کا اپنے ہاتھ میں دبا

ہاتھ زور سے دبا کر جھوڑ دیا۔  
 ”السلام علیکم آئی!“ سارا کو چہرے پر جبری  
 مسکراہٹ طاری کر کے خوش اخلاقی بھانپا پڑی،  
 اس کے چہرے سے بے زاری بھی کم ہو گئی تھی  
 اسے دھیرے دھیرے منظرہ کا پلان سمجھ میں آنے  
 لگا۔

”کس سبجیکٹ میں ماسٹرز کیا ہے بیٹا۔“  
 مسز نیازی نے اس کے چہرے کو دیکھی سے دیکھا  
 جہاں دودھیا گلابیاں چلی تھیں، اس نے گلابی  
 ہونٹ گلاب کی پتھری جیسے کھل رہے تھے، وہ  
 سادگی میں بھی غضب ڈھا رہی تھی، وہ حسن و  
 جمال میں نوہینہ سے کم نہ تھا، اس کا قد نوہینہ  
 سے لمبا تھا، جواد کو لمبے قد کی لڑکیاں پسند تھیں،  
 مسز نیازی کی ہائٹ پورے خاندان میں مثالی  
 تھی، وہ اکثر ماں سے خود سے لمبی بہو لانے کی  
 فرمائش کرتا تھا، نوہینہ کی ہائٹ مسز نیازی جتنی تھی  
 جبکہ وہ دونوں سے سرنگام تھی۔

”انکس میں۔“ سارا نے اک نزاکت  
 سے ہوا کے دوش پہ اڑتی زلفوں کو سمیٹ کر  
 سامنے پھیلا لیا، اس کی ماتھے پر جھوٹی لٹیں اس کی  
 دلکشی میں اضافہ کر رہی تھیں، مسز نیازی سارا سے  
 ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگیں، وہ سارا میں حد  
 درجہ دلچسپی لے رہی تھیں منظرہ کے لئے یہ طمانیت  
 کا باعث تھا وہ اپنے ہدف میں کامیاب رہی تھی  
 مسز نیازی کی آنکھوں سے چھلکتی پسندیدگی غماز تھی  
 کہ منظرہ کا نشانہ عین ہدف پر لگ کر انہیں گھائل کر  
 چکا ہے، منظرہ نے مطمئن چہرے سے شام کی سمتی  
 سنہری کرلوں کو دیکھا، اس کا ذہن تیزی سے  
 آگے کاٹاٹا ہوتا رہا تھا۔

☆☆☆

”آپ کو ڈیڑھ سال میں مجھ سے گلہ نہیں  
 گیا کہ میں نے آپ کی بہنوں کی کمائی لوٹی ہے  
 کیا آپ کو خبر ہے کہ آپ کی بہن کیا کرتی پھر رہی  
 ہے۔“ بھیا آکس سے لوٹے تھے وہ فریش ہو کر  
 کھانے کی ٹیبل پر آ بیٹھے، سارا موجود نہ تھی انہوں  
 نے لٹنی سے سارا کا پوچھا تو وہ جیسے پھٹ پڑی  
 تھی، بھیانے لٹنی کا بھاڑا بھوڑا کر انہیں ماہانہ خرچ  
 کم دینا شروع کر دیا، انہوں نے لاکھ واویلا مچایا  
 مگر بھیانے اک نہ سنی، وہ اپنی کوتاہیوں کا ازالہ  
 کرنا چاہتا تھا، زارا رخصت ہو چکی تھی وہ سارا کی  
 بھی جلد شادی کی کوششیں کر رہے تھے اس کے  
 لئے کوئی مناسب رشتہ نہ مل رہا تھا، ابھی سارا کو گھر  
 بار پسند نہ آتا تو ابھی لڑکا، بھیا بھی کے دل سے کم  
 خرچے اور نندوں کی شکایت کرنے کا قلق نہ جاتا  
 تھا، انہوں نے منظرہ سے کافی عرصہ بول چال بند  
 کیے رکھی، وہ اس کی فطرت سے واقف تھیں، وہی  
 شوہر کو ان کے خلاف اکسا سکتی تھی، کمزری فطرت  
 نرم خوار درگزر کرنے والی تھی، بھیا بھی موقع ملنے  
 ہی کم خرچے کا گلہ ضرور کرتی تھیں۔

”کیا کیا ہے میری بہنوں نے؟“ بھیا کے ماتھے پر غصے سے بل پڑ گئے وہ بہنوں کے خلاف کوئی سخت بات برداشت نہ کرتے تھے۔

”وہ دوسروں کے حق پر ڈاکہ ڈالتی پھر رہی ہے۔“ لپٹی نے تینوں نندوں کی بند کمرے میں ہونے والی میٹنگ کی سن گمن لے رکھی تھی اسے یقین تھا کہ منزہ نے سارا کو اسی سلسلے میں بلوایا ہے۔

”واٹ؟“ بھیا حیرت و غصے کی زیادتی سے جج اٹھے، وہ بہنوں کی فطرت سے واقف ہونے کے باوجود ان کی حمایت میں بلاوجہ غصہ کر گئے، لپٹی شوہر کی دھاڑ پر سہم گئی مگر وہ آج چپ رہنے کے سوڈ میں ہرگز نہ تھی۔

”آپ کے چیخنے سے حقیقت نہیں بدل جائے گی، آپ کو میری زیادتی تو نظر آگئی مگر صدمہ افسوس کہ منزہ کی زیادتی نظر نہیں آ رہی جو وہ نوحینہ سے کر رہی ہے۔“ لپٹی شوہر کے غصے سے خائف کھانا کھانے میں مشغول ہو گئی۔

”مجھ سے مکمل کر بات کر لپٹی تم کہنا کیا چاہتی ہو۔“ وہ ناہنجی سے سر پکڑ کر بیٹھ گئے، منزہ اکثر نوحینہ کی تعریفیں کرتی تھی، وہ جب بھی منزہ کے گھر گئے وہ منزہ کو ان کے پاس سے ملنے نہ دیتی تھی ان کی خاطر مہارت کا سارا انتظام نوحینہ اور فاخرہ مل کر کرتی تھیں، وہ نوحینہ کی بہت تعریف کرتی اور ان کے سامنے نند سے بے تحاشا محبت جتاتی تھی۔

”منزہ کی نوحینہ سے ساری محبت دکھاوے کی ہے وہ اس سے سخت کدورت رکھتی ہے پہلے اس نے نوحینہ کے لئے آنے والا رشتہ زارا کے لئے اور اب سارا کے لئے اچکنے کی جگہ و دو میں ہے۔“ لپٹی نے شوہر کے چہرے کی تحریر پڑھ لی تھی، بھیا کے چہرے پر تاریک سائے لڑنے

لگے، منزہ اتنا گری ہوئی ہوگی ان کے سامان و گمان میں بھی نہ تھا، آذر کا رشتہ منزہ نے ہی انہیں بتایا تھا مگر وہ بیچ میں سے اصل بات چھپا گئی تھی اگر انہیں خبر ہوتی تو آذر اور نوحینہ کے رشتے کی بات ابھی چل رہی ہے تو وہ ہرگز بہنوں کے ساتھ مل کر زارا اور آذر کی شادی نہ کرواتے، وہ نادان لڑکی آگ سے کھیل رہی تھی اسے اپنے گھر کی بھی فکر نہ تھی، وہ دکھ سے لب کچلنے لگے، لپٹی لاکھ زارا اور سارا سے اکڑی اکڑی رہتی تھی مگر اس کی عادت تہمت بازی نہ تھی، اگر وہ اسنے دتوق سے یہ بات کہہ رہی تھی تو یقیناً اس میں کچھ تو سچائی تھی، انہیں منزہ نے بھابھی کے نندوں سے خرچہ لینے کا تو بتا دیا تھا، مگر جو کچھ وہ خود اپنی نند سے کرتی پھر رہی تھی اس نے نہ بتایا تھا، بھیا کی بھوک یکسر اڑ گئی تھی۔

☆☆☆

”کہاں تھی تم؟“ گھڑی کی سوئیاں نو بجا رہی تھیں، جب اس کی گھر واپسی ہوئی بھیا اس کے انتظار میں صحن میں پکراتے پھر رہے تھے، انہیں محسوس ہوا کہ لپٹی گئی تھی، وہ بے چین لگاؤں وال کاک پڑا لے وقت بڑھنے کے ساتھ ان کی پریشانی بھی بڑھ رہی تھی، بٹاش چہرہ لئے اندر بڑھتی سارا ٹھک کر رک گئی، اس کے لئے بھیا کا سوال دلچسپہ دلوں سننے تھے بھانے بھی اس کے کہیں بھی آنے جانے پر پوچھ چھ نہ کی تھی۔

”بھیا میں منزہ آئی کے ساتھ تھی۔“ سارا لپٹی کو اپنے جانے کا پتا کر گئی تھی اسے بھیا کی انکوائری گراں گز رہی تھی۔

”کس سلسلے میں؟“ بھیا کے لبوں سے سر سراتا سوال ہوا کے دوش یہ اس کی سماعتوں پر ہم بن کر گرا، ان کے غیر متوجع سوال نے اسے بری طرح چونکا تے ہوئے حنا دکھایا تھا۔

”بھیا آئی کے ساتھ پارک چلی گئی تھی۔“ سارا نے حنا طافظوں سے بچن کا طائرانہ جائزہ لیا، بھابھی برتن دھو رہی تھیں ان کا سارا دھیان ادھر ہی تھا۔

”کیا وہاں منزہ نیازی سے ملے گی تمہیں؟“ بھیا نے اسے سر تا پا گھورا، ان کا لہجہ خشک اور نظریں تنبیہی تھیں سارا کا شک درست تھا، لپٹی کو پوری سن گمن تھی اور اس نے بھیا کو بھی بتا دیا تھا، لپٹی تھیلے سے باہر آ چکی تھی، ان سے کچھ چپانے کا فائدہ نہ تھا بلکہ ان سے کچھ چھپا ہی نہ تھا، اس کا سر اثبات میں مل گیا۔

”تم اندر چلو میں منزہ سے خود بات کرتا ہوں۔“ بھیا نے جارحانہ انداز میں غصے سے اسے ڈنٹا، ان کے گمان میں نہ تھا کہ منزہ اس حد تک گر جائے گی، وہ انجام سے بے خبر شعلوں سے کھیل رہی تھی، سارا کے چہرے پر تشویش پھیل گئی۔

”بھیا مجھے صرف جواد سے شادی کرنا ہے۔“ منزہ سارا کو جواد کے متعلق سب کچھ بتا چکی تھی وہ اسے زہانی جواد کا نمین نقش، قد بت، رنگت اور پرسنلٹی پر آگاہ کر چکی تھی سارا اسے بنا دیکھے اس پر مرستی تھی، وہ سارا کے آئیڈیل سے بچ کر رہتا تھا اور پھر جواد کا نیلی بیگ گراؤنڈ بھی سارا کا سن چاہا تھا، وہ منزہ نیازی کی نظروں میں چھپی پسندیدی بھانپ چکی تھیں پھر وہ پیچھے کیوں اٹتی، اس کے چہرے پر پھیل چکی تشویش کی جگہ بے ٹوٹی اور خود سری نے لے لی تھی، وہ خود سری و ضد بن منزہ پر تھی بلکہ اس کی پیچھے بھی منزہ سے ملتی تھی، وہ اپنی پسند سے کسی قیمت پر دستبردار ہونے پر تیار تھی وہ اپنا فیصلہ سنا کر دھپ دھپ کرتی چلی گئی، میا سر پڑ کر بیٹھ گئے، انہیں اب جلد کچھ کرنا تھا۔

☆☆☆

”بھیا آپ۔“ بھیا اگلے روز صبح آفس جانے سے پہلے منزہ کے ہاں چلے گئے وہ سویرے سویرے بھائی کو دیکھ کر پریشان ہو گئی، بھیا بے حد سنجیدہ اور پریشان لگ رہے تھے، وہ ناشتہ ادھورا چھو کر انہیں کمرے میں لے گئی، ان کے چہرے پر کچھ ایسا خاص تھا جو منزہ کا دل ہولا رہا تھا، وہ سیم کو آفس سے دیر ہو رہی تھی وہ کچھ دیر بیٹھ کر آفس چلا گیا۔

”منزہ یہ تم کیا کرتی پھر رہی ہو۔“ بھیا وہ سیم کے سامنے خود پر ضبط کیے بیٹھے رہے تھے، وہ اس کے چاتے ہی غصے سے پھٹ پڑے تھے، ان کی سرخ آنکھیں رنج کے غماز تھیں، وہ ٹینشن سے رات بھر نہ سو سکے تھے۔

”کیا بھیا؟“ منزہ ناہنجی سے انہیں دیکھ کر رہ گئی، وہ بے خبر تھی کہ بھیا تک حقیقت پہنچ چکی ہے۔

”میرے پاس تمہارے ڈرامے دیکھنا کا وقت نہیں ہے، میں چھپیں یہ بتانے آیا ہوں کہ تم باز آ جاؤ، مجھے خبر ہوئی کہ آذر کا رشتہ نوحینہ کے لئے آیا تھا تو میں زارا کی شادی بھی اس سے نہ کرتا مگر اب میں جو تم چاہتی ہو ویسا ہرگز نہیں ہونے دوں گا۔“ بھیا نے لفظ چاتے ہوئے اسے سختی سے وارن کیا، وہ بھونچکا رہ گئی، اس کی متوحش نظریں دروازے کا طواف کرنے لگیں، مبادا کہیں کوئی بھیا کی اونچی آواز پر آنے جائے۔

”بھیا وہ۔“ بھیا غلطی سے اٹھ کر جانے لگے تو منزہ تشویش زدہ ان کے پیچھے لگی۔

”منزہ مجھے تو یقین نہ تھی کہ تم اتنا گھرجاؤ گی۔“ منزہ نے ان کے بازو پر ہاتھ رکھا جسے انہوں نے غصے سے جھٹک دیا، وہ نادم ہو گئی۔

”بھیا آپ کو تو خوش ہونا چاہیے کہ آپ کے تمام بہنوں ایک سے بڑھ کر ایک ہوں

گئے۔“ منزه کی ندامت لمحہ بھر کی تھی، پھر وہ ڈھٹائی پر اتر آئی، بھیا اپنی جگہ سن رہ گئے، وہ پستی کے نہ جانے کس مقام پر تھی۔  
 ”ہاں مجھے واقعی خوشی ہوئی اگر کسی کے حق پر ڈاکہ نہ ڈالا جاتا۔“ بھیا نکلی سے اسے گھورتے آگے بڑھ گئے، منزه کے دل سے ندامت کا نایام و نشان بھی مٹ چکا تھا، وہ خود کو جائز سمجھ رہی تھی، اسے سارا سے فوراً رابطہ کرنا تھا تا کہ تمام صورتحال سے آگاہی ہو، وہ مختار نظروں سے کمرے سے باہر جھانک کر مطمئن ہو کر پلٹ گئی۔

☆☆☆

”کیسی ہیں آپ مسز نیازی!“ صالحہ دو روز سے ان سے ملاقات کی کوشش کر رہی تھیں وہ صالحہ سے کترانے لگی تھیں انہوں نے اپنی واک کی ٹائمنگ بھی بدل لی تھی تاکہ ان سے سامنا نہ ہو، مسز نیازی جلد واک کر کے لوٹ رہی تھیں کہ پارک کے دروازے پر ان کا نہ چاہتے ہوئے بھی صالحہ سے ٹکرا ہو گیا۔

”بالکل ٹھیک، آپ سنائیں۔“ مسز نیازی نے جواباً خوش اخلاقی برتی تھی ان سے سامنا تاگریر ہو گیا تو وہ صالحہ کے ساتھ پارک میں آ گئیں، واکنگ ٹریک پر خاموش تھا، وہ دونوں گراؤنڈ میں لگے بیچ پر آ بیٹھیں۔

”مسز نیازی میں نے اپنے بچوں سے مشورہ کیا ہے، آپ جب چاہیں مگنی کے لئے آ سکتی ہیں۔“ صالحہ نے بیٹھے ہی اپنا مدعا بیان کیا، وہ مسز نیازی سے بات کر کے مگنی کی ڈیٹ فکس کرنا چاہتی تھیں، وہ نوشہینہ کی جلد شادی کا بھی فیصلہ کر چکی تھیں، مسز نیازی ان سے جلد شادی کا تقاضا کرتیں تو وہ انکار نہ کرتیں، نوشہینہ کے تھرڈ پرفم کے ایگزامز قریب تھے، وہ اپنی بقیہ اسٹڈی شادی کے بعد مکمل کر لیتی۔

”صالحہ بات یہ ہے کہ میں.....“ مسز نیازی مزید ٹال مٹول پا کترانہ رہ سکتی تھیں وہ صاف بات کرنا چاہتی تھیں، صالحہ کے چہرے کی امید اور جوش نے ان کے بقیہ الفاظ کا گلا گھونٹ دیا، وہ چاہ کر بھی بات مکمل نہ کر پائیں اور ان سے نظریں چرا کر واکنگ ٹریک پر بھاگتی نو جوان لڑکیوں کو دیکھنے لگیں۔

”آپ کچھ کہہ رہی تھیں۔“ صالحہ نے الجھ کر انہیں مخاطب کیا، ان کے چہرے کی الجھن اور گریز نے صالحہ کو تنگ کر دیا تھا۔

”میں بہو پسند کر چکی ہوں صالحہ۔“ مسز نیازی میں ان سے نظریں ملانے کی ہمت نہ تھی، صالحہ ساکت رہ گئیں، انہوں نے ہفتہ بھر قبل صالحہ سے نوشہینہ کا ہاتھ خود بہت جاؤ سے مانگا تھا صالحہ نے سوچنے کے لئے مہلت لی تھی اور ایک ہفتہ زیادہ وقت نہ تھا کہ وہ مایوس ہو کر کہیں اور رشتہ پسند کر لیتیں۔

”آپ کو بہت مبارک ہو، کہاں کیا آپ نے رشتہ؟“ صالحہ کو اپنی آواز کسی کھائی سے آئی محسوس ہوئی، ان کے چہرے پر دکھ تحریر تھا، جسے انہوں نے مسکراہٹ کے لبادے میں چھپانے کی ناکام کوشش کی تھی۔

”ابھی رشتہ پکا نہیں ہوا ہم کل ان کے ہاں باقاعدہ رشتہ مانتے جا سیں گے۔“ مسز نیازی ٹام تھیں کچھ سہمی ان کا طریقہ دستور رواج کے مطابق نہ تھا انہیں احساس تھا کہ وہ صالحہ کا جواب سنے بغیر بلاوجہ پیچھے ہٹ رہی تھیں، انہوں نے نوشہینہ کو پسند کر کے اس کا ہاتھ ان کے گھر جا کر مانگا تھا، صالحہ ان کے پاس نہ آئی تھیں، وہ روایتوں کی پاسداری کرنے والے خاندان سے تعلق رکھتی تھیں اور اب، وہ ندامت سے ان سے نظریں ملانے کے قابل نہیں رہی تھیں۔

”کوئی بات نہیں مسز نیازی، یہ فیصلہ انسان کے اختیار میں نہیں ہوتے ہیں، قدرت خود تقدیر جوڑتی ہے۔“ صالحہ نے اپنا درد چھپاتے ہوئے بڑے پن کا مظاہرہ کیا، فیصم نے نواد اور اس کی ٹیلی کی بے حد تعریفیں کی تھیں وہ بالواسطہ طور پر خود بھی نیازی ہاؤس کے کینوں سے آگاہ تھیں انہیں خوشی تھی کہ نوشہینہ بہترین گھرانے کا حصہ بننے والی ہے۔

”صالحہ، بہن میں بہت شرمندہ ہوں، مجھے آپ کی بہو منزه کی بہن سارا پسند آگئی ہے۔“ مسز نیازی نے صالحہ کے بڑے پن سے اذہد متاثر ہوتے ہوئے ندامت سے ان کے ہاتھ تھامتے ہوئے معذرت کی۔

”کیا؟ منزه کی بہن سارا۔“ مسز نیازی نے ان کے سر پر ہم پھوڑا تھا، اب تو شک نہ کرنے کا کوئی جواز ہی نہ رہا تھا، دکھ کی تیز لہر ان کے دل میں اٹھی تھی اور ان کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا تھا، وہ بمشکل خود کو سنبھالے بیٹھی تھیں، مسز نیازی کے الفاظ ہتھوڑے کی مانند ان کے دماغ پر برس رہے تھے، منزه اور سارا، سارا منزه کی بہن، انہیں بہت کچھ سمجھ میں آنے لگا تھا۔

☆☆☆

پارک میں اندھیرا گہرا ہو چکا تھا اور وہاں اکا دکا خواتین رہ گئی تھیں، مسز نیازی ان سے معذرت کر کے کب کی جا چکی تھیں، ان کی آنکھوں کے سامنے آنسوؤں کی گہری دھند چھائی ہوئی تھی، انہوں نے اپنی تینوں بہوؤں سے برابر رو بہ رو کھا تھا کبھی انہیں ان کی غلطی پر بھی نہیں ڈانٹا تھا پھر منزه نے نوشہینہ سے انتہا پر کیوں باندھ رکھا تھا، آخر وہ کیا چاہتی تھی، وہ ایسا کیوں کر رہی تھی، سوچیں ان کے دماغ سے گھرا کر ان کا خون گرما

رہی تھیں، انہیں نہ جانے کتنا وقت بیٹھے بیٹھے گزر گیا تھا، رات کا اندھیرا پھیل گیا تھا، پارک بالکل خالی تھا واکنگ ٹریک کے کنارے لگے پولز کی لائٹس بھی ایک ایک کر کے بند ہو چکی تھیں، دور آخری سرے کا پول کی لائٹ رات کا اندھیرا نکلنے میں ناکام تھی، وہ سستے چہرے سمیت اٹھ گئیں۔

”امی خیریت تو تھی نا، آپ نے آج اتنی دیر کر دی۔“ وہ پارک کے گیٹ پر پہنچیں تو انہیں ناخروہ اور نوشہینہ لگئیں، ناخروہ آج صبح ہی شاور سے لوٹی تھی، انہیں واپسی میں دیر ہوئی تو ندیم نے دونوں کو امی کے پیچھے بھیجا تھا، یہ خواتین پارک تھا جہاں مرد حضرات کا داخلہ سختی سے ممنوع تھا، وسم دونوں کو گاڑی میں لے کر آیا تھا۔

”بیٹا میرا بی بی ہائی ہو گیا تھا، مجھے چکر آ رہے تھے تو میں اندر بیٹھی رہی۔“ صالحہ نے اپنے مخصوص شرفقت لیےج میں انہیں مطمئن کیا، وہ بے حد کنزور اور تھکی تھکی لگ رہی تھیں، وہ دونوں صالحہ کو پکڑے گاڑی تک لائیں۔

”امی آپ ٹھیک تو ہیں نا؟“ ڈرائیونگ سیٹ پر منتظر بیٹا وسم پریشان ہو کر گاڑی سے باہر نکل آیا، امی کے چہرے پر تکلیف کے آثار تھے، وہ سخت اذیت میں تھیں وہ رسائیت سے سر اٹھاتے میں ہلائی فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گئیں، وسم نے بھابھی اور نوشہینہ کے بیٹھنے کے بعد ڈرائیونگ سیٹ سنبھالتے ہی گاڑی سٹارٹ کر دی۔

”وسم بیٹا میں اب بہتر ہوں۔“ وسم انہیں ڈاکٹر کے ہاں لے جانے چاہتا تھا، صالحہ نے گاڑی گھر سے انجان راہ پر دیکھی تو اسے نرمی سے ٹوک دیا، وسم بے حد پریشان ہو گیا تھا، انہوں نے محبت سے بیٹے کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

”امی آپ ڈاکٹر سے چیک اپ کروا لیں۔“ وسم ان کی بات ماننے کے موڈ میں نہ تھا



اسے ماں کی بگڑی حالت نے ہراساں کر دیا تھا، اگر انہیں آنے میں مزید دیر ہو جاتی تو نہ جانے امی کا کیا حال ہوتا۔

”بیٹا میرا بی بی ہائی ہو گیا ہوگا، میں گھر جا کر دوائی لے کر سو جاؤں گی تو صبح تک بھلی چنل ہو جاؤں گی۔“ صالحہ کے پراسرار لہجے نے وسیم کو گاڑی موڑنے پر مجبور کر دیا تھا۔

☆☆☆

”وسیم آپ مجھے بھیا کی طرف چھوڑ دیں۔“ صالحہ گھر آ کر دوائی کھاتے ہی سو گئیں تھیں ان کی طبیعت صبح کافی بہتر لگ رہی تھی، وہ فریٹش سی کچن میں سب کے لئے ناشتہ تیار کر رہی تھیں ناخروہ ان کا ہاتھ بٹا رہی تھی، نوشہین کی کالج دین آ چکی تھی وہ ناشتہ کرتے ہی کالج چلی گئی، ندیم اور وسیم ناشتہ کر رہے تھے، منزہ امی سے بھیا کے گھر جانے کی اجازت لے چکی تھی صالحہ نے اس پر کوئی روک ٹوک نہ کی تھی، وہ جانتی تھیں کہ تقدیر کے فیصلے خواہ ناپسندیدہ ہی کیوں نہ ہوں انسان کو ماننا ہی پڑتے ہیں، انسان تقدیر کے سامنے بے بس ہے، منزہ تیار ہو کر آفس کے لئے نکلتے وسیم کو روک لیا وہ غلت میں اسے سر سے آنے کا اشارہ کر کے باہر نکل گیا، وہ بچوں کا ہاتھ پکڑے اس کے پیچھے نکلی۔

وہ دیکھتی تھی تو زارا اور کنزنی آ چکی تھیں، سارا نے سکول اور بھیا نے آفس سے چھٹی کر لی تھی، یقیناً معاملہ گھبر تھا، منزہ شکر تھی کہ وسیم کے ذہن سے کل سویرے سویرے بھیا کی آمد کے متعلق سوچ ہو چکا تھا ورنہ وہ ضرور ہال کی کھال اتارتا اور اس کے پاس بتانے کے لئے کچھ بھی نہ تھا، وہ شوہر کی نظروں میں مشکوک نہ ہونا چاہتی تھی۔

”السلام علیکم!“ ماحول پر گھمبیر سنجیدگی

چھائی ہوئی تھی، اسے رات سارا نے فون کر کے صبح بلوایا تھا وہ بھیا کی آمد اور بھیا سارا کے فون سے پریشان تھی کہ گھر میں امی کے پارک میں دیر ہو جانے کا غلغلہ مچ گیا، اس نے وسیم کے جاتے ہی سارا کو فون کیا تو اس نے صبح آنے پر بتانے کا کہہ کر فون رکھ دیا، وہ رات بھر صبح سے سو بھی نہ سکی تھی۔

”وعلیکم السلام!“ اس کی بھی سلامتی کا دم ہم جواب آیا تھا، زارا اور بھیا بھی اس سے خاصے تباک سے ملی تھیں جبکہ آبی اور بھیا کے انداز میں واضح رکھائی تھی، بھیا نے اٹھ کر اس کے سر پر شفقت بھرا ہاتھ بھی نہ پھیرا تھا اس کے دل کو دھکا لگا، وقار اور زنیہ آتے ہی بچوں کے ساتھ کھیلنے لگے انہیں ماں کی تشویش سے کوئی لین دین نہ تھا، بچپن ایسا ہی معصوم اور بے فکر تو ہوتا ہے بھیا بھی اس سے مل کر کچن میں جا تھیں۔

”بھیا پوچھیں اس سے، میں نے اسے منع بھی کیا تھا۔“ اس کی آمد سے پہلے کوئی موضوع گرم زیر بحث تھا، جس کا سلسلہ دینی طور پر موقوف ہو گیا تھا، کنزنی نے اس کے بیٹھنے ہی اسے غصے سے گھورتے ہوئے اپنی صفائی دی تھی، منزہ سارا معاملہ سمجھ گئی۔

”تم زارا کی بات تو اس کے ساتھ شامل تھیں نا۔“ بھیا نے اس کی دلیل رد کر دی، وہ آبی کو بھی منزہ جتنا قصور وار سمجھ رہے تھے۔

”بھیا آڈر کا معاملہ بالکل الگ تھا جواد سے، صالحہ اتنی تب صاف انکار کر چکی تھیں، لیکن اب انہوں نے سونے کے لئے مہلت مانگی ہوئی تھی بلکہ انہوں نے تو اپنے تینوں بیٹوں سے مشورہ بھی کر لیا تھا۔“ کنزنی سننے پر اب اپنی مزید صفائی پیش کی، منزہ اس سے کبھی گھر کی کوئی بات نہ چھپاتی تھی اب اسے اپنی یہی عادت مہنگی

پڑ رہی تھی وہ چاہے کبھی اپنی صفائی میں کوئی جھوٹ نہ گھر سکتی تھی، اس نے خشکیں نظروں سے آبی کو گھورا۔

گھر کا بھیدی ہی لٹکا ڈھانے پر تلا بیٹھا تھا، کنزنی نے اس کی گھوری کی رتی بھر پرواہ نہ کی سے بھی منزہ پر غصہ تھا وہ اس کے منع کرنے کے وجود باز نہ آئی تھی۔

”منزہ تم مسز نیازی سے کہہ دو کہ وہ مارے گھر نہ آئیں۔“ بھیا نے خشک لہجے میں اپنا ونوک فیصلہ سنا دیا تھا، مسز نیازی نے اس سے صاف الفاظ میں تو کچھ بھی نہ کہا تھا یہ صرف ان دنوں کا اندازہ تھا اور پھر بھلا وہ کیوں انہیں منع کرتی جبکہ وہ بھی سب تو چاہتی تھی اس کے اندر سد کی آگ ابھی تو ٹھنڈی پڑی تھی، اب نوشہین کے لئے جو بھی رشتہ آتا اسے کوئی فرق نہ پڑتا، وہ سب پر دو کا میاب دار کر چکی تھی اسے اب نوشہین سے تعلقات بہترین رکھنا تھے تاکہ کوئی اس پر ہک یہی نہ کر سکے۔

”بھیا آپ میرا فیصلہ بھی سن لیں، آپ کو ہر ورت مسز نیازی کی آؤ بھگت کر کے انہیں ہاں لڑنا ہوگی، ورنہ میں اپنی جان دے دوں گی۔“ زہ کے کچھ بولنے سے پہلے غصے سے لال بھوکا چہرہ لئے سارا دندنائی ہوئی ان کے سر پر آئی، اسے مسز نیازی کی آمد کا سولیدر یقین تھا اس کا یقین غلط بھی نہ تھا، وہ اتنی حسین و جمیل کی کہ اسے کوئی بھی نہ ٹھکرا سکتا تھا، اس کے لئے نے والے تمام رشتے اسے پسند کر کے گئے تھے، وہی تھی جو ہر رشتے میں کوئی نہ کوئی خالی ل کر انکار کر دیتی تھی، کوئی اس کے معیار سے ابی نہ کرتا تھا، اب اتنے جتنوں سے رشتہ ملا تھا وہ کیسے پیچھے ہٹ جاتی۔

وہ بھیا کی سب سے لاڈلی اور چہیتی بہن

تھی، بھیا اس کے انکار پر رشتے والوں سے معذرت کر لیتے تھے، ان کی خواہش تھی کہ سارا کی شادی جواد کے علاوہ کسی سے بھی ہو جائے، سارا خود سری سے ان کے سامنے ڈٹ گئی تھی، سامعین کو ساپ سونگہ گیا، کسی کو بھی اس سے اتنی ڈھٹائی بھری خود سری کی امید نہ تھی، بھیا حیران رہ گئے۔

”سارا مجھے تمہاری خوشنودی سے بیر نہیں ہے بیٹا، میں صرف اک معصوم کی آہ سے ڈرتا ہوں۔“ بھیا نے بے بسی سے اپنے بال مٹی میں جکڑ لئے، ان کے لہجے کی بے بسی نے کنزنی اور زارا کی آنکھیں نم کر دیں، منزہ بے نیاز بیٹھی رہی جبکہ سارا کے چہرے پر غوت پھیلی تھی۔

”کیسی آہ بھیا، ہر انسان کو اپنی خوشیاں حاصل کرنے کا حق ہے۔“ سارا خود غرضی کی انتہا پر تھی، اسے جواد پسند آ گیا تھا، وہ بنا دیکھے بنا طے اسے چاہنے لگی تھی، وہ اسے کھونے کا تصور بھی نہ کر سکتی تھی، وہ اسے پانے کے لئے ہر حد پار کرنے کو تیار تھی بھیا اسے دکھ سے دیکھ کر رہ گئے، وہ سمجھنے سمجھانے کی حد سے نکل چکی تھی۔

(باقی اگلے ماہ)

### ہماری مطبوعات

ماہنامہ  
یا خدا  
طیف نور  
حیات نازل  
حیات اقبال  
انتخاب حکم میر  
مروری صبا لعل  
قلم اوردو

لاہور اکیڈمی - لاہور

میں سب سے

ریحانہ آفتاب



”عزہ نوین! بیٹا دعا کرو عزت رہ جائے۔“ ہا کر سے ڈائجسٹ لے کر وہ دروازے پہنچا۔ وہ درود شریف پڑھ کر دھڑکتے دل سے فہرست چیک کر رہی تھی، اپنا افسانہ دیکھ کر اک زوردار نعرہ لگا کر خوشی سے سر پٹ اندر کود ڈی۔

پل میں ہی سب کو خبر ہوئی کہ محترمہ آنسو عزہ نوین کا پہلا پہلا افسانہ شائع ہو چکا ہے، خود اسے یقین نہیں آ رہا تھا، پچھلا اک ماہ کیسا گزرا تھا کوئی اس کے دل سے پوچھتا، ہر نماز میں لجاجت سے دعا مانگتی تھی، بقول آریان اللہ سے گزر گزرا رہی تھی، اس کی مت ہی ماری گئی تھی جو اسے بتا بیٹھی تھی کہ اس نے اک افسانہ لکھا ہے اور مقامی ڈائجسٹ کو بھیج بھی چکی ہے۔

”اُف مدیرہ بے چاری یہ کتنا برا وقت آپہنچا ہے سچ بچ، میں ان کے دکھ میں غائبانہ شریک ہوں۔“

”تم نے افسانے کے ساتھ گولیاں تو بھیج دی ہیں نا؟“ وہ سنجیدگی سے دو دن پہلے ہی تو استفسار کر رہا تھا، جب اس نے لائبریری کے چکر لگوا لگوا کر اس کا حشر کر دیا تھا۔

”کون سی گولیاں؟“ وہ استعجاب سے پوچھ رہی تھی،

”نہیں تمہاری تحریر پڑھ کے مدیرہ کا پی ہائے وائے ہو گیا تو۔“ وہ دانت دکھاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

”ایسی اور اس جیسی بے شمار دل جلانے والی باتیں سن سن کر اس نے بار بار اپنے افسانے کو ذہن میں دہرایا، آیا واقعی اس نے کچھ ایسا دیا تو نہیں لکھ دیا، بھی تو لڑ پڑی اور بھی رد ہا کی ہو جاتی۔“

”گلتا ہے تمہاری تحریر پڑھ کے سارا اسٹاف بیمار ہو گیا، چکن کھیا ڈینگی ٹائپ وائرس تو نہیں

## مکمل ناول



تھاس میں، دیکھو اس ماہ کا شمارہ ہی لیٹ ہو رہا ہے۔

ابھی کل یہ تو بظاہر ایل ای ڈی یہ نظریں جمائے پروگرام دیکھ رہی تھی مگر ذہن میں مچھڑی پک رہی تھی، شمارہ لیٹ کیوں ہو رہا ہے اور اس کی غائب دماغی محسوس کر کے وہ چیخنے سے بعض نہ آیا تھا۔

”دفع ہو جاؤ یہاں سے، اگر مزید تم نے کچھ کہا تو یہ ایل ای ڈی اٹھا کر دے ماروں گی۔“ کشن اس پہ پھینک کر ڈیٹ کر بولی، مگر اگلے ہی لمحے دھپ سے صوفے پہ گر کے رونے لگی، اس کے رونے سے وہ ایک دم بولکھ گیا۔

”میری تو بہ، تمہاری بھابھی سے چلنے والی میری نسل کی تو بہ، اب کچھ نہیں بولوں گا، دیکھو کان پکڑ لئے، اٹھک بیٹھک کروں؟“ کان پکڑے وہ گویا اسنے کو تیار تھا، اسے ہنسی آگئی۔

”تمہاری اٹھک بیٹھک سے مجھے کون سا فائدہ ہونے والا ہے، مجھے آنسکریم کھلانے لے چلو۔“ آنسو پونچھ کر ڈیما نڈ کی۔

”گیارہ بج رہے ہیں رات کے، تمہارا دباغ خراب ہے۔“ فرمائش پر چڑ گیا، کیونکہ خبر تھی پیسے بھی اسی کے والٹ سے نکلیں گے، اور وہ باہر جا کر صرف آنسکریم کھا کر لوٹ آئے ایسا تو

آریان کی پوری زندگی میں نہیں ہوا تھا، آریان کو چند ماہ پہلے کا واقعہ پوری جزئیات کے ساتھ یاد تھا جب اسی طرح آنسکریم کا کہہ کر وہ ساتھ تھی

تھی اور وہاں جا کر اس نے زگر برگر، چائیز ڈش اور جانے کیا کچھ منگوا لیا تھا، دونوں نے مزے لے کر کھائے تھے اور جب بل بک دے کر ویر

مسکراتا چلا گیا تو والٹ نکال کر اس نے غزہ کی طرف رخ کیا تھا۔

”میرے پاس پورے پیسے نہیں ہیں، لاؤ تم

بھی دو۔“ آریان کی بات پہ اس کی آنکھیں حیرت سے باہر اٹنے کو گھٹیں۔

”تمہارے پاس پیسے نہیں کیا؟ پیسے تو میرے پاس بھی نہیں۔“ اس کی عجیب حالت ہو رہی تھی وہ تو اس لئے بے فکر تھی کہ عید کو گزرے چند روز ہی ہوئے تھے اسے گمان تھا اس کے پاس عیدی کے پیسے ہوں گے اور وہ کہہ رہا تھا پورے پیسے نہیں ہیں۔

”کیوں جھوٹ بول رہی ہو، ابھی جب تم نے منہ کا جغرافیہ ٹھیک کرنے کے لئے پرس میں سے چیزیں نکالیں تو کونے میں دسے ہزار ہزار کے نوٹ میں نے دیکھ لئے تھے، تب ہی تو ریلیکس ہو کر دوبارہ چائیز آرڈر کیا۔“ آریان نے اس کے جھوٹ کو پکڑنے کی کوشش کر کے اسے شرمندہ کرنا چاہا۔

”آریان! یہ تو عید مبارک والے نوٹ ہیں، یونو پچپن سے مجھے ان نوٹوں کو جمع کرنے کی عادت ہے۔“ غزہ نے پرس کے اندر ہاتھ ڈال کر نوٹ نکال کر اس کے سامنے رکھ دیے تھے، آریان نے پاگلوں کی طرح نوٹ کو آگے پیچھے کر کے دیکھا، عید مبارک اس کا منہ چڑا رہے تھے۔

”یو اسٹوپ، تمہاری عیدی کہاں مگنی؟“ اسے غصہ آنے لگا۔

”وہ تو گھر میں کتابوں کے اندر چھپا کے رکھے ہیں تاکہ تم چوری نہ کر سکو۔“ وہ منہ بسور کر اپنا کارنامہ سنارہی تھی۔

”اب کیا کریں، بڑی شرمندگی ہو جائے گی۔“ وہ پریشان ہوئی تھی۔

”تم باہر نکلو میں آتا ہوں۔“ آریان نے کچھ سوچتے ہوئے اسے لنگھنے کا کہا۔

”آریان تم پھنس جاؤ گے، تم گھر جا کر

پیسے لے آؤ، ہائیک بھی ہے، میں یہاں بیٹھ کے انتظار کر لیتی ہوں انہیں تسلی ہوگی کہ ہم بھاگے نہیں۔“ وہ راہ دکھا رہی تھی، جو آریان کو کسی صورت منظور نہ ہوا۔

”میں تمہیں تا یہاں اکیلا چھوڑ کے چا سکتا ہوں، تا تمہیں اکیلا گھر بھیج سکتا ہوں، تم چپ کر کے جا کے ہائیک کے پاس کھڑی ہو جاؤ۔“

”کیس؟“ وہ پچپکا کے کھڑی ہوئی۔

”سر بل۔“ اسی لمحے ویر آ گیا تھا، آریان کے اشارہ کرنے پہ وہ چپ چاپ ہائیک کے پاس جا کر کھڑی ہوئی، تھوڑی ہی دیر میں اسے آریان آنا نظر آیا۔

”کیا ہوا بل کا؟“ وہ فکر مند تھی۔

”جلدی سے بیٹھو۔“ اس کے سوال کو نظر انداز کر کے آریان نے فوراً ہائیک کو کک لگائی اور اس کے بیٹھتے ہی ہائیک بھاگ لے گیا۔

”آریان بل کا کیا ہوا؟“

”عید مبارک کا کام آگئے۔“ آریان کا مسکراتا جواب آیا۔

”مطلب..... تم نے عید مبارک والے نوٹ چلا دیے۔“ وہ متعجب تھی۔

”ہاں اصل کے پیچھے سارے عید مبارک والے رکھ دیئے، جب تک انہیں عید“ پچھلی“ لگے گی تب تک ہم نکل گئے۔“ وہ مسکراتا تھا۔

”کتنے چیز ہوتی۔“ غزہ نے اس کے شانے پہ مکا مارا تھا۔

”اور تم اتنی میسنی ہو کہ کتابوں میں پیسے چھپا کے رکھتی ہو، آج ہی چیک کرنا ہوں تمہاری ساری کتابیں۔“ اور اس کے بعد سے آریان کو نصیحت ہوئی تھی، وہ کبھی اس کے گھر سے نہیں جانا تھا، اب بھی اسے جیب خالی ہوتی محسوس ہوئی تھی، تب ہی رات کا احساس دلانے لگا۔

”ڈیل کینسل؟ اوکے پھر مہاپا سے ڈانٹ کھانے کو تیار ہو جاؤ۔“ آنکھوں میں شرارت بھرے بلیک میل کرنے لگی، وہ گھمور کے رہ گیا۔

”جانتا ہوں، اول نمبر کی جھوٹی اور دھڑکی ہو، اک کی چار شکایتیں لگاؤ گی، اس وقت میرا خاطر کروانے کا کوئی موڈ نہیں، ہائیک کی چابی اٹھاؤ، مرد، چل رہا ہوں۔“ اس کی بے بسی پہ وہ ہنس کر ساتھ ہولی تھی۔

”اللہ کرے مدبرہ تمہارا افسانہ کہاڑیے والے کوچ دے میں دس روپے کے بچے لے کر اس میں کھاؤں گا۔“ اسے آنسکریم کا تیسرا کپ ختم کرتے دیکھ کر وہ جلیبلا کے گویا ہوا۔

”ابھی میں نے فالوڈ بھی کھانا ہے، وہ بھی اپیشل۔“ کپ ڈسٹ بن کی طرف اڑاتے اس نے آگے کا لائن چمک بتایا، وہ سر پکڑ کے رہ گیا۔

دونوں ٹونس تھے، جتنا اک دوسرے سے لڑتے تھے، اتنی ہی محبت بھی کرتے تھے، آریان پانچ منٹ بڑا تھا اور پانچ منٹ کی بڑائی کو پانچ سال سمجھ کر رعب جھاڑتا تھا، مگر وہ کب اس کے رعب کو خاطر میں لاتی تھی، دونوں اک ہی کھیل کھیلتے، اک ہی کلاس میں پڑھتے تھے۔

”مجھے اکناکس نہیں پڑھنا، اتنا سڑیل بورنگ سبیکٹ پڑھ کے فائدہ ہی کیا، جو پسند نا ہو۔“ پچھلے ایک کھٹنے سے وہ دونوں ماسٹرز میں سبیکٹ رکھتے بہ بحث کر رہے تھے۔

”اکناکس کی ویڈیو دیکھو، ڈیما نڈ دیکھو بے وقوف۔“ کافی دیر سے وہ اسے سمجھا رہا تھا۔

”بھڑا میں جائے ایسی ویڈیو، ڈگری ہاتھ میں ہو اور کچھ آتا جانا ہو، کس نے پوچھ لیا، مارشل اور رابنز کون تھے؟ تو جواب آگے گا، جی دونوں

سو تیلے بھائی ہمارے پڑوس میں تو رہتے ہیں، مگر دونوں کی فنی نہیں، دونوں کی بیویاں، اف تو بہ،

دونوں کی فنی نہیں، دونوں کی بیویاں، اف تو بہ،

دونوں کی فنی نہیں، دونوں کی بیویاں، اف تو بہ،

استغفار۔“ گالوں کو پیٹتے ہوئے وہ بڑے دوسو انداز میں کہہ رہی تھی۔

”ہم بجٹ رکھنے کی بات کر رہے تھے۔“ آریان نے یاد دلایا۔

”اردو میری پہلی اور آخری چوٹس ہے، اینڈ دیش اٹ۔“ وہ پاؤں چڑھا کر صوفے پہ بیٹھ گئی۔

”تمہارے ٹون سے لگا پہلی اور آخری محبت کہنا چاہ رہی ہو۔“ مذاق اڑایا۔

”فارم لیتے وقت جب سے تمہیں جو رہی ملی ہے نا بچی، تب سے تم پہ محبت و جت کی بات کر رہے ہو، تمہیں کیا لگا، میں نے تمہیں ہیرو بننے کی ناکام ایکٹنگ کرتے نہیں دیکھا، جب تم ناول کے ہیرو کی طرح نرم و گھمبیر آواز میں کہہ رہے تھے، جو یہ اتنی ہی لائن کے پیچھے کب تک خوار ہوگی لاڈ میں فارم لا دوں، تم آرام سے سائے میں بیٹھو۔“ وہ کم دہیں آریان کے لہجے کی نقل اتار بولی تو وہ شہنا سا گیا، بحال ہے جو اس جڑیل کی آنکھوں اور کانوں سے کچھ غلطی رہ جائے، دانت کچکا کر اسے گھور رہا تھا مگر اپنی طرف متوجہ نہ دیکھ کر مکارانہ مسکراہٹ سجائی۔

”خوبصورت لڑکیاں جتنی دھوپ میں چلیں، اچھا تو نہیں لگتا نا۔“

”اور میں، جب دو گھنٹے کے بعد فارم لے کر نکلی، تب جتنی دھوپ اور لڑکیاں کا خیال تمہیں میرے لئے نہیں آیا۔“ وہ کڑے تیوری سے گھور رہی تھی۔

”جتنی دھوپ لڑکیوں کے ساتھ میں نے خوبصورت کا بھی استعمال کیا تھا، آپ نے جس پہ توجہ نہیں دی۔“ وہ ہنس دیا تھا،

”آری.....!“ بات سمجھ آئی تب تک وہ بھاگ چکا تھا۔

”کسی دن اس کی زبان پہ آری ہی چلا دوں گی۔“ بڑبڑا کے اس نے سر جھٹکا اور پھر ناچار آریان کو بھی اردو ہی رکھنا پڑا، کیونکہ اس کے بغیر تو وہ کچھ بھی نہیں پڑھ سکتا تھا، اب دونوں کے فاسل انیر کے اسٹوڈنٹ تھے، مگر شرارتیں لڑنا جھگڑنا، بچوں کی طرح تھیں۔

☆☆☆

”یہ دیکھو جل کڑے، میرا افسانہ لگ گیا۔“ آریان دوست کی طرف سے واپس آیا تو ڈائجسٹ لئے وہ اس کے پیچھے کچن کو آئی، بوتل منہ سے لگائے وہ پانی پی رہا تھا، اس کی بات پہ ”ہوں ہوں“ کی صورت پانی نکل گیا۔

”فضول انسان، کتنی بار کہا ہے گلاس میں ڈال کے پانی پیا کرو۔“ اس کی حرکت نفیس طبع پہ گراں گزری تھی۔

”دکھاؤ ذرا۔“ اس کی بات کو انکور کر کے اس نے ڈائجسٹ جھپٹ لیا۔

”میلے ہاتھوں سے نہیں خراب ہو جائے گا۔“ وہ چلائی رہ گئی۔

”سوئے کا پانی چڑھا کر ہاتھ لگا تا ہوں ڈائجسٹ کو۔“ اس نے سر جھٹکا اور اس کے افسانے کا جائزہ لینے لگا۔

”بیچ بیچ صد افسوس، اردو ادب یہ اتنا برا وقت آ گیا کہ ایسے دیسے رائٹر بنے بیٹھے ہیں، مدیرہ کا لگتا ہے داغ چل گیا ہے۔“ تسلی کر کے اس نے اظہار افسوس کا ضروری خیال کیا۔

”خبردار، جو مدیرہ جی کے بارے میں کچھ کہا تو۔“ وہ آگ بگولہ ہو گئی۔

”اچھا جی مدیرہ کے لئے یہ محبت اس لئے اٹھ رہی ہے کہ محترمہ نے ترس کھا کر تمہاری تحریر لگا دی، اگر جو کھاڑیے کی نذر ہو جاتا تو آپ ہی فرماتیں، رشتے داروں کی تحریریں شائع کرنی

ہیں۔“ اس نے غزہ کے لہجے کی نقل اتاری۔

”کوئی نہیں۔“ اس نے منہ بگاڑا۔

”پھپھو کو دکھائی تحریر۔“ اب کے انسانوں کی طرح سوال کیا مگر آنکھوں کے اشارے پہ وہ چہرے کی سرفی نہ چھپا سکی۔

”میں گئی تھی مگر گھر کو تالا لگا ہوا تھا۔“ اس نے جھنجھٹتے ہوئے کہا۔

”ابھی پہلی ہی تحریر لکھی ہیں کہ لوگوں نے گھروں سے بھاگنا شروع کر دیا۔“ اس نے مذاق اڑایا۔

”بکومت، پھپھو سبزی لینے بازار گئی ہوئی ہیں۔“ اس نے ڈائجسٹ دے مارا۔

”ادئے ہوئے، ابھی سے اتنی طرفدار۔“ اسے شوخی پہ آمادہ دیکھ کے وہ دو دو گیارہ ہو گئی۔

☆☆☆

”پھپھو آپ کے ہاتھ کی بنی چائے پینے کے لئے دیکھیں، ام اپنے گھر کی چائے چھوڑ کر آئے ہیں۔“ آریان کا انداز ایسا تھا جیسے کتنی عظیم قربانی دے کر آیا ہو۔

”میری خوش نصیبی۔“ پھپھو نے امی کے اسٹائل سے جواب دیا، پھپھا کے انتقال کے بعد پھپھو ان کے پردوس میں آباد ہو چکی تھیں، پتا بھی بیوہ بہن کو خود سے قریب رکھنا چاہتے تھے، کچھ اس فیصلے میں ان کی دور اندیشی بھی شامل تھی،

پھپھو کے بیٹے تیور سے عزا لوین کی نسبت طے کر گئے تھے، اس لئے بھی وہ چاہتے تھے کہ بہن اور بیٹی ان نظروں کے پاس رہے، اب تقریباً روز ہی دونوں ٹیک پڑتے تھے، تیور بھی ہوتا تھا

اس لئے وہ بکیتی تھی مگر آریان سسرال کا نام لے کے جو چھپتا تو اسے آتے ہی ہنسی، اس وقت بھی وہ اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہی تھی، جو حلق تک ٹھونسنے والے مہمانوں کی طرح کسر

نفسی دکھا رہا تھا۔

”کیسے ہیں تیور بھائی؟“ تیور آنا دیکھ کر آریان نے مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا۔

”اے دن، آؤ بیٹھو۔“ فریش لہجے میں کپڑوں سے اٹھتی پرفوم کی مہک یہاں سے وہاں تک بکھیرتے ہوئے چپک کر کہا۔

”میرا خیال ہے آپ کی آدمی سیلری تو پرفوم میں اڑ جاتی ہوگی۔“ وہ کہنے سے باز نہ آیا، تیور نے مسکرانے پہ اکتفا کیا۔

”آج کی ان بلیو اسبل نیوز سی آپ لوگوں نے؟“ تجسس پیدا کرتے ہوئے کہا۔

”نہیں تو، پھر کوئی آکیل ٹیکٹر الٹ گیا کیا؟“ تیور کو تشویش ہوئی۔

”اوہیں، خبر سے دشمنوں کا افسانہ چھپ چکا ہے۔“ آریان نے ڈائجسٹ کی روٹمائی کردوائی۔

”واقعی، بہت مبارک ہو، دکھاؤ۔“ پھپھو ساتھ لگاتے ہوئے خوشی سے بھرپور لہجے میں بولی تھیں، سب ہی باخبر تھے اس نے اک عدد افسانہ لکھا ہے

”بہت مبارک ہو، پہلے بتاتی تو میں کچھ انتظام ہی کر لیتی۔“ پھپھو بے حد خوش تھیں۔

”یہ سو سے ہیں نا پھپھو، منہ بیٹھا کرانے کی بجائے ٹیکسٹ اور ٹیکسٹ کروا دیجئے۔“ آریان بھلا چپ رہ سکتا تھا۔

”پکڑوے تو کچن میں ہی رہ گئے، غمخوار، میں لاتی ہوں۔“ یاد آنے پہ پھپھو کچن کی طرف بڑھ گئیں۔

”لانے کی ضرورت نہیں ہے پھپھو، مجھے میرا حصہ کچن میں ہی الگ کر دیں، ورنہ غزہ چنوری کچھ نہیں چھوڑے گی۔“ آریان یقیناً بہت اچھا بھائی تھا، تب ہی بہانے سے پھپھو کے ساتھ کچن کو ہولیا تھا۔

غزہ کی شہر (87)

غزہ کی شہر (86)

”کیسے چھپی اسٹوری؟“ ابھی وہ آریان کی بات پہ مسکرا ہی رہی تھی جب تیسور کے اچانک سے سوال پہ اس کی طرف متوجہ ہوئی۔

”پیپر پہ لکھا اور ادارے کو بھیج دیا، انہیں اچھا لگا ہو گا اس لئے شائع ہوا۔“ اپنی سمجھ کے مطابق جواب دیا، اسے تیسور کا سوال سمجھ نہیں آیا تھا۔

”ہوں۔“ وہ ہنکارا بھر کے چائے پینے لگا، کچھ دیر پہلے کی گفتگو غائب ہو چکی تھی اس کے کان مبارک باد یا کسی ستائشی جملے کے منتظر ہی رہے اور وہ گھر آ گئی۔

”ہو سکتا ہے، آفس کی وجہ سے ڈسٹرب ہوں۔“ اس کی سرد مہری پہ وہ کافی دیر تک خود کو بہلاتی رہی، پچھو نے گفتگو اربخ کرنے کی بجائے ہزار روپے دیئے تھے۔

”ارے پچھو اتنا زیادہ، افسانے کا اعزاز یہ تو دو تین سو ہی آتا ہے اسے، پہلے ہی مہا اور پاپا سے بہت کچھ نکلا چکی ہے۔“ آریان چیختا رہ گیا۔

”خود تو توفیق نہیں ہے، دوسروں کو بھی ورغلا رہے ہو۔“ وہ کہنے سے نہیں چوکی۔

”خوبصورت لڑکیوں پہ پیسے خرچ کرنے میں مزا آتا ہے۔“ اس نے بھی ساگانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی، مگر رات کو سونے کے بعد بیڈ روم میں آئی تو تیکے پہ بڑا بڑا سا گھٹ پیک دیکھ کر اچھل گئی، اک لمحے کو خیال آیا شاید تیسور نے سر پرانز دیا ہو، مگر کارڈ میں ”مائی بیوٹی فل سسز“ دیکھ کے ہنس پڑی، وہ بڑے پیار سے گفتگو کھولنے لگی۔

”یہ! اندر موجود رندی دیکھ کے ٹھک گئی، اندر اک کارڈ پڑا تھا، رائٹنگ آریان کی تھی وہ اٹھا کر پڑھنے لگی۔

”سچ بڑی جلدی ہے گفتگی، بیڈ سے اٹھو اور الماری کھولو۔“ آرڈر پہ مسکرا کر اس نے الماری کھولی، وہاں پتک سوٹ کے ساتھ کے ہاتھ جٹ ملی۔

”اب ایسا کرو واش روم جاؤ اور شیمپو کی خالی بوتل جو تم کاہلی کے باعث ڈسٹ بن میں نہیں ڈال رہیں اسے چیک کرو۔“

”آریان کے بیٹے، ذلیل کہنے۔“ سگلتے ہوئے وہ واش روم میں گئی اور مطلوبہ بوتل چیک کرنے لگی، اس میں سے اک اور چٹ برآمد ہوئی۔

”میرا خیال ہے اب تک تمہاری گالیاں ختم ہو چکی ہوں گی، اس لئے داہیں اپنے کمرے میں جاؤ اور ڈرائنگ ٹیبل کا آخری دروازہ چیک کرلو۔“

”انفصاف، آریان آئی دل کل یو۔“ وہ سخت جھنجھلا گئی تھی، آخری دروازے سے اک اور چٹ نکلی تو اس نے بڑی مشکل سے اپنا پی پی کنٹرول کیا۔

”مزا تو تمہیں یقیناً آ رہا ہو گا، اب ایسا کرو کہ اپنی رائٹنگ ٹیبل سے،“ مستنصر صاحب کی ”راکھ اٹھاؤ“ وہ اس کی ذہانت کی جھنجھکی داد دیتی کم تھا۔

”عزیزہ لوین کام ڈاؤن۔“ وہ خود کو کنٹرول کر رہی تھی، اور اک اک صفحہ درق گردانی کے بعد جب پھر چٹ نکلی تو اس کا دل چاہا اپنا سردیوار یہ دے مارے یا بال بکھرائے چلائی ہوئی آریان کے کمرے میں دھاوا بول دے۔

”آریان، ابھی تم میرے سامنے ہوتے تو میں تمہیں بتاتی۔“ وہ عالم تصور میں اسے اپنا مذاق اڑاتے دیکھ کر کھٹک گئی، جلتے بھٹتے وہ تحریر پڑھنے لگی۔

”تم جیسی لالچی لڑکی نہیں دیکھی، حد ہے ڈھٹائی کی، مجھے پتا ہے تم کتنی غریب ہو، اس لئے

اپنے بیڈ کے نیچے جاؤ۔“  
”ذلیل، کہنے، شیطان کے کچھ لگتے۔“  
اچھی طرح سے اکڑوں بیٹھ کے بیڈ کے نیچے جھانکنے لگی، اسے اک اور چٹ مل گئی، وہ وہیں کارپٹ پہ پڑھ گئی۔

”تس آ رہا ہے تم پہ، اچھا ایسا کرو، اپنا تکیہ اٹھاؤ۔“ اس نے فوراً ہدایت پہ عمل کیا تھا، تکیے کے نیچے چھوٹا سا کئی ماؤس دیکھ کر وہ ماؤف ہوتے ذہن سے بیڈ پہ گر گئی، جہاں سے چلی تھی وہیں پہ سفر ختم ہوا تھا، اپنی محنت کے بعد یہ تھک اس نے گھور کے کئی ماؤس کو دیکھا، اسے ایک چٹ پن ہوئی نظر آئی، وہ اٹھ کر بیٹھ گئی، چٹ نکال کر پڑھنے لگی۔

”کئی ماؤس کے پیٹ میں ہاتھ ڈالو، جو آ جائے گا وہ تمہاری قسمت۔“ اور کچھ ہی لمحوں بعد نازک خوبصورت رسٹ وائچ کو دیکھ کر وہ حیران رہ گئی، پچھلے دنوں وہ اسی رسٹ وائچ کو مہنگا ہونے کے باعث خرید نہیں سکی تھی، وجہ صرف یہ تھی کہ سارے پیسے شاپنگ میں پہلے ہی خرچ ہو گئے تھے، اگلی بار لینے کا وہ کہہ تو آئی تھی مگر بک نا جائے، یہ ڈر بھی موجود تھا، غصہ جھنجھلاہٹ اڑن چھو ہو چکا تھا جس سے وہ بڑی شرارت سے پوچھ رہا تھا۔

”گھٹ ملا؟“  
”تم اول نمبر کے ذلیل ہو۔“ اسے مکا مار کے وہ ہنس پڑی تھی۔

☆☆☆

”آریان! میں نے اک غزل لکھی ہے سن لو نا پلیز۔“ یونیورسٹی میں مشاعرہ ہو رہا تھا، سب کو خبر تھی کہ وہ شاعری بھی کرتی تھی، سرزبیر نے تو مشاعرہ انیڈ کرنے کی حتی سے تلقین کی تھی، پاپا کو شاعری کی الف ب بھی سمجھ نہیں آتی تھی، مہاس

وقت گھر پہ موجود نہیں تھیں، ورنہ انہیں ہی سنا دیتی، ناچار آریان کی منتیں کرنی پڑ رہی تھیں۔  
”معاف رکھو مجھے پہلے ہی تمہارے کہنے پہ اردو رکھ کے پھس چکا ہوں۔“ اس نے صاف ہری جھنڈی دکھا دی۔

”میر درد کو پڑھ پڑھ کے مجھے خود اپنے جگر میں درد اٹھا محسوس ہونے لگا ہے۔“

”جہنم میں جاؤ تم، میں پچھو کو سنانے جا رہی ہوں۔“ اس کی دہائی پہ منہ بنا کر وہ دونوں گھروں کے بیچ کا گیت عبور کرنے لگی۔  
”پچھو کو ہی سنانا، کسی اور کو نہیں۔“ وہ جھبیر نے سے باز نہیں آیا۔

کارڈ روم میں ہی تیسور سے سامنا ہو گیا تو اس کا دل بے ساختہ دھڑک اٹھا، جب سے نسبت طے ہوئی تھی وہ اس سے جھجکتے لگی تھی۔  
”خیریت ڈائری پن لے لے کہاں کی سواری ہے۔“ وہ کہیں جانے کو نکل رہا تھا شاید، کف کے بن بند کرتا ہوا بجلت میں بولا۔

”یونیورسٹی میں مشاعرہ ہو رہا ہے، میں نے بھی حصہ لیا ہے، غزل بھی لکھ چکی ہوں مگر آریان سننے کو تیار ہی نہیں، پچھو کو شاعری سے لگاؤ ہے اسی لئے چلی آئی، تاکہ کہیں خامی ہو تو دور ہو جائے۔“ اس نے آنے کی وجہ گوش گزار کی، یہ دیکھے بنا کے ”میں نے بھی حصہ لیا ہے“ سن کے ہی منہ کا زادیہ بگڑ چکا تھا۔

”کیوں لیا تم نے حصہ؟“ تیز لہجہ پہ وہ چونک کر اسے دیکھنے لگی، جہاں غیر معمولی پن تھا۔  
”میں شاعری کرتی ہوں اور پھر سرزبیر نے بھی میری شاعری پڑھی ہے انہوں نے بھی اصرار کیا ہے کہ میں حصہ لوں۔“ اسے تیسور کا رویہ سمجھ میں آ رہا تھا۔  
”تمہیں کیا لگتا ہے، تمہاری شاعری میں

ایسی کون سی خاص بات ہے جو سر زبیر نے اصرار کیا، سر کے اصرار کی وجہ یہ ہے کہ تم صنف نازک ہو اور صنف نازک کی کامیابی کا سب سے بڑا ہتھیار اس کا صنف نازک ہونا ہی ہوتا ہے، وہ میدان میں اترنے سے پہلے ہی میدان مار لیتی ہے، ٹائپسٹ کی جاب سے اسٹارٹ کرنے والی دو ہفتوں میں باس کی پرسنل سیکرٹری بن جاتی ہے، صرف اس لئے کہ اس کا تعلق صنف نازک سے ہے۔“ تیمور کے لہجے میں حد درجہ حقارت تھی، وہ اسے دیکھتی رہ گئی۔

”آپ صنف نازک کی توہین کر رہے ہیں۔“ بالآخر وہ یہ جتنا نا بھولی کہ اسے یہ انداز ناگوار گزرا ہے، اتنے میں پھپھو کے آجانے پہ وہ چلا گیا اور وہ بھی غزل رکھا کے واپس آ گئی، پہلے والی گرم جوشی اور خوشی مفقود تھی، تیمور کے رویے سے وہ بہت ہرٹ ہوئی تھی۔

☆☆☆

ستم تو یہ ہے ظالم خن شاس نہیں وہ اک شخص جو شاعر بنا گیا مجھ کو ”تیمور کل مشاعرہ ہے میں جانتی ہوں آپ بھی وہاں موجود ہوں۔“ خود کو لاکھ بہلاؤ سے سلی دے کر کہ شاید تیمور کو کوئی تلخ تجربہ ہوا ہو، کسی مسئلے میں الجھے ہوں، کی تاویل دے کر ساری کدورت مٹا کے وہ آج پھر اس سے التجا کر رہی تھی۔

”کل تو آفس میں بہت کام ہے، سوری۔“ اس نے صفا چٹا انکار کر دیا، اس کی غلط بیانی یہ وہ ہکا بکا رہ گئی، پرسوں ہی تو اس نے خود بتایا تھا کہ باس کی بیٹی کی شادی ہے، چھٹی ہے اور آج کتنی ڈھٹائی سے جھوٹ بول گیا تھا۔

دعا ہے کہ کامیابی کی منازل ہوں زیادہ تم اس دور کے لئے اچھوتا خیال ہو

اک کے بعد اک افسانے شائع ہو رہے تھے، قاری اس کی تحریر پسند کرتے تھے، فاضل سمسٹر شروع ہو کر ختم بھی ہو گئے، اس کا زیادہ تر وقت لکھنے میں گزرنے لگا۔

☆☆☆

”عزیزی! فنانس اٹھ جاؤ۔“ ابھی وہ سیلے بالوں کو سلجھا ہی رہی تھی جب اچانک ہی آریان نے آکر حکم بھرے لہجے میں بولا۔

”کیوں؟“ وہ حیران تھی، عزہ نوین کو بیمار سے عزیزی ہی کہتا تھا۔

”تم کیوں کیوں کرتی رہو، میں چلا پٹک مٹانے۔“ جھلا کے مڑ گیا۔

”پٹک، کیسی پٹک؟“ اس نے فوراً آستین پکڑ کے کھینچا۔

”رازیں اور اس کی فیملی پٹک کا پردگرم بنا رہے تھے، مجھے بھی جوائن کرنے کو کہا، تو میں اور تم ابھی اور اسی وقت چل رہے ہیں۔“ وہ پھیل کے بیٹھ گیا۔

”ابھی اور اسی وقت؟“ وہ پرسوج انداز سے خود پہ اک نظر ڈالنے لگی، جنرل کے ساتھ اس نے لاگت شرٹ پہن رکھی تھی، دو پٹا شالوں پہ پڑا ہوا تھا۔

”کیوں وقت کو کیا ہوا؟“ مہنویں اچکا کر پوچھا۔

”مما پپا؟“ اس نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”میں پرمیشن لے چکا ہوں۔“ اس نے اپنے کارنامے سے مطلع کیا۔

”مجھے ابھی ناول مکمل کرنا ہے، مدبرہ جی کا فون بھی آچکا ہے۔“ وہ شش و پنج میں گھبر گئی، پٹک کی آفر ریجیکٹ کیے جانے کے قابل نا تھی۔ ”مرد تم، اپنی رولی دھولی ہیروئن کو چپ

کراتی رہوا ہے اس فضول کھڑوس ہیرو کے ہاتھ ہوئی بے عزتی پہ، میں چار ہا ہوں انجوائے کرنے، تم سڑ واسپے کرے میں۔“ وہ دھماڑ کے بلٹنے لگا، وہ واقعی اس پوائنٹ پہ آئے لکھ گئی تھی، اڑیل ہیرو جھٹکے کو تیار نہ تھا اور ہیروئن بے چاری آس لگائے بیٹھی تھی کہ وہ اسے مٹانے اسی چکر میں چاند رات انتظار کرتے گزر گئی اور اب صبح عید قربان تھی، ہیرو جانور ذبح کرنے کے لئے چھری تیز کر رہا تھا مگر ہیروئن کو مٹانے کا اس کا کچھ ارادہ نہیں لگ رہا تھا۔

”آری بتاؤ نا کیا کروں ایسا کہ ہیرو، ہیروئن کو مٹا لے؟“ وہ رات بڑی بے چارگی سے اسے پوری اسٹوری سنا کر پوچھ رہی تھی۔

”ہیرو جب عید قربان کی صبح تیل کو گرا کر اس کے گلے میں چھری پھیر کر ذبح کرے تب چھری لہرا کر ہیروئن کو دکھائے ایکپیرشنز، ایسے ہوں کہ چھری تمہارے گلے میں بھی پھیر سکتا ہوں۔“

”تو یہ..... مٹانا ہے..... قتل نہیں کروانا۔“ وہ آریان کی منظر کشی پہ جھرجھری لے کر رہ گئی۔ ”آگے تو سنو۔“ وہ بیچ میں ٹوک دینے پہ وہ جھلایا۔

”سناؤ۔“ گھٹنوں پہ غھوڑی ٹکا کر دونوں ہاتھ ہیروئن کے گرد لپیٹے وہ ہمہ تن گوش تھی۔

”ہیرو جب تیل کو ذبح کرے تو دل پلچلی نکال کر ہیروئن کو دے تو پلچلی بتاتے ہوئے ہیروئن اس میں زہر ڈال دے، ہیرو کے جسم میں جب زہر کا اثر ہو تو اسے احساس ہو اس نے کتنا ملٹ گیا ہے بے چاری ہیروئن سے پنگالے کر، وہ سے اوپر ملنے کی دھمکی دے کر آخری پچھلی لے، لہ اللہ خیر ملا۔“

”نہایت ہی فضول ہوں میں جو تم جیسے سے

مدد مانگ لیتی ہوں، اس تو اچھا ہے کسی بڑی کے نیچے آ جاؤں۔“ وہ جو انہماک سے اس کے نادر نایاب نسخے سے فیض یاب ہو رہی تھی، جھلبلا گئی۔

”مرضی ہے، میں نے تو بہت دھانسو آئیڈیا دیا، قاری بھی شاکڈ رہ جائیں گے کہ بظاہر پورے ناول میں معصوم نظر آنے والی ہیروئن کتنی سفاک ہے، سب کی ہمدردی بے چارے ہیرو سے بڑھ جاتی گی اور ہاں ناول کا نام آخری پٹکی رکھنا۔“ آریان جانے اور کیا کیا بکواس کر رہا تھا اس نے بین بیہر اٹھا کر جانے میں ہی عافیت جانی اور اب وہ پٹک کا مژدہ سنا رہا تھا۔

”افو، رکو پھل رہی ہوناں۔“ وہ لجاہت سے بولی تھی۔

”That like a good girl“ اسے خبر تھی پٹک تو عزہ نوین بھی مس کر ہی نہیں سکتی۔

”بڑی جلدی یقین آیا؟“ وہ جل کے تنقیدی نظروں سے اپنے کپڑے جانچ رہی تھی، بلو جینز اور بلو اور ریڈ پرنڈ شرٹ میں ریڈ دوپٹہ لئے وہ دیک رہی تھی، بال خشک کر کے پونی بنائی تھی، نیچرل کلر کی لب اسٹک سے ہونٹوں کو رنگ کے وہ بالکل تیار تھی۔

”چلو۔“ آنکھیں بند کیے آریان کے پیچ پہ اک دھب رسیدی۔

”ابھی تو بڑی جلدی مچا رہے تھے اور اب خود سو رہے ہو۔“

”سو کون کم بخت رہا ہے میں تو بند آنکھوں سے ان کو دیکھ رہا تھا۔“ بالوں میں ہاتھ پھیرتا وہ اٹھ بیٹھا۔

”کن کو؟“ وہ جارحانہ تیوروں سے آگے بڑھی۔

”اور ابھی تم نے بالوں میں ہاتھ کیوں

پھیرا، مجھے تو بڑا کہتے ہو تمہارا ہر دوسرا ہیر و بالوں میں ہاتھ پھیرتا رہتا ہے، ہر دو تین منٹ بعد ہمارے کے پاس کبھی نہیں باجوں کچھ زیادہ کاٹتی ہے۔“ وہ سخت تیوروں سے گھور رہی تھی۔  
”غلطی ہوئی مس پاکستان چلو۔“ اس نے ہاتھ جوڑ کر جان چھڑائی۔

”تم پہلے نہیں بتا سکتے تھے پبلک کا۔“ آریان اب کے بالوں میں برش کر رہا تھا، کہ بالوں میں ہاتھ پھیرنے کا دھبا دھو سکے۔  
”نہیں لے لو یار، بالکل بھول چکا تھا، وہ تو جب مرنے کی بانگ کے بعد رازین کی کال آئی تو یاد آیا۔“  
”ایسے اچھا نہیں لگتا، کم از کم کچھ انتظام تو کر لیتی۔“ اس نے م نہ بھورا۔  
”نکرنا کرو، رازین کے گھر والے بڑے مہمان نواز ہیں۔“ بڑے اطمینان سے جواب دیا۔

”یہ وہی رازین ہے نا جو دو گلیوں کے بعد رہتا ہے؟“ پرفیوم اسپرے کرتی وہ استفسار کر رہی تھی۔

”ہوں اور بقول تمہارے اچھا لڑکا ہے۔“ آریان نے اس کے ہاتھ سے پرفیوم لے کر خود پہا سپرے کرنا شروع کر دیا۔

”الحق لیڈی پرفیوم ہے۔“ وہ جھلائی۔  
”یہ تو لیبل پہ لکھا ہے نا، خوشبو نے کون سا پھڑک کے سب کو بتانا ہے میں لیڈی اسمبل ہوں۔“ اس کے چہرے کے بولنے پہ وہ سر پہ ہاتھ رکھ کر رہ گئی، اسی دم گاڑی کا ہارن بجا تھا، ساتھ ہی آریان کا سیل فون بھی چیخنے لگا، عزمہ نوین کی خوفزدہ سی چیخ نکلی۔  
”کم از کم اس رنگ ٹون کو تو جینج کر لو، اچانک ہزار لوگوں کی چیخ پہ بندے کا ہارٹ ٹیل

ہی ہو جائے گا۔“ اس نے ناگواری سے اس کے فون کو دیکھا۔  
”مشورہ کسی اور وقت کے لئے اٹھا رکھو اور نکلنے کی کرو، وہ لوگ آگئے ہیں۔“ ہینڈ بیک اٹھا کر وہ اس کے پیچھے بھاگی۔  
”رکرو کو۔“

”کیا آفت آگئی ہماری موجودگی میں۔“ اس کے ایک دم چیخنے پہ وہ جھلا گیا۔  
”مما، پپا کو تو بتا کر آؤں۔“ وہ ان کے کمرے کی طرف دوڑی، واپس آئی تو آریان کے ساتھ تیمور کو دیکھ کر اس کے قدم رک گئے، پچھلے کئی مہینوں سے اس کا رویہ اکھڑا اکھڑا تھا، اب آریان کی کسی بات پہ کھڑا مسکرا رہا تھا۔  
”اپنے ساتھ تیمور کو بھی گھسیٹ لیا، اس کو تو جین نہیں۔“ وہ آریان کو گھورنے لگی۔  
”تمہیں کیا ہوا؟“ وہ اس کے پاس چلا آیا۔

”تیمور کو لینے کی کیا ضرورت تھی؟“ اسے خبر تھی اس خنجریلے بندے کی آریان نے کتنی منت سماجت کی ہوگی تب ہی وہ ان پہ احسان کرنے کو تیار ہوا ہوگا، اسے تیمور کی فطرت کا اندازہ تھا تو آریان کی محبت کا بھی، اس نے یقیناً اس کی خوشی کے لئے اس کی خوشامدی ہوگی۔

”دل میں تو کلو دو کلو کے لڈو پھوٹ رہے ہیں اور چہرہ دیکھو۔“ وہ چمپیر رہا تھا۔  
”تم نے اصرار کیا ہوگا ورنہ محترم کیسے مان گئے۔“ اس کی چمپیر کو نظر انداز کرتے وہ سنجیدگی سے پوچھ رہی تھی۔

”تم چھوڑنا، تمہاری خوشی کے لئے میں ہر ناممکن کو ممکن بنا دوں یہ تو پھر تیمور بھائی کو منانا تھا، چلو ہارن بجارہے ہیں وہ لوگ۔“ وہ کٹ بیک اٹھائے اسے چلنے کا اشارہ کرنے لگا۔

”یہ کیا ہے؟“ کٹ بیک میں خورد و نوش کی چیزیں دیکھ کے وہ خنجر سے پوچھ رہی تھی۔  
”میں اپنی سسٹر کو دوسروں کے سامنے شرمندہ ہونے کیسے دیکھ سکتا ہوں، سارے انتظامات کر لئے تھے، ممائے کافی کچھ بنوا لیا، کچھ بیکری سے لیا، تمہیں سر پر انڈیے کا پروگرام تھا۔“ محبت بھرے لہجے پہ وہ جاننا نظر دوں سے بھائی کو دیکھنے لگی۔

”میری خوشی کے لئے اگر آئندہ تم نے ایسی حرکت کی تو چھوڑ دوں گی نہیں تمہیں، مجھے اپنے بھائی کو کسی کی خوشامدی کرتے دیکھنا پسند نہیں۔“ اس نے وارننگ دینے کے ساتھ جتا بھی دیا۔  
”اوکے چلو۔“ اس کا ہاتھ تمام کر وہ اونچی آواز میں ماما کو اپنے جانے کے متعلق بتانے لگا۔  
”مما ہم نکل رہے ہیں، لیٹ ہو گئے تو فکرنا کیجئے گا، کال کر دوں گا۔“ عزمہ نوین نے اسے ٹھوکا دیا۔

”اسٹو پیڈ ممائے پاس ہی کھڑی ہیں۔“ ممائے دروازے تک انہیں چھوڑنے آئی تھیں۔  
☆☆☆☆

رازین بخاری کی فیملی سے اس کی پہلی ملاقات تھی مگر تکلف کی دیوار گرائے سب گاتے بجاتے دن بھر انجوائے کرتے رہے تھے، ہنسی کی جلتی رنگ میں کوئی لہروں کے ساتھ قدم مل رہا تھا تو کوئی پتھر پہ بیٹھا شوریدہ لہروں کو انجوائے کر رہا تھا، رازین کی بہنوں کے ساتھ وہ پانی میں دور تک چلی گئی تھی، مگر آریان کی پکار پہ واپس پلٹ آئی۔

”کیا ہوا؟“ آریان کے ساتھ تیمور اور رازین بھی کھڑے تھے اس لئے وہ بڑا سنبھل کے بولی۔

”فلاسک میں چائے ہے، ذرا ڈال کے تو

لے آؤ۔“ اس حکم شناسی پہ وہ خیر سے آئیں گئے اسے گھورنے لگی۔  
”تم نے فلاسک میں سے چائے نکالنے کے لئے مجھے آواز دی۔“ مددے سے چور لہجے میں وہ استفسار کر رہی تھی، آریان نے مسکرا کر شدید سے سر ہلایا۔

”میں عزمہ نوین مشہور و معروف رائٹر تمہیں فلاسک سے چائے نکال کر دوں، نو دے ایک رائٹر کے ہاتھ میں قلم اچھا لگتا ہے، فلاسک نہیں۔“ حسب عادت وہ بھڑک اٹھی، تیمور لب بھیچنے کھڑا تھا، ماتھے پہ ٹکٹوں کا جال بچھ چکا تھا، جبکہ رازین لب دبائے مسکرائے جا رہا تھا، سن گلاسز کو بالوں پہ نکالنی ایک ہاتھ کمر پہ رکھے وہ آریان کی طرف متوجہ تھی، آریان داد طلب نظروں سے رازین بخاری کو دیکھ رہا تھا، جس نے ٹریڈر دکھانے کی فرمائش کی تھی، رازین کی بہنیں بھی ہنس پڑی۔

”ایکسیکو ذی، آپ عزمہ نوین ہیں جو ہاتھ اندہ تعبیر میں تھکتی ہیں۔“ ان سے چند قدم کے فاصلے پہ لڑکیوں کا گروپ تھا جو بلا ارادہ ان کی گفتگو کی طرف متوجہ ہو گئی تھیں، ان میں سے ایک قریب آ کر دریافت کرنے لگی۔

”جی!“ عزمہ پلٹ کر حیران ہوئی۔

”Wow, I can't bleave this۔“ لڑکی بے حد ایکسائیز ہو گئی تھی، اس کی ایکسانٹ دیکھ کے اس کے گروپ کی باقی لڑکیاں بھی آکر اسے زرنے میں لے چکی تھیں۔

”لبیوی آپ مجھے اتنی پسند ہیں۔“ وہ تینوں سائیڈ پر ہو کر اس سین کو دیکھ رہے تھے، تیمور کی آنکھوں سے غصہ چھلکے لگا تھا، رازین اور آریان محفوظ ہو رہے تھے۔

”میں پسند ہوں۔“ اس نے لڑکی کا جملہ



شگفتہ لہجے میں پکڑا۔

”I mean آپ کی تحریریں Owsume ہوتی ہیں، آپ کا ناولٹ ”موسم در دکا“ تو مجھے بالکل اپنی کہانی لگی، آپ بھی مجھے بہت اچھی لگیں، اپنی ہیروئن کی طرح آپ بہت چلبلی سی ہیں۔“ ان کے تعریفی جملوں پہ وہ بس مسکرائے جارہی تھی۔

”آپ کا اشار کیا ہے، نیورٹ کٹر کون سا ہے۔“

قارئین کی نظر میں رائٹرز یوں بھی آسانی مخلوق ہوتی ہیں، وہ سب اوٹ پانچ سوال کرنے لگیں اور وہ ہنستے ہوئے انہیں یقین دلا رہی تھی کہ وہ بھی ان کی طرح انسان ہی ہے۔

”عزہ جی! بہت اچھا لگا آپ سے مل کر، میرے ذہن میں عزہ لوین کی شبیہ بڈھی کھوسٹ سی تھی، عزہ بھول مت جائیے گا میں آپ کو کال کروں گی۔“ نمبر کے تبادلے ہو چکے تھے، اس نے سر ہلایا۔

”عزہ آئی اگر میں اپنے بھائی کے لئے آپ کے گھر آؤں تو۔“ کالی در سے خاموش کھڑی لڑکی جب بولی تو وہ ہنستی چلی گئی۔

”صد شکر آپ جل کے مرنے سے بچ گئیں، ایسی بھابی کے ہاتھوں، مہترہ انگریز ہیں۔“ آریان پاس ہی کھڑا تھا، اس کے کہنے پہ لڑکی کا منہ اتر گیا۔

”یہاں موجود ہیں ان کے فیائسی۔“ اک اور کو اشتیاق ہوا وہ سب دلچسپی سے رازین بخاری کو دیکھنے لگیں۔

”جی حضور وہ سامنے کھڑے ہیں۔“ رازین اور تیمور ان سے تھوڑے فاصلے پہ ہی کھڑے تھے، عزہ بھی انہیں دیکھنے لگی، عزہ کو جانے کیوں رازین کے مسکراتے لب سکڑتے

ہوئے محسوس ہوئے۔

”آپ کے فیائسی بہت ڈشنگ ہیں۔“ الوداعی ہاتھ ملاتے ہوئے لڑکیوں نے تعریف کی تو وہ مسکرائے رہ گئی، تیمور اس کے پاس تک بھی نہیں تھا مگر اسے خبر تھی، وہ سب اس کا دل رکھنے کو کہہ رہی تھیں، لڑکیوں کے زرنے میں گھری عزہ نوین یہ رازین بخاری کی نظریں مرکوز تھیں، شاید اس کی نظروں کے اشتیاق سے ہی لڑکیوں نے اسے فیائسی جانا تھا، ابھی ابھی جو انکشاف ہوا وہ اسے اندر تک ہلا گیا تھا اور جاتے جاتے لڑکیاں اس کے زخم پہ نیک چھڑک گئیں۔

”سر آپ بہت لگی ہیں جو عزہ آپ جیسی لڑکی جو بہت اچھی رائٹرز بھی ہے، آپ کا نصیب بن گئی ہیں۔“

”لگی اور میں۔“ وہ لب کھل کے رہ گیا۔ وقت کے ہاتھ سے گر کر ہوئی ریزہ ریزہ زندگی بکھری کچھ ایسے کہ سیٹی نا مٹتی اسے یک لخت ہی سارا ماحول وحشت زدہ لگنے لگا، وہ ٹھانٹیں مارتے سمندر پہ نظریں جمائے کھڑا رہا۔

”عزہ کولڈ ڈرنک کی بوتلیں لے آؤ کالر سے۔“ کسی طرف سے پکار پڑی تو وہ دین کی طرف بڑھ گئی، سب دسترخوان لگا کر بیچ نکال رہے تھے۔

”آپ یہاں کیوں چلے آئے، باہر سب انجوائے کر رہے ہیں۔“ دین کے اندر تیمور کو سگریٹ کے ٹپ لگاتے دیکھ کے وہ حیرت بھرے لہجے میں پوچھ بیٹھی۔

”تم انجوائے کرو، ان چونچلوں کو۔“ عجیب جلا ہوا لہجہ تھا، چہرے پہ یہاں سے وہاں تک حقارت و نفرت کے رنگ پھیلے ہوئے تھے۔ ”میں بھی نہیں۔“ اس کا اک دم سے چراغ

باہونے کی وجہ اس کی سمجھ سے باہر تھا، اس کے بل بل بدلتے موڈ کو وہ آج تک سمجھنا سکتی تھی، اسے تو اس سے بات کرتے ہوئے بھی ڈر لگتا تھا، نامعلوم کون سی بات بری لگ جائے۔

”تم صرف یہ سمجھ لو کہ پبلک ہیٹس میں مجھے ہنسی مذاق قطعاً پسند نہیں اور تم یہ ہی سب کچھ کر رہی ہو، چند فارغ الدماغ لڑکیوں نے جموٹی تعریف کیا کر دی تم تو ہواؤں میں اڑنے لگیں، مجھے یہ سب پسند نہیں، آئندہ خیال رکھنا۔“ اسے حقیر نظروں سے دیکھتے وہ کہہ رہا تھا، چٹکتے اعصاب نے اسے چپ رہنے کا موقع نہیں دیا، بے عزتی کے احساس نے چہرہ سرخ کر دیا، جسے خلوص دل سے چاہیں اور جب وہی زبان کے انگاروں سے سگائے تو اس وقت کیسا درد نکتی اذیت محسوس ہوتی ہے وہ ان گھڑیوں میں جان گئی۔

”مسٹر تیمور ظفر، آپ کو ایسا کوئی حق نہیں کہ آپ میری بے عزتی کریں، میں کیا ہوں، کیسی ہوں، خود کو بہت اچھی طرح جانتی ہوں، سمجھتی سینے وقت یہ نہیں دیکھا جاتا کہ آپ پبلک ہیٹس میں ہیں یا گھر میں، محبت جہاں، جس انداز میں ملے، محبت ہوتی ہے، آپ کی نظر میں اس کا شمار چونچلوں میں ہوتا ہو گا، مگر میرے نزدیک، محبت زندگی ہے اور آئندہ میرے متعلق اپنی رائے دینے سے پہلے دو بار سوچ ضرور لیجئے گا۔“ غصے سے سرخ ہوتے چہرے کے ساتھ کہہ کر وہ دین سے نیچے اتر گئی، مجروہوں سے نیچے رازین بخاری کو دیکھ کر اک لمحے کو ہنسی گھرا گلے ہی پہلے وہ سب کے درمیان تھی۔

”تم تو بوتل لینے گئی تھیں؟“ فاریہ نے پوچھا تو وہ ہنستا ہنستا۔

”کالر بہت دزنی ہے، مجھ سے اٹھ نہیں رہا

تھا، رازین لا رہے ہیں۔“ رازین بخاری لوہور سمیت دیکھ کے اس نے فوراً بات بنائی، اسے اپنی طرف دیکھتے پا کے وہ سر جھکا گئی، اس نے یقیناً سب سن لیا تھا، تیمور نے بچ کر نہ جانے سے انکار کر دیا تھا، آریان کے اصرار پہ بھی وہ دین سے نیچے نہیں اترتا تھا، سب کو ہی محسوس ہوا تھا مگر سب نے ذکر نہیں کیا، واپسی تک تیمور کے ہاتھ پہ شکلوں کی تعداد بڑھ چکی تھی، اسے اپنی کبی ہوئی بات پہ کوئی ندامت و شرمندگی نہیں تھی، اندر سے وہ بالکل مطمئن تھی۔

”عزہ اب تو دوستی کچی ہے تاہم آنا ہمارے گھر۔“ انہیں ڈراپ کرتے وقت فاریہ محبت سے ہاتھ تھام کے بولی۔

”انشاء اللہ۔“ وہ محبت سے مسکرائی تھی۔ ”اگر مجھے خبر ہوتی کہ آریان کی بہن اتنی اچھی ہے تو میں خود دوستی کرنے آ جاتی۔“ آریان کو دیکھتے فاریہ کے چہرے پہ جو دھنک رنگ آئے اس نے اس پہ بہت سے اسرار و رموز عیاں کر دیئے اور جب یہی رنگ آریان کے چہرے پہ بھی ملے تو وہ اس وقت تک اسے ستاتی رہی جب تک اس نے خود اقرار نہیں کر لیا۔

”کب سے دھول جھونک رہے ہو، میری آنکھوں میں؟“ کڑے تیموروں سے پوچھ رہی تھی۔

”دو ہفتوں سے۔“ وہ ڈھٹائی سے مسکراتے ہوئے بولا۔

”کیا دو ہفتوں سے۔“ اس نے ابرو اچکائے۔

”دو ہفتے پہلے تو اظہار کیا تھا۔“ آریان نے مسکراہٹ دہائی۔

”اظہار بھی کر چکے اور مجھے بتایا بھی نہیں، ذلیل کہنے۔“ اس نے گلوں کی ہارش کردی۔

”میں نہیں کیا بتانا، تمہارے ہی فارمولے پہ تو عمل کیا ہے۔“ وہ گرنے کے انداز پہ صوفے میں ڈھے گیا۔

”کون سا فارمولا؟“ وہ حیران ہوئی۔  
 ”تمہاری پچھلے دنوں اک اسٹوری ملتی تھی نا جس میں ہیرو غریب اور تھوڑا کم ہمت ہوتا ہے، جب کہ ہیرو دین امیر اور بولڈ ہوتی ہے، ہیرو اسے بہت چاہتا ہے، مگر اسے رنجش کیسے کیے جانے کا خوف تھا اور وہ اس خوف سے کبھی نکل نہ سکا، یہ سوچ تھی کہ لڑکی امیر اور بولڈ ہے اسے گھاس کہاں ڈالے گی، پھر وقت گزرا محترم ہیرو صاحب کی شادی اپنی ہی کلاس کی کسی لڑکی سے ہو جاتی ہے اور پھر تیس بائیس سال بعد اک دن اچانک ہیرو صاحب کو ہیروئن کی ڈیپارٹ منٹنل اسٹور پہ ملتی ہیں اور ہیرو ساتھ کھڑی لڑکی کا تعارف کر داتا ہے، یہ میری بیٹی لانا اور ہیروئن صاحبہ دور کھڑے لڑکے کو گھسیٹ کے اپنے برابر کر کے کہتی ہیں یہ ہے میرا بیٹا ڈھکنا، دونوں ہی حیران پریشان کھڑے ہوتے ہیں کیونکہ انہوں نے اک دوسرے کے نام رکھے ہوئے تھے، اپنے بچوں کے۔“

”اطلاع کے لئے عرض ہے کہ یہ میری ہی لکھی ہوئی اسٹوری ہے، یہ بتاؤ فارمولا کہاں ہے؟“ اسے اس کی رام کہانی کی سمجھ نہیں آ رہی تھی۔

”اسے کہتی ہیں لکیر کی فقیر، پوری کہانی سن کر پوچھتی ہو، آخر یہ سلیم تھا کون، قتل مند میں نے فار یہ سے اس لئے اظہار کر دیا کہ مجھے اپنی بیٹی کا نام فار یہ نہ رکھنا پڑے۔“ اس نے دانائی ظاہر کی۔

”Genius very very genius!“ اس نے استہزائیہ انداز میں تالی

بجائی۔

”بچو تم اسی لئے آپ مجھے اپنے ساتھ لے گئے تھے کہ میں ممپا کو باخبر کر دوں کہ بھی خیر ہے۔“ آریان عزیز بڑے ہو گئے ہیں، وہ جھپٹ رہی تھی۔

”خیر سے کیا مطلب؟“ وہ نیکی نظروں سے گھورنے لگا۔

”کچھ خاص نہیں، لیکن مجھے اک بات کا جواب دو۔“ اس نے سنجیدگی سے شکل بنائی۔

”پوچھو۔“ آخر یہ سلیم تھا کون؟

”عزیز ا!“ وہ جارحانہ تیوروں سے کھڑا ہوا مگر وہ بھاگ چکی تھی۔

☆☆☆

آپ ہی اپنی اداؤں پہ کچھ غور کریں ہم اگر عرض کریں گے تو شکایت ہو گی دن بہ دن تیور کا رویہ خراب ہوتا جا رہا تھا، بڑوں نے نا صرف نسبت طے کی تھی بلکہ اک مشرقی لڑکی کی طرح اس کے نام کی انگوٹھی پہن کے وہ اسے سوچنے لگی تھی، اس کا چنگ آمیز سلوک اسے گراں گزر جاتا تھا، اس کا اکڑ رویہ مفروانہ انداز پر وار چپ چاپ سہہ جاتی تھی مگر جب بات عزت اور انا کی آ جاتی تو جذبات کو نہاں خانوں میں چھپائے وہ خود، ضدی اور ہٹ دھرم لڑکی بن جاتی تھی، ابھی کل ہی تو وہ اس پہ چپ چلا کہ گیا تھا۔

”اگر تم نے لکھنا بند نہیں کیا تو میں منگی توڑ دوں گا مجھے تمہارے لکھنے اور تمہاری اس طرح کی ایکٹیو دینی سے چڑ ہو گئی ہے۔“ اور وہ ساکت رہ گئی، یہ سوچ ہی کتنی دل شکن تھی کہ وہ اس کے نام سے جلنے لگا ہے، حسد کرتا ہے، کتنا عرصہ اس نے خود فریبی میں گزار دیا کہ شاید یہ اس کا وہم تھا مگر وہم کو اس کی زبان سے سن کر وہ تنگ رہ گئی۔

اس کے بپا بھی تو مرد تھے، ادب سے لگاؤ نہ دینے کے باوجود بھی اس کی تحریر پڑھتے تھے، وصلہ افزائی کرتے تھے اور آریان عزیز، جتنا بار ملا کہتا، اس کی تحریروں میں سو تفصیلاً نکات یہ الگ ت کے نقص نکال کر کہانی کو سنوار دیتا تھا اور سب سے بڑھ کے اس کی بے انتہا سلیپ کرتا تھا، پچھلے دنوں وہ ایک پاگل شخص کی اسٹوری لکھنا چاہی تھی، مگر بعد کی کمی جب تک کسی مینٹل ہاسپٹل آؤٹ نہیں کرے گی تب تک قلم کے سپرد کچھ میں کرے گی، آریان نے بڑی مشکلوں سے، ماما سے اجازت دلائی تھی۔

ان کی ملاقات اطہر سے ہوئی جو دس سال سے پاگل خانے میں تھا، بااں باپ مر چکے تھے۔ سگا بھائی اور بھابھی بھی تھے۔

اطہر اپنی آپ بیتی سنارہا تھا اور خونی رشتوں سے بے حس دیکھ کے ان کا دل رو رہا تھا، جائیداد نے لالچ میں بھائی نے ڈاکٹر کی طبی بھگت سے ابترک شاک اور جنرلی میڈیکل رپورٹس کی بناء پہ سے پاگل قرار دے کر اسے پاگل خانے داخل روادیا اور تمام جائیداد پہ قبض ہو گئے، اطہر نارہا اک اک کو پکڑ کر کہتا رہا کہ وہ پاگل نہیں ہے، مگر جواب ملتا۔

”ہر پاگل یہی کہتا ہے۔“ یونہی روتے تے اور یقین دلاتے پاگل نا ہونے کے باوجود سال اس نے پاگل خانے میں گزار دیئے۔

اک برائے پہلے وہ اک انسان تھی، اس نے فیملی ایڈوکیٹ سے مشورہ کیا اور پھر فاؤنڈیشن مداخلت پر اطہر کا مینٹل چیک اپ اور پاگل ثابت نا ہونے پہ اس کے بھائی اور بھی نیل کی ہوا کھا رہے تھے، اطہر انہیں نہیں دیتے نا تھک رہا تھا، سب اس کے شکر ا رہتے اور وہ آریان کی، اگر وہ اسے اطہر تک

نہیں پہنچاتا تو وہ کیسے اس کی مدد کر پالی۔  
 پھر تیور ایسا سنگینی گرا ہوا مرد تھا جو زمانہ قدیم کی طرح عورت کو بہر کی جوتی ہی سمجھتا تھا۔  
 میرے اندر کوئی پچھڑا ہوا ہے کچھ دنوں سے تمہیں کیسے بتائیں کیا ہوا ہے کچھ دنوں سے کسی کی یاد میں آنکھیں کہانی کہہ رہی ہیں کوئی مجھ سے کہیں پچھڑا ہوا ہے کچھ دنوں سے وہ ذہنی طور پہ ڈسٹرب ضرور تھی مگر اس کی دھمکی سے ڈری ہرگز نہیں، اس کا ایمان تھا، جو چہ ہمارے مقدر میں لکھی جا چکی وہ ضرور طے گی کوئی اسے چھین نہیں سکتا، جب رب پہ کامل یقین ہو تو دل سے ہر ڈر خوف مٹ جاتا ہے، مگر دل کے کسی کونے میں در ضرور اٹھا تھا۔

عورت اپنی محبت وفا جس مرد کے نام کر دے اگر وہی مرد اسے تنہا کر جائے تو عورت کیا کرے؟ محبت کرنا چھوڑ دے؟ بظاہر ایل ای ڈی پہ نظریں جمائے زندگی کی ڈوٹی ناؤ کو سنہرے کنارے لگانے کے متعلق سوچ رہی تھی، جب دندانہ تیور اس کے سر پہ آکے جھپٹنے لگا، اس ماہ کا رسالہ اس کے ہاتھ میں تھا، جی جی بھڑاس نکال کے وہ دھب دھب کرتا چلا گیا اور وہ ساکت نظروں سے اسے دیکھتی رہ گئی، بلندی پہ براجمان لوگ جب پست ذہنیت کا مظاہرہ کریں اس وقت لب ساکت اور عقل ٹوٹتا اشارہ جاتی ہے۔

اپنے اونچے قد و قامت سے مجھے رسوا کر کہ جتنے مجھے بیڑ تھے اتنا گھنا سایہ نا تھا ☆☆☆

مجھ کو لے ڈوبا تیرا شہر میں بکتا ہوا دل بہل جاتا اگر کوئی بھی تجھ سا ہوتا مگرل بہ دونوں ہاتھ جمائے اس کی نظریں ہسائیوں کی چٹوٹوں سے ہوتی آریان کی چھت پہ تھیں، اکثر دیشتر وہ اسے پیپر پن لئے لکھنے میں

معروف نظر آتی تھی، کبھی لکھتے لکھتے تھک جاتی تو اٹھکھٹا دبانے لگتی تھی اور کبھی کبھی سوچتی چپت پہ ٹھہرنے لگتی تھی، وہ اپنے آپ میں اتنی مست رہتی تھی کہ اسے خبر ہی نہ ہو سکتی کہ رازین بخاری اسے جانے کب سے دیکھتا رہا ہے، آریان سے دوستی، اپنی جگہ تھی مگر وہ اسے کبھی نہیں بتا سکتا تھا کہ وہ اس کی بہن کے عشق میں مبتلا ہے، اس کا ارادہ جلد ہی مگر والوں کو عجزہ نوین کے رشتے کے لئے بھیجے گا تھا، مگر آج جو حقیقت پتا چلی وہ اسے ہلاکتی تھی، آریان سے بھی عجزہ کے متعلق بات نہیں ہوئی تھی جو خبر ہوئی کہ عجزہ تیمور سے الٹیڈ ہے، اسے جہاں تیمور کی خوش نصیبی پہ رشک آیا دہیں اپنی یکطرفہ محبت پہ خاموشی اس کے اندر اتر گئی۔

”ضروری تو نہیں زندگی میں وہ تمام چیزیں ہی مل جاتی جن کی ہم خواہش نہیں۔“ مگی سانس لے کر اس نے رخ پھیر کر گرل سے کمر نکا دی تھی، آنکھیں دھواں دھواں تھیں۔

☆☆☆

یہ خاموشی جواب کے محنگلو کے بیچ ٹھہری ہے یہی اک بات ساری محنگلو میں سب سے گہری ہے ”عزیزی! طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟“

”بالکل ٹھیک، میری طبیعت کو کیا ہونا ہے۔“ لہجے میں بشارت سمو کے وہ آریان کو مسکرا کے جواب دی جو بڑی فکر مندی سے اس کے چہرے پہ کچھ ڈھونڈ رہا تھا۔

”بڑی ذل لگ رہی ہو، ہر وقت ہاتھ میں فائل اور پین ہوتا تھا جب کہ پچھلے اک مہینے سے تم نے انہیں چھوا بھی نہیں۔“ وہ اسے بخور دیکھ رہا تھا۔

”لکھوں کس پہ کوئی پلاٹ بھی تو ذہن میں ہو۔“ اس نے بے چارگی سے جیر سیٹے۔

”پلاٹ اور تمہارے ذہن میں نہیں، نا

ممکن۔“ وہ بے یقین تھا۔

”میں انسان نہیں لگتی جنہیں اور سارا قصور تمہارا ہے کب سے جنہیں کشمیر چلنے کو کہہ رہی ہوں مگر تم ہو کہ سن نہیں رہے، جب تک صحیح معلومات نہ ہو، نا لکھنے میں مزا آتا ہے نا ہی تحریر میں گہرائی اور سجاوئی نظر آتی ہے اور تم تو جانتے ہو سکتی سنائی بات یا کوکل پہ سرچ کر کے میں کچھ نہیں لکھتی، تو کب چل رہے ہو متوجہ کشمیر دہاں کے رہائشیوں سے ملنے؟“ کمال چالاکی سے بات اس کی طرف موڑ گئی۔

”کشمیر جانے کی بات تم ایسے کر رہی ہو جیسے کلشن چلنے کی، جانتی ہو مختصرہ ویزے کے لئے کتنے پاپز بیلنے پڑیں گے، کوشش تو میں کر رہا ہوں، پاپا کے فریڈ جو ایسے ہی میں ہوتے ہیں خرم انکل، ان سے بات کر چکا ہوں، انہوں نے بلایا تھا، مگر آج کل انٹر کے پیپر ہونے والے ہیں تو معروفیت تھوڑی بڑھ گئی ہے۔“ سارا دن وہ پاپا کے ساتھ آفس میں ہوتا تھا، اور شام سے رات گئے تک کو چنگ کو ٹانگ دیتا تھا۔

”اتنی محنت مت کرو، کون سا تمہارے آگے دس بچوں کی لائن ہے۔“ موڈ بدل کر چیخنے لگی۔

”نہیں یہیں تو کیا ہوا، ہو جائیں گے، دانا کہہ گئے ہیں نا جوانی میں کماء اور بڑھاپے میں کھاء۔“ وہ محنگندی کا مظاہرہ کر گیا، عجزہ نوین کو اس کی بردباری پہ کوئی شک نہ تھا تب ہی چیخنے لگی۔

”ہو سکتا ہے فاریہ کو اعتراض ہو؟“

”اس کی فکر نہ کرو۔“ وہ مسکرا کے بولا، عجزہ نے اس کے بازو پہ دھپ رسید کی۔

”پچھلے دنوں جو ناول لکھا ہے اسے رکھ کر لکھ کر لو، کچھ نیا لکھنے کا موڈ نہیں تو۔“

”ری رامیٹ کا بھی موڈ نہیں ہو رہا۔“ اس نے منہ بسورا۔

”کامل نمبر دن لاؤ میں ری رامیٹ کر دوں، ویسے تمہیں یاد ہے پہلا افسانہ، فیئر کروانے کے لئے تم نے میری لکھی مٹیس کی تھیں، بقول تمہارے کہانی میں تو کوئی خاص بات نہیں، شاید رائیٹنگ سے ہی امیر یس ہو کر مدیرہ جی شائع کر دیں۔“ اس نے چڑایا۔

”اور جیسے تم نے کر دیا تھا۔“ عجزہ رادقت یاد کرے حسب معمول وہ چڑھتی تو وہ ہنس پڑا۔

☆☆☆

تم کوئی مرکزی خیال نہیں جاؤ نکل جاؤ کہانی سے

”تم جیسی خود سر، ضدی، ہٹ دھرم لڑکی آج تک میری نظروں سے نہیں گزری، میرے ہر بار منہ کرنے کے باوجود تم اپنی حرکتوں سے باز نہیں آئیں، تم جیسی لڑکی اس لائق ہی نہیں ہے کہ تم سے کوئی تعلق رکھا جائے، میری زندگی میں تم جیسی لڑکی کا کوئی گزر نہیں، جنہیں اپنی سن مانی کرنی ہے کر لو، میں ابھی اور اسی وقت تم سے مل سکتی توڑ رہا ہوں۔“

”جسٹ شٹ اپ، اگر اب آپ نے اک غلط بھی میرے لئے منہ سے نکالا تو منہ توڑ دوں گی آپ کا۔“ ڈائجسٹ اور مٹھی میں دبی رنگ اس پہ پھینکتے ہوئے وہ غیظ و غضب سے دھارا تو وہ بھی بیچ پڑی۔

”اچھا ہوا آپ نے خود ہی بات ختم کر دی، ڈوں کے حکم عدولتی کی میں گنا گار نہیں ہوتی، پاہتی تو میں پہلے ہی بات ختم کر چکی ہوتی، مگر میں نے آپ کی ہر فضول بات برداشت کی، مگر اب آپ ہر گھٹ کر اس کر چکے ہیں۔“

”آپ کی نظر میں میں خود سر ضدی ہٹ

دھرم لڑکی ہوں کیونکہ آپ کی سرخوشی کے لئے سب نے آپ کی جھولی انا کے آگے کھٹنے نہیں کیے، میں جیتی جاگتی لڑکی ہوں، موم کی گڑیا نہیں جسے آپ جب چاہیں جیسے چاہیں، اپنے مطابق موڑ لیں گے۔“

”آپ مجھ سے کیا معنی توڑیں گے میں خود ہی اس عذاب سے لکھنا چاہتی ہوں، بہت اچھا ہوا جو پہلے ہی آپ کی فطرت کھل گئی، میں بہت بڑے نقصان سے بچ گئی، یہ رکھیں اپنی رنگ، دوسری کو پہنانے کے کام آئے گی، مگر اس سے پہلے اپنا علاج ضرور کروا لیجئے گا، کیونکہ کوئی بھی لڑکی نفسیاتی مریض سے شادی نہیں کر سکتی، آئندہ اپنی شکل مجھے نا دکھائی تو بہتر ہوگا، اینڈ گیٹ لاسٹ۔“ اوپری جیب میں رنگ ٹھونس کر اسے باہر کی راہ دکھائی، اس کی تیز آواز پہ مہیا بھی آ گئے تھے، جب تک معاملہ ان کی سمجھ میں آیا تب تک تیمور غصے کا اظہار کر کے جا چکا تھا۔

ہماری سوسائٹی کا المیہ ہے کہ ہماری عزت کو کب کہاں اور کس سے کیا بولنا ہے، کیسے پر فہام کرنا ہے اس کا تعین اس کی زندگی میں شامل ہونے والا مرد کرتا ہے، گویا وہ عورت کو اپنی زندگی میں شامل نہیں کرتا اس کو گردی رکھ لیتا ہے، چاہتا ہے عورت ڈی کی طرح اس کی کسی بات کو صرف آخر جان کر مانتی رہے، بھول جائے کہ اس کی اپنی بھی کوئی سوچ ہے، اپنی بھی کوئی دنیا ہے، اس نے سر جھٹک کے مگی سانس لی، تیمور کی کھٹی ہوئی ذہنیت سے اس کا دم کھٹنے لگا تھا۔

”کیا ہوا عجزہ!“ مگر فکر مندی سے پوچھ رہی تھیں، اس سے پہلے انہوں نے اسے اتنے غصے میں کبھی نہیں دیکھا تھا، عجزہ نے خاموشی سے مٹھی میں دبی رنگ مٹا کر تھما دی، دونوں ہی کچھ نا کچھ سن چکے تھے، عجزہ نوین نے انہیں ساری

صورت حالی سے آگاہ کر دیا۔

”وہ شخص چاہتا ہے میں اپنی شناخت کی بات نہ کروں، اپنی ذات اپنی پہچان بھول جاؤں۔“ عزہ نوین کے لہجے میں دکھ آسایا تھا، اس جیسی پڑھی لکھی لڑکی کو اک بظاہر پڑھے لکھے منگیتر سے یہ سب سننے کو ملتا تھا، تو جانے گاؤں دیہات میں بسنے والی لڑکیوں کو اپنی ذات کے لئے کتنا منوانا پڑتا ہوگا؟ اس نے ہنسی ہوئی سانس خارج کی، ملک آزاد ہو چکا تھا، صوبے بھی آزاد تھے کوئی آزاد نہیں تھی تو وہ آج کی عورت تھی جو اپنی مرضی سے سانس بھی نالے سکتی تھی۔

”میں صنفیہ سے بات کرتا ہوں۔“ ساری بات سن کر پاپا، پچھو کے گھر کی طرف بڑھے۔ ”نہیں پاپا، آپ پچھو سے کوئی بات نہیں کریں گے اس رشتے کو پھر سے جوڑنے کے لئے، آپ نے مجھے سراٹھا کر جینا سکھایا ہے، آپ کا یہ عمل میرا سر ہمیشہ کے لئے تینور جیسے ذہنی مرد کے سامنے جھکا دے گا۔“ اس نے پاپا کا بازو تھام کر نہیں روک لیا۔

”جو شخص میری ذات کو تسلیم نہیں کر سکتا میں ایسے شخص کے ساتھ ساری زندگی کیسے گزار سکتی ہوں۔“ اس کا رویہ دو ٹوک تھا، اس کی آنکھوں میں فی تیرنے لگی، وہ بھی عام سی لڑکی تھی، احساس و جذبات رکھتی تھی، منگیتر کے نام پہ اس کے دل کی کھڑکی بھی کھلی تھی مگر آئی تصنیف یہ اس نے کھڑکی ہمیشہ کے لئے بند کرنے کا تہہ کر لیا تھا۔

تیرا	قصور	نہیں	میرا	تھا
میں	تجھ	کو	اپنا	سمجھا
دیکھ	کے	تیرے	بدلے	تیور
میں	تو	اسی	دن	رو
اب	میں	سمجھا	اب	یاد

تو اس دن کیوں چپ چپ سا تھا  
☆☆☆

اندھے خوابوں کو اصولوں کا ترازو دے دے میرے مالک مجھے جذبات پہ قابو دے دے ”عزیزی! اتنا کچھ ہوتا رہا اور تم نے مجھے بتایا نہیں، ہماری دوستی کا یہ روز کہ ہم بھی اک دوسرے سے کچھ نہیں چھپائیں گے، جاؤ میں تم سے بات نہیں کرتا۔“ ماما سے سب سن کر رات آریان اس پہ بگڑ رہا تھا۔

”سوری آری!“ بھائی کا مہربان شانہ ملنے بھر بھری ریت کی طرح ڈھلے گئی، شام سے ضبط کا اعلا مظاہرہ کرنے والی لڑکی اس گھڑی پھوٹ پھوٹ کے رو پڑی، کیا عورت اتنی ہی ارزاں مخلوق ہے کہ اس کی بے قدری کی جائے، بے اعتمادی کا مظاہرہ کیا جائے۔

”تم نے مجھے کچھ بتایا کیوں نہیں؟“ وہ اسے چپ کر دار رہا تھا، درد کے تاثرات چہرے پہ آگئے تھے۔

”میری غلطی تھی کہ تینور ٹھیک ہو جائے گا، پاپا اور تم بھی تو اک مرد ہو جو میری حوصلہ افزائی کرتے ہو، مگر میں بھول گئی تھی کہ ہر مرد کا ظرف الگ ہوتا ہے۔“ آنسوؤں کو خشک کرنی وہ سرخ چہرہ لئے سامنے تھی۔

”میں تینور بھائی سے بات کروں گا، مجھے ان سے اتنی کچھ ہی پن کی امید نا تھی۔“ وہ عزہ کی افسردگی دیکھ کے افسردہ تھا، ہر گھڑی اپنی شرارتوں سے بہن کو زچ کرنے والے سے بہن کی افسردگی برداشت نہیں ہو رہی تھی۔

”اس خیال کو بھی ذہن سے جھٹک دو۔“ اس نے سختی سے کہا، چہرے پہ افسردگی ضرور تھی مگر اس افسردگی میں نا جھٹکنے کا عزم تھا۔ ”مگر اتنا عرصہ گئی رہی، تم ان سے انج ہو

گئی تھیں۔“ عزہ نوین کی اذیت وہ محسوس کر رہا تھا کہ وہ اس لمحے درد کے کس سراوچ پہ ہوگی۔

”جو شخص میری ذات سے جڑی چیزیں پسند نہیں کرتا اس سے تم کیا بات کرو گے، آج اس کے کہنے پہ میں اپنی فیلڈ چھوڑ دوں کل..... وہ کچھ اور چھوڑنے کو کہے، تب کیا کروں؟ جو انسان شخص آزادی کے خلاف ہے اس سے کیا بات ہو سکتی ہے، تم اور میں کسی کی تنگ نظر کو دور نہیں کر سکتے۔“ اس کی جامع بات پہ آریان عزیز کچھ بول نا سکا کہ اس کی دلیل سے انحراف نہیں کرتا تھا۔

”تعلق بوجھ بن جائے تو اسے توڑنا ہی بہتر ہوتا ہے، تم سب میری فکر مت کرو، میں ٹھیک ہوں یہ تو اندر کا غبار تھا جو اچھا ہوا بہہ نکلا، رونا مجھے اس بات پہ نہیں آیا کہ تینور مجھے سے دور چلا گیا، رونے کا مقام تو یہ ہے کہ جس شخص کو دیکھنا بھی نہیں چاہیے تھا میں اسے اپنا سمجھتی رہی، میں بظاہر عام سی ہوں مگر کسی کی جھوٹی سرخوشی کے لئے اپنی انا کو نہیں چل سکتی، بہتر ہے اس قصے پہ مٹی ڈال دو۔“ اس کے بے چلک اندازہ پہ آریان اسے دیکھ کر رہ گیا، کنگش کی جگہ چہرے پہ اک ٹھہراؤ اور سکون کھڑا ہوا تھا۔

پچھو بے حد شرمندہ تھیں، ماما پاپا خاموش تھے، بیٹی کا مان انہیں بھی عزیز تھا اور یوں تینور والا باب ہمیشہ کے لئے بند ہو گیا۔

تیری سوچ سے بلند ہیں ارادے اب میرے تو کیا مجھے سمجھ گامیں ہوں تیری سوچ سے ہے  
☆☆☆

عزہ نوین کو لے کے گھر میں ہر کوئی اداس تھا، وہ حتی امکان کو شاک تھی، کہ سب کو اس صورتحال سے نجات دلانے، تب ہی اس نے ماما، پاپا کے سامنے آریان اور فارہ کی شادی کی بات رکھ دی، ماما پاپا کو بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا، وہ

لوگ فارہ کے گھر رشتہ لے کر جانے کے پروگرام بنانے لگے، آریان کو عزہ کے دکھ کے بعد اپنی خوشی اچھی نہیں لگ رہی تھی، عزہ نے کلاس لی تو وہ جو ابھی فارہ کے گھر جانے سے انکاری تھا چپ ہو گیا۔

”میں چاہتا ہوں پہلے عزہ رخصت ہو۔“ آریان کی بات پہ سب کے دل سے ہوک سی اٹھی تھی۔

”کوئی نہیں، نا تم کیوں چاہتے ہو مجھے رواجی نند کا کردار ادا کرنے کا موقع نا ملے، ویسے بھی تم بڑے ہو اس لئے پہلے تنہا رہی ہوگی اور ہم کل جارہے ہیں فارہ کے گھر، میں اسے کال بھی کر چکی۔“ پانچ منٹ کی بڑائی جتانے پہ آریان جو اسے لتاڑنے کا ارادہ رکھتا تھا، اس کا اگلا کارنامہ سن کر چپ رہ گیا۔

اگلے دن وہ سب فارہ کے گھر جانے کو تیار تھے، آریان ساتھ آنا نہیں چاہ رہا تھا مگر عزہ کے لتاڑنے پہ اسے آتے ہی مٹی۔

”نا پہلے تو دوست کے گھر کے پھیرے ختم نہیں ہو رہے تھے، ماما یہ ڈس راز پن کو بہت پسند ہے میں دے کے آتا ہوں، یہ بک اسے دینی ہے، صبح اس کا انٹرویو ہے، بلوشرٹ اس سے لینی ہے، بہت سوٹ کر رہی تھی اس پہ میں بھی سیم لوں گا اور اب ہمارے ساتھ چلتے بے شرم کو شرم آ رہی ہے، یہ بولو، نا وہ سارے پھیرے فارہ کے لئے تھے، پچھرا رازین کے کندھے پہ بندوق چلائی تم نے۔“ دونوں ہاتھ کر پہنکا کہ وہ اسے آڑے ہاتھوں لے رہی تھی، ماما پاپا آریان کو بے چارگی سے سر سمجھاتے دیکھ کر ہنسنے لگے، پہلی بار اس کے پاس عزہ نوین کو لایا جواب کرنے کے لئے لفظ نہیں ہے، نا چاراس نے اٹھنے میں ہی عافیت جانی، ”اب ذرا بننے سنورنے میں نا تم نا لگانا،

سرسایوں نے بوجھ دیکھ رکھا ہے۔“ وہ چیخنے سے بعض نا آئی، آریان دیکھ لوں گا والے تاثرات کے ساتھ کمرے میں چلا گیا تھا، وہ اس کی بولتی بند ہونے پہن پڑی، اس کی ہنسی پہ ہنسا، پچا آسودہ تھے، مگر آریان شاید مطمئن نا تھا، تب ہی باہر لان میں رازین کے ساتھ بیٹھے ہوئے وہ غائب دماغی کا شکار تھا، اندر سب رشتے کی بات کر رہے تھے، رازین سمیت سب نے ان کی کال پہ خوش دلی سے آنے کی دعوت دی تھی اور اتنی ہی عزت کے ساتھ انہیں خوش آمدید کہا تھا مگر آریان کی جھپٹ پہ رازین کو تشویش ہوئی۔

”اتنی پینشن کس لئے بھائی، ریجنٹک ہونے کا خوف ہے۔“ رازین اس کا بہت اچھا دوست تھا، اس کے ہر موڈ سے واقفیت رکھتا تھا، رواجی بھائیوں کی طرح اس نے بہن کو پسند کرنے پہ کوئی ناک منہ نہیں بنایا تھا، اسے فارہ کے چہرے کی خوشی نظر آ رہی تھی، آریان بہترین انتخاب تھا پھر وہ کیوں نام نہاد غیرت دکھا کر بہن کی خوشی ملیا میٹ کرتا۔

”ارے نہیں۔“ آریان پھیکے سے ہنسا۔

”پھر کیا وجہ ہے اڑاسی کی؟“ دوستی کے باوجود آریان نے اس سے بھی گھریلو باتیں شیر نہیں کی تھیں مگر اب چونکہ رشتے دار ہی بھی ہونے جا رہی تھی کچھ اس کی زود رنجی بھی جو وہ کہہ گیا۔

”بس عزیزی کی وجہ سے ذرا ڈسٹرب ہوں، اس لئے کچھ اچھا نہیں لگ رہا۔“ اس نے لب بلیج کے چیخ سے پشت لٹائی، رازین چونک گیا۔

”کیا ہوا عہہ کو؟“ دل کا حال چھپا کر اس نے سرسری لہجے میں استفسار کیا، وہ کسی اور کی امانت ہے یہ جان کر اس نے اس نظر ڈالنا تک

چھوڑ دیا تھا، ابھی بھی وہ آئی بیٹھی تھی اور وہ آریان کے ساتھ باہر آ بیٹھا تھا کہ اس پہ نظر پڑ گئی تو کہیں وہ کمزور پاؤں پڑ جائے۔

”اس کی منگنی نوٹ مئی، تیور بھائی کو اس کا لکھنا پسند نہیں تھا، بس اتنی فضول بات یہ رشتہ ختم ہو گیا، پچھو کہہ رہی ہیں وہ تیور بھائی کو سمجھائیں گی لیکن عزیزی بعد ہے کہ وہ کبھی تیور سے کوئی رشتہ نہیں رکھے گی، عزیزی کا فیصلہ درست ہے لیکن اس کے لئے دیکھی ہیں ہم سب، جلد ہی اچھا رشتہ مل جائے تو یہ گلٹ کچھ کم ہو۔“ آریان سنجیدگی سے کہہ گیا، رازین کو اپنے کانوں یہ یقین نہیں آ رہا تھا، اس غیر متوقع خبر نے جیسے اس کی گویائی چھین لی تھی۔

”کب ہوا یہ سب؟“ اس کی پھنسی پھنسی آواز نکلی۔

”یہ ہی کوئی پندرہ دن پہلے۔“ وہ سست تھا۔

”تم نے مجھے بتایا نہیں۔“ دل میں اک سکون سا اثر نا جا رہا تھا، بظاہر گلہ کیا۔

”کیا بتا یا، کوئی خوشی کی خبر ہو تو بتاتا بھی اچھا لگوں۔“

”تمہارے لئے نا ہو، مگر میرے لئے تو بے حد خوشی کی خبر ہو سکتی تھی۔“ رازین کے لبوں پہ مٹتی خیر مسکراہٹ آ گئی۔

”مطلب؟“ آریان چونک کر اس کے لبوں پہ پھیلی مسکراہٹ پہ کچھ الجھ سا گیا۔

”پہلو شاک مجھے پکک پہ لگا تھا یہ جان کر کے عہہ تیور سے انگیڑ ہے اور دوسرا اچھی کہ منگنی نوٹ مئی، لیکن دونوں کے احساسات مختلف ہیں۔“ آریان قیصر سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”اگر تمہاری اجازت ہو تو میں اندر جا کر ماما کو کہہ آؤں کہ اک کی بجائے دو رشتے فاضل کر دیں، اگر تمہیں لگتا ہے کہ میں تمہاری عزیزی کے

لئے موزوں ہوں تو، کیا میرا رشتہ قابل قبول ہے؟“ رازین بظاہر جھجکتا ہوا لیکن بہت اعتاد سے کہہ گیا، اک پہل کو تو آریان بھی شاکد رہ گیا، اگلے ہی پہل اس کے چہرے سے خوشی چھلک رہی تھی۔

”اوڈ فر سوچ کیا رہا ہے بھاگ کے چلا۔“ اور رازین نے دائمی اندر کی طرف دوڑ لگا دی تھی اور اگلے ہی لمحے ماما کو باہر لا کر رازین نے انہیں ساری بات سمجھا دی، اب دونوں کا باہر بیٹھنے کا موڈ بدل چکا تھا اس لئے اندر سب کے درمیان چلے آئے، رازین بخاری نے بھرپور نظر عہہ نوین پہ ڈالی بلو سوٹ میں گلابی گلابی ہوئی فارہ سے چپکی جانے کیا کیا کہے جا رہی تھی اور اس کی مسکراہٹ رکنے کا نام نہیں لے رہی تھی، بڑے ہال کے دوسرے کونے میں بیٹھے تھے۔

”گھر پہ تو مجھے کہا جا رہا تھا رواجی نند بننے کا موقع دو اور یہاں کون سی پٹی پڑھائی جا رہی ہے، میرے خلاف۔“ آریان نے اچانک سے کہا تو وہ دونوں چونک کر اسے دیکھنے لگیں، رازین بخاری کا خیال کر کے فارہ پہ تو سر جھکا گئی۔

”تم تو دیکھی سامنے بنا کر لان میں بیٹھے تھے اب کیا ہوا جو کھلے پڑ رہے ہو، بھی فارہ آپس کی بات ہے یہ اس رشتے سے کچھ خوش نہیں لگ رہا، لے کے بھی زبردستی آئی ہوں، آتے ہوئے ڈر رہا تھا۔“ وہ راز دانہ انداز میں دائمی فارہ کو پٹی پڑھا رہی تھی۔

”دیکھا میں کہہ رہا تھا یقیناً میرے خلاف بھکار ہی ہو گی۔“ آریان نے داد طلب نظروں سے رازین کو دیکھا جو اک ہاتھ سینے پہ ماندھے دوسرے ہاتھ کی انگلیوں سے لب دبائے مسکرا رہا تھا۔

”تو بہ کرو، مجھے کوئی خاص محنت نہیں کرنی

بڑی پیری ہر بات شروع کرنے سے قبل فارہ کہتی تھی، مجھے خبر ہے۔“ اپنی بات مکمل کر کے وہ زور سے ہنسی مچی، فارہ پچھیب کے سر جھکا گئی، آریان دونوں کو مصنوعی ہنسی سے گھورنے لگا۔

”تمہاری دال یہاں نہیں گلنے والی۔“ آریان نے مذاق اڑایا۔

”ہونہ، مجھے کالی دال کھلانے میں کوئی دلچسپی بھی نہیں۔“ اس نے نخوت سے ناک سیکڑی، دونوں بہن بھائی کی نوک جھونک سے مخطوط ہو رہے تھے۔

”تمہیں ماما بلا رہی ہیں۔“ سب کے ہنسنے اور فارہ کے چہرے پہ حیا کی سرخی دیکھ کر آریان نے اسے اٹھانا چاہا۔

”مجھ سے پنگا نا لودو نہ اتنے دور کی تاریخ رکھو اؤں کی کہ خوشامدیں کرتے پھرو گے۔“ اس نے کھلی دمگی دے دی، آریان پٹپٹا سا گیا۔

”بہت خوب بولتی ہیں۔“ بلوکر کے سوٹ میں ہم رنگ لائٹ اور ڈارک کبھی نیش کا دوپٹہ لے لے وہ موسم بہار کی نازک سی کٹی لگ رہی تھی، رازین بخاری کی ستاسی نظریں اسی پہ جمی تھیں۔

”حسن سماعت۔“ وہ ذرا کی ذرا مسکرا کر فارہ کی طرف متوجہ ہو چکی تھی، بڑے سنجیدگی سے کوئی بات کر رہے تھے اچانک سے ماحول میں سناٹا چھا گیا تھا، ان سب کی نظریں اور سماعت بڑوں کی محفل پہ لگ گئیں۔

”آریان تو ہم سب کو ہی بہت پسند ہے اور جب آپ کی ٹیلی اور آپ کے بچوں کی بات آتی ہے تو سوچنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، ہماری طرف سے رشتہ پکا ہے مگر۔“ رازین بخاری کے والد محو گفتگو تھے۔

”لیکن کیا؟“ پاپا کو تعجب ہوا۔

”آپ اسے خوش قسمتی کہہ لیں یا اتفاق مگر

جموٹ مت سمجھو گا، ہم آپ کے گھر خود اک عرض لے کر آنے والے تھے، مگر گھر سے کیا فرق پڑتا ہے، جب سب بیٹھے ہیں تو ہم بھی اپنی دلی خواہش بیان کر دیں۔“ رازین کے والد بہت سہولت سے گھٹگو کر رہے تھے۔  
”کیوں نہیں جناب!“ پپا نے حوصلہ افزائی کی۔

”برسوں سے چند گلیوں کے فرق سے رہے، اک دوسرے سے اچھی طرح واقف رہے، ہمیں آپ کی عزہ بہت پسند ہے ہمارے رازین کے لئے مگر پچھلے دنوں خبر ہوئی تھی کہ آپ لوگوں نے منگنی کر رکھی ہے اور اب جب منگنی نہیں رہی تو ہم اسے اللہ کا انعام سمجھیں گے کہ آپ ہمیں اپنی بیٹی سوئپ دیں۔“ سب ہی اک لٹے کے لئے شاکر رہ گئے تھے، رازین اور آریان تو مسکرا رہے تھے، فار یہ بھی چند ثانیے کو تھیر رہی، عزہ نوین نے خود سے ذرا فاصلے پہ بیٹھے رازین بخاری کو بے ساختہ دیکھا تھا اسے خود کو دیکھتا پا کر اس نے رخ پھیر لیا تھا۔  
”وٹہ سٹہ۔“ ماسکس قدر متشکر نظر آ رہی تھیں۔

”آپ کسی بری سوچ کو ذہن میں نہ لائیں، تاہم ایسے لوگ ہیں تاہم ہمارا مزاج ایسا ہے۔“ رازین کی ماحرارتے سلی دی تو ماسکرا کے رہ گئیں۔

”تو پھر ہم ہاں سمجھیں؟“ رازین کے پپا زید تھیلی پر سرسوں جمانے کو بیٹھے تھے۔

”بہتر ہو گا ہم اپنی بیٹی سے بھی اک بار بات کر لیں۔“ پپا کے کہنے پہ سب نے ہاں ملائی، عزہ کو بھی کچھ سکون ملا ورنہ بڑوں کے انداز سے تو لگ رہا تھا ہاں کر کے ہی اٹھیں گے، وقت رخصت رازین بخاری کی نظریں اسی پہ جمی تھیں۔

☆☆☆

اک شام ہوئیں ان سے نظر عام سی باتیں اور شہر میں جہ چہ ہے ذرا اور طرح کا سب نے اسے مجھے میں ڈال دیا تھا، آریان کا دوست اور فار یہ کے بھائی کی حیثیت سے زیادہ اس نے رازین کو سوجا نہیں تھا، سب کی پسندیدگی کا گراف دیکھ کر وہ رازین بخاری کے متعلق کوئی بھی رائے دینے سے قاصر تھی، وہ ابھی ان جمیلوں میں پڑنا نہیں چاہتی تھی، حقیقتاً تیور جو کزن اور مگھیر تھا، اس کا اصل روپ دیکھ کر وہ مردوں سے کچھ خائف سی ہو گئی تھی، برسوں ساتھ رہنے کزن کی ذہنیت کھلنے میں دیر لگی تو وہ ابھی کو ایسے جانچ سکتی تھی، وہ ماسکس کو انکار ہی کر دینا چاہ رہی تھی مگر ان سب کے کھلے چہروں نے اسے چپ رہنے پہ مجبور کر دیا، وہ بعد میں اپنی سوچ کو کھلی جامہ پہنانے کا سوچ کر لکھنے کے لئے پیپر پین لے کر بیٹھ گئی، مگر ہزار کوشش کے بعد بھی جب اک لفظ بھی نالکھ سکی تو مجھٹا کر اس نے پیپر اور پین کو سائڈ پر ہی رکھ دیا۔

”ہم لڑکیاں دردتی ہیں، احصات لکھتی ہیں، خواہشات بتی ہیں اور ہوتا کیا ہے، تیور جیسی سوچ والا انسان ان سب کو قدموں تلے روند کر ہمارے سروں پہ حکومت کرتا ہے، ہمارے تن من کی چیز کے کچلنے کا ملال نہیں ہوتا، میں مرد ہوں، میں تمہارا شوہر ہوں کہہ کر ہم لڑکیوں کو ہمارے درد پہ رونے بھی نہیں دیتا، موت تو جانے کس عمر میں آتی ہے مگر لڑکی تو اسی دن مرجاتی ہے جب اسے کوئی انسان نہیں سمجھتا، اس کے احساسات کا مان نہیں رکھتا۔“ آنسو بہت چپکے سے اس کے رخسار جھگو نے لگے تھے۔

مسلسل بچتے میل فون نے اس کا ارتکاز توڑا تھا، نہرا چنبی تھا، آنسو خشک کرتے اس نے

میل فون اٹھا کر کال ریسیڈی۔  
”السلام علیکم؟“

”عزہ! آپ رو رہی ہیں؟“ اس نے حتی المکان آواز میں بشارت سمو کر سلام کیا تھا مگر جواب میں انتہائی تشویش بھرا لہجہ اور اپنائیت سے پکارنے پہ وہ ٹھنک گئی۔  
”کون؟“ اس نے تھیر کو زباں دی۔

”رازین بخاری!“ اس کا دماغ بھک سے اڑ گیا، وہ اس کی کال کا گمان نہیں رکھتی تھی۔  
”کال کرنے کی وجہ؟“ اس نے ناگواری ظاہر کی۔

”کچھ خاص نہیں کانی دیر سے آپ کو بے چین دیکھ رہا تھا، نا ہی وجہ معلوم تھی نا آپ کے تاثرات سمجھ پا رہا ہوں، مجھے لگا آپ کی بے چینی کا محرک کہیں نا ہمیں میری ذات ہے۔“  
”اک منٹ مسٹر..... دیکھ رہا ہوں، مطلب؟“ اس کی بات کاٹ کر اس نے تھیر سے پوچھا۔

”ہماری چھتوں کے درمیان بہت زیادہ فاصلہ نہیں لیکن شام گہری ہو گئی ہے جس کی وجہ سے مجھے آپ کے تاثرات نظر نہیں آ رہے۔“ رازین جانے کب سے اسے نظروں کے نوکس میں رکھے ہوئے تھا اس کی بات کے اختتام پہ اس نے چاروں سمت نظر دوڑائی تھی، اسے نیم اندھیرے میں کوئی ہاتھ پلا نا نظر آیا تھا، لائٹ ٹالبا جان بوجھ کے بند رکھی گئی تھی، کہ اسے دیکھا ا جائے، خود اسے تو لائٹ آن کرنے کا احساس بھی نا تھا۔

”یہ کوئی اخلاقی فعل تو نہیں۔“ اس نے غٹکی لکائی۔

”معذرت چاہتا ہوں، لیکن پرانی عادت ہے، اتنی جلدی نہیں جائے گی۔“ اس نے

معذرت کرنے کے ساتھ معذوری بھی ظاہر کر دی، عزہ نوین کو اس کا ہر جملہ حیران کر رہا تھا۔  
”پرانی عادت۔“ وہ تھیر سے دہرا کے رہ گئی۔

”سب بتا دوں گا لیکن اس کے لئے آپ کو میرا بننا ہو گا۔“ وہ نرم لہجے میں دلی خواہش بیان کر گیا۔

”آپ مجھے بلک میل کر رہے ہیں؟ اور مجھے کیونکر دلچسپی ہونے لگی آپ کی کہانی میں؟“ وہ ٹھنکی۔

”آپ رائٹر ہیں اور رائٹر کو تو سنا ہے ہر کسی کی کہانی جاننے میں بڑی دلچسپی ہوتی ہے لیکن تو میری اسٹوری بھی لکھ ڈالیں، خوشی ہو گی مجھے۔“ وہ کلفتہ انداز میں کہہ رہا تھا، عزہ کے ماتھے پہ لکیریں بننے لگیں۔

”آریان کو سنا دیجئے گا میں لکھ دوں گی۔“ اس نے جان چھڑانا چاہی۔

”ہاں سنے کیسے کہہ رہی ہیں کہ لکھ دوں گی، اگر جو کہانی میں جان نا ہوئی، آپ جان چھڑا رہی ہیں۔“ وہ اس کی چوری پکڑ گیا۔  
”جی ایسا ہی سمجھ لیں۔“ اس نے کال ڈسکینکٹ کرنا چاہا۔

”عزیز کی پلیز، مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے۔“ اس سے پہلے کہ وہ کال کاٹ دیتی اس نے آریان کی طرح اسے مخاطب کیا اور جلدی سے کہا کہ مبادا دوسری بار کال پک نا کرتی تو اسے اسوئی ہوتا۔

”جی کہیں!“ وہ اکتائی ہوئی تھی۔  
”مجھے آپ سے شادی کرنی ہے اور صرف آپ سے ہی کرنی ہے، ورنہ کبھی نہیں کرنی۔“ اس کے لہجے کے مان پہ وہ چپ رہ گئی۔  
”آپ مجھے پریشر آئز نہیں کر سکتے۔“ اسے

لگا کہ وہ دباؤ کے لئے یہ سب کہہ رہا ہے۔  
 ”نہ ایسا نہیں ہے، میں صرف آپ کو اپنی زندگی کی اصل حقیقت بتا رہا ہوں، ورنہ آپ با اختیار ہیں اپنے فیصلے میں، ضروری نہیں کہ میری زندگی میں آپ کی اہمیت ہے تو آپ کی زندگی میں میری بھی ہو۔“ اس کے لہجے میں جانے کیوں اداسی در آئی تھی۔  
 ”اہمیت تو وقت کے ساتھ ہی نظر آتی ہے کے کتنی ہے۔“ اس کا لہجہ چہمتا ہوا تھا۔  
 ”کسی اور کے تناظر میں مجھے نا دیکھیں، مہربانی ہو گی۔“ وہ اس کے جملے کا پس منظر بھانپ گیا تھا، عذہ نوین اس کی صاف گوئی پہ جہاں دنگ رہ گئی تھی وہیں اسے آریاں پہ غصہ آیا اس نے یقیناً اسے رشتہ ختم ہونے کی اصل وجہ تیور کی تنگ نظر بنائی ہو گی۔

”I am in love with you“  
 وہ بہت دھیمے سروں میں کہہ گیا تھا، عذہ نوین کے کان سانس سانس کرنے لگے، کال کٹ چکی تھی، عذہ نوین نے بے ساختہ رخ موڑ کر اس کی چہمت کی طرف دیکھا تھا، وہاں اک ہیولہ نظر آیا، پھر وہ ہیولہ منظر سے غائب ہو گیا، لیکن عذہ نوین اپنی جگہ پہ ساکت رہ گئی۔

بڑے سنبھے  
 مجھے الجھا گیا کوئی

☆☆☆

جہاں رازین بخاری کا جملہ رات بھر گونجتے رہے وہیں اپنے پیاروں کے چہرے نگاہوں میں بھرتے رہے جو اس رشتے کے بعد سے کھل سے گئے تھے، صبح جب ممانے اس کی رائے پوچھی تو اس نے ہاں کر دی، شادی تو کرنی ہی تھی، ساری زندگی وہ اپنے پیاروں کو اپنی وجہ سے دکھ نہیں دیکھ سکتی تھی، تیور کی حرکت کے بعد سب جس

طرح مجرمانہ خاموشی کا شکار تھے یہ دیکھ کر اسے تکلیف ہو رہی تھی، دل میں ہزار ڈر لئے اس نے رازین بخاری کے نام کی انگلی پھینکی۔

☆☆☆

وہ نا فرشتہ ہونا فرشتے جیسا ہو مجھے تلاش ہے جس کی وہ میرے جیسا ہو میرے خلوص کو پہچانتا ہو کالی ہے وہ کوئی بھی ہو کہیں بھی ہو کیسا ہو ”نا میں بہت بلند دباؤ تک دعویٰ کروں گا کہ تمہارے لئے چاند تارے توڑ لاؤں گا اور نا تمہیں کسی دھوکے میں رکھوں گا، جو ہے جیسا ہے وقت خود تمہارے سامنے مجھے ثابت کر دے گا، نا ہی میں تم سے کبھی ماضی کے حوالے سے کوئی بات کروں گا، کسی کی کم ظرفی کی بدولت تم میری خوش نصیبی بن کر میرے پاس موجود ہو، ہم بہت پہلے سے میری آرزوں میں سے تھیں مگر پلنگ والے روز حقیقت جان کر اک لمحے کو میرا دل چاہا تیور کو سمندر میں دھکا دے دوں، جب تم دونوں کی باتیں سنی تو دل سے صدا نکلی کاش تیور ہمارے درمیان نہ ہو اور شاید وہی لمحہ قبولیت کا تھا یا تم پہلے ہی میرے نصیب میں لکھی جا چکی تھیں اور ہمیں ایسے ہی ملنا تھا، میں ماضی کے گرداب میں پھنسنے والا شخص نہیں ہوں، مجھے حال میں خوش رہنا اور مستقل کو خوش گوار بنانا اچھا لگتا ہے، ہمارا ماضی کیا تھا مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں، پچھلے اس میں لاکھ تیور ہوں، میرے لئے حال اہمیت کا حامل ہے، جس میں تم میری ہو، میری اپنی۔“ اس کے ہاتھوں نے نرمی سے دباؤ ڈال کر وہ جذبات کی سچائی کے ساتھ گویا تھا۔

پچھلے پختے فار یہ اور آریاں رشتہ ازدواج میں منسلک ہو گئے تھے اور آج وہ دونوں کتنی ہی دیر سے وہ اس پہ نظریں جمائے اس کا خواب

ناک لہجہ سماعت کے ذریعے دل میں اترتا محسوس کر رہی تھی۔

☆☆☆

ہماری آنکھ کے رستے ہمارے دل تلک اترد یونہی شاید کھلے تم پر ہمیں تم سے محبت ہے اور آنے والے دنوں میں رازین بخاری نے واقعی اپنا کہا سچ کر دکھایا تھا، اس پہ یقین کرنے کے باوجود کہیں نا کہیں وہ خوفزدہ ضرور تھی۔

”عزیز! اتم نے کتنے دنوں سے کوئی تحریر نہیں لکھی؟“ چائے کے سپ پیتے وہ استفسار کر رہا تھا، اپنے کپ میں چینی ملا تے ہوئے اس کا تھک لکھا گیا۔

”یہ ہی کوئی چار پانچ ماہ سے، کیوں؟“ بتا کر وہ ڈرتے ڈرتے پوچھ رہی تھی مٹی مومن پریڈ کے بعد سرال کی چارج شیٹ سنبھالنے کے بعد ہ بھول ہی گئی تھی کہ وہ اک رات سڑ بھی ہے، لاشعور اں ڈر بھی کنڈلی بارے بیٹھا تھا، بڑی ڈبل سنڈ ڈی سوچ ہو گئی تھی، اب بھی وہ سبھی نظروں سے رازین بخاری کو دیکھ رہی تھی۔

”آریاں بتا رہا تھا گھر کے نمبر یہ کئی بار مالوں سے کال آچکی ہے، نئی تحریر کی فرمائش کر ی تھیں۔“

”جی۔“ وہ کہتی بھی تو کیا۔

”اس آری کے بچے کو شادی کے بعد بھی مل نہیں آئی، فار یہ سے کہوں گی وہ تھوڑے صبح رذرات کو سر پہ مارے، مجھے بتا کے چین نہیں اٹھا کہ رازین کو بھی بتا دیا، ملے ذرا، شادی ہو لی تو کیا اس کی عزت بڑھ گئی۔“ وہ منہ بسور کر لی۔

”اگر آریاں کی عزت افزائی پلان ہو گئی ہو میری بات کا جواب دے دو۔“ اس نے اس

کے چہرے کے سامنے چٹکی بجاتی۔  
 ”آپ کو کیسے خبر ہوئی؟“ کھسا کر وہ بال سینے لگی۔

”یہ جو تمہارے چہرے پہ “بتاؤں گی“ والے ایک پریشن ہیں نا ان سے۔“ وہ ہنسا تو وہ بھی مسکرا دی۔

”ایسا کرو جلد ہی کوئی اچھی سی تحریر لکھ ڈالو۔“ وہ کہہ رہا تھا اور وہ بھونکی طرح اس پہ نظریں جمائے بیٹھی تھی۔

”دو دن پہلے شیو بنائی تھی، بکھڑا دیکھنے لائق ہے؟“

”دھت۔“ اس کی شوٹی پہ شرمیں مسکراہٹ کے ساتھ سر جھکا گئی، رازین نے اس کا ہاتھ تمام کر اسے قریب بٹھایا۔

”دھت سے کام نہیں چیلے گا، جلدی سے کچھ اچھا سا لکھ ڈالو، تمہاری کئی تحریریں میں پڑھی ہیں، یقین نہیں آتا دھان، پان سی لڑکی اتنا اچھا لکھ سکتی ہے، تمہاری آخری تحریر اب تک کی سب سے بیسٹ تھی امیزنگ۔“ وہ تو صلی انداز میں کہہ رہا تھا اور اس کی نظروں میں وہ منظر گھوم گئے جب اسی تحریر کے بعد وہ کم ظرف شخص اس سے رشتہ توڑ گیا تھا۔

”تم پلاٹ سوچو شاہاش۔“ وہ اس کی ہتھیلی کو نرمی سے دبا کے نوں سننے چلا گیا تھا۔

”رازین بخاری! کیا یہ ہی تمہارا اصل روپ ہے، کہیں میں پھر بے اعتباری کی کھائی کی طرف تو نہیں بڑھ رہی۔“

وہ اس بچے کی طرح ہو گئی تھی جو نانا چلنا سیکھتا ہے اور گر جاتا ہے اٹھتا ہے اور پھر گرنے کے خوف میں جھٹکا ہو جاتا ہے۔

☆☆☆

تیری آنکھ میں اگر میں ٹھہر سکوں



مجھے مختصر سا قیام دے  
شاور لے کر وہ باہر نکلی تو رائٹنگ ٹیبل پر  
افسانہ پڑھتے رازین کو دیکھ کر قدم رک سے گئے  
چہرے پہ گہری سنجیدگی لئے وہ افسانہ پڑھ رہا تھا،  
دھڑ دھڑ کرتے دل کے ساتھ وہ آگے بڑھی تھی،  
رازین بخاری نے پلٹ کر اسے دیکھا۔  
”سوری تم تمہیں نہیں تو بلا اجازت پڑھنے کی  
گستاخی کر بیٹھا، بلیوی میرا پڑھنے کا ارادہ نہیں  
تھا، چند لائن بڑ کے انٹرسٹ بڑھ گیا تو۔“ انداز  
ایسا تھا جیسے کوئی معصوم بچہ چوری کرتے ہوئے  
پکڑا گیا ہو، اس کے کان تو کسی دل چیر دینے  
والے فقرے کے منتظر تھے مگر وہ تو دوسری بات کر  
رہا تھا۔

”غیروں جیسی بات کیوں کر رہے ہیں،  
آپ کو اجازت کی ضرورت تو نہیں ہے آپ کو حق  
حاصل ہے مجھ سے وابستہ تمام چیزوں پر۔“ اس  
نے مان بڑھایا۔  
”نوازش میم، اب ذرا یہاں قریب آ کے  
بیٹھو، ذرا شبیہ شبیہ چہرہ دیکھ لوں۔“ کلائی تھام  
کے ساتھ بٹھالیا، پانی بوندوں کی شکل میں چہرے  
پر پڑے تھے۔

”بڑی خوبصورت ہوتی جا رہی ہو۔“ اس  
نے سراہتی نظروں سے کہا۔  
”آپ کی محبت کا اعجاز ہے۔“ وہ جھینپ  
گئی۔

”تم نے افسانہ لکھنے کے بعد پڑھا؟“ موڈ  
بدل کے پوچھ رہا تھا۔

”جی!“  
”تھیم تو خاصی اچھی ہے، لکھا بھی خوب  
ہے تم نے لیکن اس کے ابتدا میں اگر تم عازہ کو  
خوارے میں دکھاؤ تو زیادہ اچھا نہیں ہوگا؟ وہ  
اک دم سے چپٹی ہوئی بازی ہارنی لگے گی اور پھر

اس کے عمل پہ اسے سزا بھی تو ملنی چاہیے کیوں؟“  
مشورہ دے کر پوچھ رہا تھا۔

”میں نے کچھ غلط کہہ دیا۔“ اسے ایک ٹک  
اپنی طرف دیکھتے پا کر استفسار کرنے لگا، اس نے  
نکی ٹیبل پر ہلایا۔

”ٹھیکس آپ نے میری الجھن سلجھا دی،  
تفصیلی تو مجھے بھی لگ رہی تھی، مگر کچھ سمجھ نہیں آ رہا  
تھا، آپ نے جو نائنڈی کی واقعی ایسا کر کے تحریر  
میں جان آ جائے گی، میں آری کو کال کر کے  
افسانہ سنانے ہی والی تھی، وہ نقص نکال کر تحریر کو  
سنوار دیتا تھا۔“ وہ پرسکون انداز میں شکر گزار  
تھی۔

”آریان کیوں؟“ ڈپٹ کے پوچھا تو  
ہر اسان نظروں سے وہ اس کے بدلے موڈ کو  
دیکھنے لگی۔

”میں کیوں نہیں، آری کے فرائض میں  
احسن طریقے سے نبھانے کو تیار ہوں، تو مجھے یہ  
جواب مل رہی ہے نا؟“ اس کے دلوں شانے  
تھام کر اسے سامنے کھڑا کر کے شرارتی مسکراہٹ  
کے ساتھ کیا تو اس کی سانس بحال ہوئی۔

”بہت برے ہیں آپ۔“ عزم کا مکا اس  
کے شانے کو چھو گیا۔

”اف میرا شانہ۔“ کراہ کے کھڑا ہو گیا۔  
”کیا ہو، زور سے لگی؟“ گھبرا کے اس کا  
شانہ چھونے لگی۔

”اتنی زور سے لگی ہے کہ اب چائے پی کے  
ہی درد میں افادہ ہوگا، تم ٹائٹ افسانہ مکمل کرو  
میں چائے لے کر آتا ہوں۔“ وہ اسے کرسی پہ بٹھا  
کر بچن کی اور بڑھ گیا تھا عازہ نوین مسکرا کر اس کی  
پشت کو نظر بھر کے دیکھتی رہ گئی۔

☆☆☆  
اگر الفاظ میرے بس میں ہوں تو نا جانے کیا لکھوں

تجھ ہی کو ابتدا لکھوں تجھ ہی کو انتہا لکھوں  
سرسال نام کی کوئی ڈراؤنی بلا اس کے گلے  
نہیں پڑی تھی، رازین بخاری ہمایا روایتی ساس  
سرس نہیں تھے، رازین سے چھوٹی فاربیہ بھی جو سز  
آریان کے عہد سے پہلے فائز ہو چکی تھی، اس سے  
چھوٹی ادیبہ بھی جسے کالج کمپیوٹر سے فرمت مل جاتی  
تو عزم کے ہی گرد لٹی تھی، یہ اس کا چھوٹا مگر محبتوں  
سے بھرا پراسرال تھا، کچھ عزم نوین کی ہمہ جہت  
فطرت بھی تھی جو جلد ہی سب اسی کے عادی ہو  
گئے تھے، فاربیہ نند اور بھادراج سے زیادہ دوست  
تھی۔

چونکہ چند گلیوں کا فاصلہ دلوں گھروں کے  
درمیان تھا، عموماً رات کو داک کرتے آریان اور  
فاربیہ چلے آتے تو کبھی دونوں چلے جاتے ہمایا  
لاکھ ماڈرن تھے، مگر اپنی روایتوں کو نہیں بھولے  
تھے، ان کی روایت کے مطابق شادی کے بعد  
لو کی اک سال تک ہر نیا چاند میکا میں دیکھتی تھی،  
تب فاربیہ یہاں اور عزم وہاں ہوتی تھی، ایسے  
میں رازین اور آریان جی کھول کر روایت بد  
دعا میں دیتے تھے، آج بھی وہ جانے کے لئے  
پکینگ کر رہی تھی اور وہ نکیہ کو میں دبوچے بیٹھا تھا  
جیسے اس رسم کو لاگو کرنے والے کی گردن ہو۔

”بھئی چاند ہی دیکھنا ہے نا، وہ تو ہمارے  
گھر سے بھی نظر آتا ہے، مت جاؤ۔“ وہ منہ  
لٹکائے اسے مسکرانے پہ مجبور کر گیا۔

”جی تب ہی آپ اپنی چھت سے ہماری  
چھت پہ نظریں جمائے بیٹھے ہوتے تھے۔“ اس  
نے کبھی چتوڑوں سے دیکھا جب سے خبر ہوئی تھی  
وہ اسے اکثر چھت سے دیکھا کرتا تھا اور وہیں  
سے محبت میں گرفتار ہوا تھا وہ اسے چھپتی تھی۔

”ہاں تو جب سامنے والی چھت میں چاند کا  
نکلا ہو تو کیوں نا دیکھتا۔“ وہ شرمندہ ہونے والا

کب تھا۔

”فاربیہ اور آریان بھائی آگئے ہیں۔“ ادیبہ  
اطلاع دے کے چھپاٹ سے چلی گئی، عزم نے  
بیک اٹھا کر کارپٹ پہ رکھا، آریان فاربیہ کو  
چھوڑنے اور اسے لینے آیا تھا۔

”عزمہ ایا دل نہیں لگے گا۔“ وہ اتنی محبت  
سے بول رہا تھا، کہ خود اس کا دل جانے کا نہیں ہو  
رہا تھا، مگر بڑوں کی بات بھی ٹال نہیں سکتی تھی۔

”مجبوری ہے۔“ اس کی جذبے لٹاتی  
آنکھوں کا سامنا آسان نہیں تھا، وہ پلٹیں جھکا  
گئی، وہ اس کے دلوں ہاتھ تھام گیا، یہ بانکا جیلا

مرد اس سے دیوانوں کی طرح محبت کرتا تھا،  
جتائے بناء اس کی ہر بات جان لیتا تھا، وہ بھی پور  
پور اس کے عشق میں ڈوب چکی تھی۔

”اور کون سا اتنا دور جا رہی ہوں، چند  
قدموں کا فاصلہ تو ہے، جب دل ہوا آجائے گا۔“  
اس نے رازین بخاری کی اداسی دور کرنے کی  
کوشش کی۔

”بہلاؤسے کی گولی مت دو۔“ اس نے منہ  
بسورا۔

”چلیں۔“ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔  
”اللہ کرے میکہ میں اک دن بھی تمہیں  
نہین نا آئے۔“ اس عجیب و غریب بددعا پہ وہ ہنستی  
چلی گئی، وہ اس کے ساتھ لاؤنج تک آیا، جہاں  
فاربیہ اور آریان بیٹھے تھے۔

”یار یہ کس کم بخت نے چاند میکہ میں  
دیکھنے کی شرط رکھی تھی۔“ آریان نے رازین کو  
دیکھتے ہی ہانپ لی۔

”مجھے خبر ہوئی تو قصہ تمام بنا کر دیتا۔“ وہ  
خود ہلا بیٹھا تھا، دونوں مظلوم ہو رہی تھیں۔

”میکہ جانے کی کیا ضرورت ہے، انہیں  
سرسال میں ”چھٹا چاند“ نظر نہیں آتا۔“

”چھ فٹا چاند قدر کرے اسی لئے تو دوری بناتے ہیں۔“ آریان کی دہائی پہ فارسیہ نے آہنگ سے کہا تھا، عزہ نے بے ساختہ داد دی۔  
 ”دیکھنا تم مجھے بے حد مس کر دو گی۔“ وقت رخصت دھوئی کیا گیا۔  
 ”ابوس، کوئی نہیں۔“ اس نے جھٹایا اور اس کا کہا واقعی سچ ثابت ہوا۔  
 نئی کہانی لکھ رہی تھی، ہیر و سونٹ ویر کی دنیا کا بے تاج بادشاہ ہوتا ہے، مسئلہ یہ تھا کہ سونٹ ویر سے متعلق اس کی کوئی معلومات نہیں تھی، رازین بخاری کی فیڈلر تھی، وہی ہیلپ کر سکتا تھا، کافی دیر گوگل کر کے بھی خاص معلومات ناپی تو اس نے اسے فون کر دیا۔  
 ”ادبو، جان جانا آپ ہیں۔“ سرعت سے فون ریسیور کے چپکٹی آواز میں کہا۔  
 ”کیوں کسی اور کی کال کا انتظار کر رہے تھے۔“ اس نے چوٹ کیا۔  
 ”میاں پہ اتنی بے اعتباری، صد افسوس۔“ وہ دھکی ہوا۔  
 ”مرد تو مرد ہے نا۔“ چڑانے لگی۔  
 ”اتنی رات گئے تم نے مردوں کی خصوصیات بتانے کو فون کیا ہے؟“ وہ چڑ گیا۔  
 ”نہیں آپ سے کام تھا۔“ وہ مدے کی طرف آئی۔  
 ”آہ رہا، اب بیوی بھی کام سے یاد کرنے لگی، کیا زمانہ آگیا ہے، مطلبی دنیا۔“ اس نے ٹھنڈی آہ بھری۔  
 ”میں کوئی مطلبی مطلبی نہیں ہوں۔“ وہ برا مان کر کال کاٹ گئی اور پھر تیل بجتی رہی اس نے کال ریسیو نہیں کی۔  
 ”مجھے نہیں پتہ یہی معلومات، خود ہی کسی ناکسی طرح لکھ لوں گی۔“ کمرے میں لیفٹ رائٹ

کرنے وہ ہڑ بڑا رہی تھی۔  
 ”لگی ہو گی محترم کو بھوک، اس لئے میری یاد آ رہی ہے، ہیلپ کرنے کو کہا تو جواب آیا میں سونٹ ویر کی الف ب بھی نہیں جانتا، اپنے میاں جی کو پکڑو، سارے مرد اک جیسے ہوتے ہیں، شادی کروا کے بھائی بدل گیا اور میکہ آجاؤ تو میاں جی کی آنکھیں بدل جاتی ہیں، آ رہی ہوں۔“ دروازے پر دستک ہو رہی تھی، آریان کی موجودگی محسوس کر کے زور زور سے بڑبڑاتے ہوئے اس نے دروازہ دیا۔  
 ”کیسی ہو سوئیٹ ہارٹ۔“ سامنے کھڑے رازین بخاری کو دیکھ کے حیران رہ گئی۔  
 ”مانا پینڈم ہوں مگر تم جب مجھے دیکھ کے فریض ہو جاتی ہو تو مغرور ہونے لگتا ہوں۔“ وہ شرارتی مسکراہٹ سجا کر اسے تمام گیا تھا، عزہ نوین نے ہوش میں آتے اس کا ہاتھ ہٹایا اور پلیٹ کے کمرے میں آگئی، اندر آکر اس نے بھی دروازہ بند کر دیا۔  
 ”ناراض ہو؟“ اس کے پہلو میں بیٹھ کر استفسار کرنے لگا۔  
 ”بولو نا۔“ وہ کچھ نہیں بولی تو شولڈر سے ٹھوکا دیا، الجھے سلجھے ہال اور مسئلے ہوئے کپڑوں میں بھی بہت اچھی لگ رہی تھی۔  
 ”نہیں پرے، مطلبی مطلبی بول کے چلے آئے۔“ وہ زور دے بیٹھی تھی۔  
 ”تمہیں چمڑ رہا تھا، کیا خبر تھی میری نازک مزاج بیوی برا مان جائے گی، تم بھی مجھے کہہ کر حساب برابر کر لو۔“ وہ اس کے گود میں سر رکھے لیٹ چکا تھا۔  
 ”مجھے کچھ نہیں کہنا۔“ اس نے جان چمڑائی۔  
 ”تمہاری محبت میں رات کے تین بجے کے

واک کر کے تمہارے گھر کا مین گیٹ پھلانگ کر تم تک آیا ہوں اور تم ہو کہ۔“  
 ”کوئی دیکھ لیتا تو، اتنی رات کو آنے کی کیا ضرورت تھی۔“ فکر مندی سے پوچھ رہی تھی، حلقی اسے دیکھتے ہی بھاگ گئی تھی۔  
 ”تم نے فون جو کیا تھا خبر تھی تمہاری تفتی نا ہوئی تو صبح تک جاگتی رہو گی۔“ وہ محبت سے کہہ رہا تھا۔  
 ”مجھے تو نام کا دھیان ہی نہیں رہا تھا، آپ سوئے نہیں تھے۔“ اسے بخور دیکھتے ہوئے بوجھ رہی تھی، وہ کہیں سے بھی سویا ہوا نہیں لگ رہا تھا۔  
 ”تم یہاں ہوئی ہو تو نیند کس کم بخت کو آتی ہے۔“  
 ”ڈائلاگ لکھتی میں ہوں، مگر آپ بولتے زیادہ اچھا ہیں۔“ وہ ہنسی۔  
 ”میرے جذبات کو ڈائلاگ کہہ رہی ہو۔“ اس نے پشت پر پھرے اس کے ہال کھینچے۔  
 ”یہ بتاؤ کون سی اسٹوری پھنس گئی ہے۔“ اس کے ہاتھ تمام گیا۔  
 ”آپ کو کیسے خبر؟“ وہ حیرت سے دیکھنے لگی، ابھی تو اس نے کچھ کہا بھی نہیں تھا۔  
 ”ویری ٹی تمہاری خبر کیا مجھے لی بی بی یا سین این سے سننے کی ضرورت ہے۔“ چپٹ لگا کر وہ پوری تنجیدگی سے اسے انفارمیشن دیتا رہا اور وہ نوٹ کرتی چلی گئی۔  
 ”یار کچھ کھانے کو ہے تو لے آؤ۔“ کام سے فارغ ہو کر اس نے سر بیڈ کی پشت سے ٹکا دیا۔  
 ”ڈز نہیں کیا تھا آپ نے؟“ پیپر اور بین سیٹ کر جگہ پر رکھتی وہ نشوونما سے پوچھ رہی تھی، اسے اپنی بد اخلاقی پہ افسوس ہوا، اس نے جھوٹے منہ بھی خاطر داری کا نہیں پوچھا تھا بس

اپنے مسئلے کے حل پہ خوش ہوتی رہی۔  
 ”اکیلے جی نہیں لگتا۔“ اب آنکھ کھول کر بولا تو اک مکا اس کے شانے پہ جڑ دیا۔  
 ”بہت فضول ہیں آپ۔“ وہ کچن میں چلی آئی وہ بھی ساتھ ہولیا۔  
 ”صبح جب گھر والوں کو آپ کی آمد کی خبر ہو گی تب کیا بتائیں گے۔“ کھانا سامنے رکھتے ہوئے شوخی سے چڑا رہی تھی۔  
 ”کہہ دوں گا، میری بیوی نے فون کر کے بلایا ہے۔“  
 ”جی جی بتائیں آپ اس خیال سے آئے تاکہ ساری رات مجھے نیند نہیں آئے گی۔“ بہت محبت سے وہ اسے دیکھ رہی تھی، اب تک اس نے رازین بخاری کو جتنا جانا تھا اس میں وہ بہت محبت کرنے والا شوہر تھا، خیال رکھنے والا ساتھی تھا۔  
 ”ہوں، خبر ہے نا تمہارے پاگل پن کی، تم جاگتی رہتیں تو میں کون سا سو سکتا تھا، اس لئے چلا آیا، منہ کھولو، مجھے خبر ہے تم بھی بھوک ہو۔“ اس کے صبح قیاس پہ وہ اس کا نوالہ والا ہاتھ تمام گئی جو اس کی طرف بڑھا ہوا تھا۔  
 ”آپ بہت اچھے ہیں رازی۔“ اس کا دل گداز ہو گیا تھا۔  
 ”ذرا پھر سے کہنا۔“ اس نے شرارتی مسکراہٹ سجا کر کہا اور وہ ہنس دی۔  
 ☆☆☆  
 ”فارسیہ اور ادیبہ کے ساتھ بیٹھی وہ کوئی پروگرام دیکھ رہی تھی، جب رازین آفس سے لوٹا۔  
 ”عزہ روم میں آؤ۔“ حکم بھرے لہجے میں بول کے وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا مگر گیا۔  
 ”بھائی کا موڈ خراب لگ رہا ہے۔“ ادیبہ نے اندازہ لگایا۔  
 ”تم جا کے دیکھو کیا کہہ رہے ہیں، ڈونٹ

وری۔" اس کے ہر اسماں چہرے کو دیکھ کے فاریہ نے ہاتھ تھپتھاپا۔

"اتنی دیر لگتی ہے لاؤنج سے کمرے میں آتے ہوئے۔" وہ غصیلے لہجے میں کہہ رہا تھا، وہ اس کا بدلہ رویہ ہی دیکھتی رہی۔

"اب دہاں کیا جم گئی ہو، یہاں آکر میرے جوتے اتارو۔"

"جی!" اس حکم شاہی پہ وہ اچنبھے سے اسے دیکھنے لگی۔

"اردو ہی لکھتی ہونا تو اردو سمجھ نہیں آ رہی۔" وہ ترش لہجے میں چلایا تھا، آگے بڑھ کر وہ اس کے جوتے اتارنے لگی۔

"موزے کون اتارے گا۔" اسے اٹھا دیکھ کر پھر دھاڑا، سراسیمہ ہو کے وہ موزے اتارنے لگی۔

"میرے کپڑے واش روم میں رکھو اور چائے کے ساتھ کچھ کھانے کو لاؤ، جلدی۔" حکم کی تعمیل کے لئے وہ کپڑے رکھ کر کچن میں چلی گئی۔

جب تک چائے بنی وہ ادھیڑ بن میں اس کے بدلے انداز کو سمجھنے کی کوشش کرتی رہی، سینڈویچ کے ساتھ چائے لے کر آئی تو وہ ناول سے سیلے ہال رگڑ رہا تھا، ناول سائیڈ پہ پھینک کر وہ ہالوں میں برش کرنے لگا۔

"ناول اٹھا کر جگہ پہ رکھو، کیا تمہیں اب یہ بتانا پڑے گا کہ کھڑکی کی کیا کرتی ہے۔" بنا کسی بحث و مباحثہ کے سانسے ناول کو اٹھا کر اسٹینڈ پہ رکھا، وہ ٹرے گھسیٹ کر اسے سامنے کر گیا۔

"یہ چائے ہے یا کھڑوا مشروب، اپنی ہیروئن کو تو بڑی گھر داری دکھاتی ہو، تھوڑی سی خود بھی سیکھ لیتیں۔" چائے کا سیپ لے کر اس نے کپڑے پہ پتخ سادیا، چائے جھلک کر ٹرے پہ

گر مچی، خفت کے احساس سے لبریز وہ اس کے لفظوں سے کئی جا رہی تھی۔

"یہ چائے انسانوں کے پینے لائق ہے، دیکھو ذرا۔" رازین بخاری نے غصے سے چائے کا کپ اس کی رائٹنگ ٹیبل پہ رکھا، چائے ٹیبل پہ بہہ مچی، کپ لڑھک چکا تھا، اس کا تازہ ترین افسانہ داغ دار ہو چکا تھا، بے ساختہ اس کی چیخ نکل گئی تھی، آنسو بھری آنکھوں سے وہ اس ظالم کا ظلم دیکھ رہی تھی۔

"چیخ بچ برا لگ رہا ہے، اوہو تمہارا تو افسانہ خراب ہو گیا۔" وہ پیپر اٹھا کر طائرانہ نگاہ ڈال کر اظہار افسوس کر رہا تھا، منگوں سے چائے کے قطرے ٹپک رہے تھے۔

"چند منٹے بچ گئے انہیں بھی داغ دار کر دیتے ہیں۔" رازین بخاری نے کپ میں بچی چائے صاف منگوں پہ گرا دی۔

"کیوں کر رہے ہیں آپ ایسا؟" شدت دکھ سے وہ چیخ پڑی۔

"میری مرضی۔" اس نے کمال لاہروائی سے کہا، عزہ لونوں کے آنسو بہنے لگے۔

"بہت افسوس ہو رہا ہے مجھے آپ کو اس روپ میں دیکھ کے۔" رنج و غم سے اس کی بری حالت تھی، دل اس کے بدلے انداز کو قبول کرنے کو تیار نہیں تھا۔

"اب تو اسی روپ کے ساتھ تمہیں ساری عمر گزارنی ہے، تھوڑا سا ڈرامہ تو میں نے اس لئے کیا کہ سب کی نظر میں اچھا بن جاؤں، اب جب ایسا ہو گیا ہے تو میں مزید یہ ڈرامہ جاری نہیں رکھ سکتا، تم کیا سوچ رہی تھیں مائے ڈیئر کہ میں تیور جیسا نہیں ہوں، یہ تمہاری غلط فہمی تھی، میں بہت پوزیسیو بندہ ہوں جو نہیں چاہتا اس کی بیوی کو کوئی دیکھے، کسی کی زبان پہ اس کا نام ہو،

اس لئے آج سے تم لکھنا دکھنا بھول جاؤ۔" اتنے بڑے دھوکے پہ اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں، رازین بخاری کو سمجھنے میں اس کی نظر دھوکا کھا گئی تھی۔

"آپ جیسا دوغلا شخص شاید ہی کوئی ہو، کتنی خوبصورتی سے آپ نے میری آنکھوں میں دھول جھونکا، اب جب آپ نے اصل صورت دکھا ہی دی ہے تو میں آپ کو بتا دوں کہ میں وہی کروں گی جو میرا دل چاہے گا، آپ جیسے گھٹیا....." اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی رازین بخاری کا ہر پور تماخو اسے خاموش کر گیا، گال پہ ہاتھ رکھے وہ سسکیاں لے رہی تھی اور پھر اس کی سسکیاں بند ہوتی چلی گئیں، اچانک وہ بیڈ پہ گر گئی تھی۔

"عزی۔" کوئی اسے پکار رہا تھا، ذرا کی را آنکھیں کھول کر وہ پھر بند کر گئی۔

"عزی..... عزی!" رازین بخاری نے سے بری طرح جھنجھوڑ دیا تھا، حواس تھوڑے حال ہوئے تھے، رازین بخاری کو خود پہ جھکا دیکھ کر وہ بے ساختہ گال پہ ہاتھ رکھ گئی۔

"کیا ہوا؟ کب سے آوازیں دے رہا تھا، ام رو رہی تھیں، سسکیاں لے رہی تھیں، کیا کوئی راؤنا خواب دیکھا ہے؟" فکر مندی سے وہ اس کے آنسو پوروں پہ چٹنے لگا۔

"وہ خواب تھا؟" اس کی دہلی سانس بحال ہوئی۔

"بتاؤ نا کیا خواب دیکھا ہے؟" وہ بے بن تھا۔

"بہت ڈراؤنا خواب تھا۔" وہ ہراساں ی۔

"ٹیک اٹ اپ، ایسے خواب کی کوئی نیقت نہیں ہوتی، تم پانی پیو۔" گھاس میں پانی

بھر کے گھاس اس کی طرف بڑھایا۔ "اب سو جاؤ۔" گھاس واپس رکھ کر اسے لٹا دیا۔

"مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے رازی؟" وہ خوفزدہ ہو کر اس کا بازو تھام گئی۔

"سو جاؤ، میں ہوں نا تمہارے پاس۔" اسے بازو کے حلقے میں لے کر دوسرا بازو اس کے گرد حصار کر گیا۔

☆☆☆

دیکھا ہے میں نے دن مجھے رات چاہیے سورج سے کوئی بہر نہیں مجھے چاند چاہیے رازین بخاری کی بات سن کر اسے گویا سکتہ ہو گیا تھا، عالم حیرانی میں اس کے کوٹ کا کارلر دبوچے وہ بے یقین اور استغاب بھری نظروں سے اس کے مسکراتے چہرے کو دیکھ رہی تھی، کارلر منٹھی سے آزاد کر کے وہ موصیے پہ جم گئی، قوت گویائی بھی کہیں کھو گئی تھی، آفس سے آ کے اس نے خبر ہی فریز کر دینے والی سنائی تھی، رازین بخاری کا دوست نمبر دن ڈائریکٹر مسج نے اس کے ناول پہ ڈرامہ ڈائریکٹ کرنے کی خواہش ظاہر کی تھی اور اب رازین اس کی مرضی پوچھ رہا تھا، وہ پاگل تھی جو انکار کرتی جب رازین بخاری اس کی پشت پہ آکھڑا ہوا تھا، اس نے ہاں کہہ دی تھی، اور ناول سے اسکرپٹ تک کے دقت طلب کام میں رازین بخاری نے اس کا بھرپور ساتھ دیا تھا، ناول بہت پسند کیا گیا تھا اور جب ان ہی کرداروں کو اسکرین پہ چلتے پھرتے دیکھا تو سب نے بے حد سراہا تھا، ریٹنگ ٹاپ پہ آ رہی تھیں، ڈرامہ ختم بھی نہیں ہوا تھا اور اسے مختلف چینلوں سے آفرز آنے لگی تھیں، ڈرامہ کے اختتام کے بعد اک شام رکھی گئی تھی، ڈرامہ بلا تک پر ہٹ گیا تھا، اسے بطور خاص انوایٹ کیا گیا تھا،

ہے انتہائی پرانی سینٹی لوگوں کے جھرمٹ میں آٹو گراف دیتی وہ کچھ دور بیٹھے رازین بخاری سے بار بار نظر ڈال رہی تھی، ہیں اس کے منہ کا زاویہ بڑھ تو نہیں رہا، ماتھے پر شکن تو نمودار نہیں ہونے لگی، لیکن وہ اس کی خوشی کو انجوائے کر رہا تھا، میزبان اس سے کچھ کہنے کو کہہ رہا تھا، مائیک تمام کر اس نے اک نظر اپنے من میت کی طرف دیکھا تھا اور لفظ دل سے نکلنے لگے تھے۔

”کتنی ہی گہری چوٹ لگی ہو عورت نے پکن میں روٹی بنا کر دو آٹو سہا کر ہی مہر کرنا ہوتا ہے، وہ مرد کی طرح ڈریک اور اسوک کر کے دکھ کا اشتہار نہیں بنائی، زندگی کے تلخ تجربات راہیٹر کا اثاثہ ہوتے ہیں، رانسر ہونے کا اک ایڈوانچ یہ بھی ہے کہ جو خود یہ بتتی ہے اسے ظلم میں خون جگر پلا کر ہم صفحہ قرطاس پہ رقم کر کے داد و تحسین پاتے ہیں ہمارے درد کو لوگ سراہتے ہیں، داد دیتے ہیں، رانسر ہونے کا یہ بڑا فائدہ ہے، لوگ لفظوں کا کرب تو جان لیتے ہیں، رانسر کے آنسو کی کو نظر نہیں آتے، مرد و عورت کی اس ٹکری میں عورت ازل سے اپنے نام و نشان کی جنگ لڑ رہی ہے، لیکن مردوں کی ہستی میں ظرف بڑا کرنا دل بڑا کرنے سے زیادہ دقت طلب ہے، عورت کی زندگی میں کچھ مرد محبت کی چادر اوڑھ کر آتے ہیں، اپنا بننے کی کامیاب اداکاری کرتے ہیں اور جاتے ہوئے عورت کا اپنا آپ بھی چھین کر لے جاتے ہیں۔“

”کچھ لوگ محبت میں صرف خود غرض ہوتے ہیں، ہر کچھ اپنی مرضی کا چاہتے ہیں، عورت کی ضرورت ان کی نظر میں اہمیت نہیں رکھتی، انہیں صرف اپنی بات کے رد ہونے کا غصہ ہوتا ہے، عورت کے مان کا خیال نہیں ہوتا، نا ہی اس کے لئے کچھ کرنے کا دم ہوتا ہے، نا عورت

کے برے حالات کو بدلنے کا گھٹس پایا جاتا ہے، ایسے لوگ بس عورت کو استعمال کرتے ہیں، جب تک ان کا دل چاہے، پھر تو نہیں اور سبکی اور نہیں اور سبکی، مردوں کی اس ٹکری میں عورت کی فقط اتنی سی خواہش ہے، اس کی شخصیت مسخ نا ہو، اس کی اپنی اک الگ پہچان ہو، صد شکر کہ مجھے اک ایسا من میت ملا جو میرا اثاثہ ہے، لیکن ہر عورت خوش قسمت نہیں ہے، بہت کم عورتیں ہیں جن کا میت ان کے من کو خوش رکھتا ہو اور جنہیں ایسا من میت نہیں ملتا وہ دل میں حسرت لئے ابدی سفر کو روانہ ہو جاتی ہیں۔“ اس کے لفظوں کے فسوں سے اک سحر طاری ہو گیا تھا، کئی اک نے جیکے سے آنکھوں کے گوشے صاف کئے، وہ کتنی سچائی سے عورت کا درد کرب بیان کر رہی تھی، واہی میں رازین بخاری کے ساتھ چلتے اس نے بے ساختہ اس کے قریب ہو کر اس کے شانے پہ سر رکھ دیا تھا، دل گداز ہو رہا تھا، وہ اس کی دلی کیفیت سے آگاہ تھا، تب ہی بنا کچھ کہے اس کے گرد حصار کر کے اسے لئے چلنے لگا تھا۔

اپنی تحریر سے کچھ ایسا اجماروں کا تجھے پڑھنے والے تیری تصویر بنا ڈالیں گے ☆☆☆

اتا کی جنگ میں ہم جیت تو گئے لیکن پھر اس کے بعد بہت دیر تک نڈھال رہے مسلسل کامیابیوں کے بعد ڈھیر سارے مبارک باد کے کارڈ اسے اپنے چاہنے والوں کی طرف سے موصول ہوئے تھے، یہ شعر بھی اک کارڈ پہ درج تھا، اس کے علاوہ کچھ اور لکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی تھی، بھیجنے والے نے اپنا نام تک نہیں لکھا تھا، مگر وہ اس ہینڈ رائٹنگ سے بہت اچھی طرح واقف تھی اور تیور بھی شاید جانتا تھا جب ہی تو نام لکھنے کی زحمت نہیں کی گئی تھی،

کارڈ اس نے بے ساختہ رازین بخاری کی طرف بڑھایا تھا، جو اس کے ساتھ گفٹ کھول رہا تھا۔ چند ماہ پہلے تیور نے شادی کر لی تھی، مگر وہ ماہ بعد ہی اس کی ٹنگی حاسد اور تنگ نظر فطرت کے باعث لڑکی نے طلاق لے لی تھی، ممانے اسے خود بتایا، وہ بے بنیاد شک کرتا تھا، کپڑے کی الماری میں ذرا بھی رد و بدل ہوئی وہ بیوی پہ چیخنے لگتا تھا۔

”میری غیر موجودگی میں کس سے ملنے لگی تھیں، کبھی پرنیوم لگا لیتی تو سوال اٹھتا ”کون آیا تھا ملنے، کس کے لئے خوشبو لگا کی ہے۔“ سب سن کر اس نے شکر ادا کیا تھا، اللہ نے اسے دہی مریض سے بچالیا تھا، جس کی ہم سفری میں وہ خود بھی مریض بن جاتی۔ کسی کا محل کسی کا مسئلہ ہے محبت اپنا اپنا تجربہ ہے اظہارِ اسوس کرتے رازین بخاری نے کارڈ سائیڈ پہ رکھ دیا تھا، بتاتے ہی وہ جان گیا تھا کہ کارڈ تیور نے بھیجا ہے، دونوں ہی مرد تھے مگر کتنی تضاد شخصیت تھی دونوں کی، ایک اس کے نام سے جلتا تھا اور وہ اس کے نام سے محبت کرتا تھا۔ شادی کے بعد اس نے کتنی لڑائی کی تھی کہ ب وہ مسز عزمہ رازین کے نام سے لکھے گی مگر اذین نے اسے قائل کر لیا تھا۔

”تمہاری پہچان عزمہ نوین سے ہے، لوگ ہمارے اسی نام سے پیار کرتے ہیں، تم میری ہی ہو اور اس حقیقت کو کوئی بدل نہیں سکتا۔“ جس رسالے میں اس کی تحریر چھپتی تھی ایک تھا وہ اس کے کٹڑے کٹڑے کر دیتا تھا اور ایک تھا جو اپنے ملنے جلنے والوں کو بتاتا تھا، عزمہ نوین کی بیوی ہے، وہ اسے کامیابی کے سفر سے لٹا تھا اور وہ کامیابی کے اس سفر میں اس کا ہم

سفر بنا تھا۔ ”کہاں گم ہو؟ کب سے پوچھ رہا ہوں۔“ رازین نے اس کا سر اپنی طرف موڑا۔ ”کیا پوچھ رہے تھے؟“ وہ اپنے خیالوں سے چوگی۔ ”جزاک اللہ، میں اتنا کچھ بک گیا اور تم نے کچھ سنا ہی نہیں۔“

”جب آپ خود ہی فرما رہے ہیں کہ بک رہے تھے تو میں کیا سنتی۔“ شرارت سے کہہ کر وہ کارڈ زمین پر گئی۔

”محترمہ عزمہ نوین صاحبہ میں یہ فرما رہا تھا کہ دریا کو کوڑے میں بند کر دینے کے مترادف آپ کی تحریروں کا مجموعہ بنایا جا چکا ہے، چند ماہ میں آپ کی کتاب مارکیٹ میں آ جائے گی، بس آپ انکی مہربانی کیجئے کہ کتاب کا ٹائٹل بتا دیجئے، تو بندہ کارڈس بجالائے۔“ چڑتے ہوئے کہا تو وہ ہنس پڑی۔

”من میت۔“ اس کے چہرے پہ نظریں جمائے کہا۔

”اوکے جی ڈن، لائٹنگ کی بڑی گریڈ پارٹی رکھنے والا ہوں تیاری کر لو۔“ اسے رازین بخاری کی محبت پہ کوئی شک نہیں تھا، بس وہ اسے ہر بار حیران کرتا رہتا تھا۔

”میرے لئے آپ کتنا بھاگ دوڑ کر رہے ہیں، سوچتے تو ضرور ہوں گے کیسی بیوی سے پالا پڑا، کوئی سیدھی سادی ہی مل جاتی۔“

”تمہیں کس نے بتایا؟“ رازین نے لب دبا کر کہا تو اس نے ہاتھ میں موجود کارڈ زدے مارے۔

”میں جا کر سا سو ماہ سے شکایت لگاؤں گا آپ کی بیٹی میری بیٹی کرتی ہے۔“ اس نے کہا تو اسے آریاں کی بھی کمی بات یاد آئی۔

## شگفتہ شگفتہ رواں دواں



ابن انشا کے شعری جھوٹے



آئی ایس ایف قومی سال بڑا دوست ہم تمام طلبہ و طالبات

لاہور اکیڈمی

ملک منزل محل، مین میڈین مارکیٹ 207 سرگودھا روڈ اور پلازا لاہور  
فون: 042-37321690, 042-37310797

اک گزارش ہے، لہذا کبھی بدلے کا مت، اعتبار اور اعتماد کی ڈوری کبھی مت چھینے گا، میرے پاس آپ کی تعریف میں بولنے کے لئے لفظ نہیں، جن کے ذریعے آپ کی تعریف کر سکوں، اتنا کچھ لکھنے کے باوجود آپ کے بارے میں کہنے کے لئے لفظوں کی کم مائیگی کا سامنا ہے، شاعر نے کہا ہے نا۔

میں کوئی شعر بھی بھولے سے نا کہوں گا تجھ پہ فائدہ کیا جو مکمل تیری تحسین نا ہو وہ اتنے جذب سے کہہ رہی تھی وہ اسے ساتھ لگا گیا۔

”ذرا پھر سے کہنا۔“

”ابھی میں کچھ اور کہنے لگی ہوں ذرا غور سے سن۔“

”میں نے اک بات چھپائی ہے آپ سے۔“

”کیا؟“ استفسار ہوا۔

”آپ بچپن کے عہد سے پہاڑ ہونے والے ہیں۔“ دھیمی آواز سے کہہ کر اس کے شانے پہ سر رکھا۔

”اچھا..... کیا؟“ آنکھوں میں بے یقینی لئے تعذیب چاہ رہا تھا، اس نے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔

”کب سے الو بنا رہی ہو مجھے۔“ کڑے تیوروں سے پوچھا۔

”آج صبح سے۔“ بچروں جیسا انداز تھا، وہ ہنس پڑا۔

”تھینکس جان جانا۔“ اس کے گرد حصار تنگ کیے جہاں وہ خوش تھا وہی وہ اپنے رب کی شکر گزار تھی، یقین و اعتماد کی کھلی چھاؤں میں وہ پرسکون تھی۔

☆☆☆

”اگر آپ اس غلط فہمی میں مبتلا ہوں کہ میں آپ سے گفت کا تقاضا نہیں کروں گی تو اس خیالی کدول سے نکال پھینکیں، میرا گفت۔“ اس نے پھیلی پھیلا دی۔

”جانتا ہوں، تم جیسی ندیری یہ غلطی کرتی نہیں سکتی، جیب میں ہاتھ ڈالو جو نکلا وہ تمہارا۔“ ہاتھ پیچھے کر کے آفریدی، اس نے فوراً ہاتھ جیب میں ڈالا، ہاتھ واپس آیا تو اس میں ایک عدد مناسا آئینہ تھا۔

”یہ ہے گفت؟“ حد سے چور اس کی آواز نکلی۔

”اب ذرا اس میں اپنا چاند سا کھرا دیکھو۔“ اصرار ہوا۔

”کیا دیکھوں، وہی ناک وہی چہرہ ہے۔“ ہدایت پہ اس نے چہرہ دائیں بائیں گھما کر آئینے میں دیکھا۔

”یہ۔“ کان میں ڈاسٹ کے ٹاپس دیکھ کے اس نے آئینہ کان پہ جمایا، بے حد خوبصورت ٹاپس جگر جگر کر رہے تھے۔

”یہ کارنامہ آپ نے کب انجام دیا کہ مجھے کچھ خبر ہی نا ہوئی۔“ حیرت سے بری حالت بھی، گفت اس کے کان میں موجود تھا اور وہی بے خبر تھی۔

”کچھ ہاتھ کہنے کی نہیں، سمجھنے کی ہوتی ہیں۔“ آنکھوں کے خفیف اشارے پہ وہ اس کی آنکھوں میں محبتوں کے جلتے دیئے کی روشنی برداشت نہ کر پائی، پلوں کی چمکن آپ ہی آپ عارضوں پہ گر گئیں۔

”آپ اور آریان بالکل اک جیسے ہیں، گفت دینے کا انداز اس کا بھی جدا تھا۔“ تیور تو آریان سے بھی حسد کرتا تھا، ہر دم بھائی کے نام کی مالا جپتہ پہ برہم ہوتا تھا اور رازین بخاری اترا

کے کہہ رہا تھا۔

”دوست کس کا ہے۔“ اور عزم نوین کے سینے سے دلی سانس آزاد ہوئی۔

”عزیز پہ جو تم میری ہر بات پہ ہرنی کی طرح سہم جاتی ہونا، مجھے ذرا اچھا نہیں لگتا، میرا اور تیور کا سوا نہ کرنا چھوڑ دو، دو بندوں کی سوچ ایک جیسی نہیں ہوتی، جس طرح زمین و آسمان اک دوسرے کو نہیں چھو سکتے بالکل اسی طرح انسانی شخصیت اک دوسرے پہ اثر انداز نہیں ہو سکتی۔“

”میرے ساتھ تم نے سالوں نہیں بتائے مگر اتنا جان لو کہ میری طبیعت میں کوئی طبع کاری نہیں ہے، میں ان مردوں میں سے بھی نہیں ہوں جو اپنی آزادی کو سوا کاغذ لگاتے ہیں اور اپنے ہی کمر کی خودی کو نکال کر تھکاتے ہیں، میرا ظاہر و باطن اک ہے، بس زندگی کے ہر مقام پہ تمہارے ساتھ قدم سے قدم ملا کر کھڑا ہوں گا کہیں تم بھی کسی مقام پہ خود کو تنہا نا پاؤ گی، آئندہ سے تم میرے چہرے پہ میرے رسی ایکشن تلاش نہ کرنا، بس مجھ پہ بھروسہ کرنا۔“ نرمی سے اس کے دونوں ہاتھ ہاتھوں میں لے کے وہ امرت رس پکار رہا تھا۔

”جب آپ کی زندگی میں داخل ہوئے تو مجھے لگا میں اک ہار پھر بے اعتباری کی کھال کی طرف بڑھ رہی ہوں، مجھے لگا تھا میں بھی بے شمار عورتوں کی طرح سمجھوتے کی زندگی گزارنے پہ مجبور کر دی جاؤں گی، اپنی ذات کو چکنا چڑے گا، مگر آپ کی محبت، حسن سلوک اور نیک نیتی نے میرے سارے اندازوں پہ پانی پھیر دیا، آپ جیسا محبتوں سے لبریز شخص ہر لڑکی کا خواب ہے: آپ کی ان ہی اداؤں نے مجھے اتنا مجبور کر دیا کہ میں آپ سے شدید محبت کرنے لگی ہوں، مگر



## ناولٹ

رونے میں زیادہ وجہ عروہ اور اس کی ماں کا دل ہے، مگر اس وقت ان کے دل کی انتہا نہ رہی جسے انہوں نے فردا سے عمر میں کافی زیادہ بڑے موافق علی کو گود میں اٹھائے بیٹے کے ساتھ دیکھ اچانک فردا نے ان کی طرف دیکھا تھا، اس کی نظروں کی نفرت اور حقارت غنفر علی سے غلط تھی، اس کی زبان نے کچھ نہ کہا تھا مگر اس کی نظریں انہیں بہت کچھ کہہ گئیں تھیں، وہ اس کی

کے پتھر و جود میں جان بڑھتی ہو، نکاح ہو چکا تھا، ساجدہ نے بیٹی کو گلے لگا کر خوب پیار کیا، غنفر علی حسرت بھری نظروں سے دیکھتے رہے، ماسوں اسے زہر آلود نظروں سے گھور رہے تھے، مگر وقت کا تقاضا تھا کہ خاموش رہا جائے، سودہ بھی غصے کے گھونٹ پی کر رہ گئے۔  
کچھ ہی دیر میں فردا کی رخصتی ہو گئی تھی، وہ بہت روٹی تھی اور غنفر علی جانتے تھے کہ اس کے



## کمالیہ

بشری سیال

ایک طویل مدت کے بعد انہیں سامنے دیکھا، وہ سمجھتا تھا کہ کیا واقعی یہ حقیقت ہے یا پھر ہمیشہ کی طرح کوئی خواب، ایسا خواب جو ابھی چند لمحوں میں ٹوٹ جائے گا اور پھر کئی روز تک انہیں بے چین دے فرار رکھے گا، غنفر علی آج بھی اسی طرح وجہ تھے جیسے برسوں پہلے ہوا کرتے تھے، ان کی شخصیت کی کشش اور خوبصورتی ابھی بھی برقرار تھی، وقت جیسے انہیں

چھوئے بغیر گزر گیا تھا، مگر وقت نے گل افروز پر جو ستم ڈھائے تھے وہ غنفر علی کو ان کے چہرے سے نظر آ رہے تھے، ان کی سلیٹی آنکھیں صدیوں کے رجسٹروں کی کہانی سن رہی تھیں، آنکھوں میں انتظار کے بجائے دیئے انہیں بہت کچھ سمجھا رہے تھے۔  
”قبول ہے۔“ فردا کی آواز ان دونوں کو ہوش کی دنیا میں واپس لے آئی تھی، جیسے دونوں

نظروں کی تاب نہ لا سکے اور نگاہیں جھکا گئے۔  
 ”گل افزاء!“ جو تھوڑے بہت مہمان آئے  
 تھے وہ رخصت ہو گئے تھے، غنفر علی اندر آئے  
 تھے، جہاں وہ بیٹوں بہن بھائی بیٹھے ہوئے تھے۔  
 ”مرگئی مٹی گل افزاء انیس سال پہلے اسی گھر  
 میں، یہ ساجدہ ہے ہماری بہن۔“ اس سے پہلے  
 وہ کچھ کہتیں، بڑے ماموں بول اٹھے تھے۔

”پلیز بھائی جان، مجھے اس سے بات  
 کرنے دیں۔“ وہ منت بھرے لہجے میں بولے،  
 جانتے تھے ان کا ظلم بہت بڑا ہے، اتنی آسانی  
 سے معافی نہیں ملے گی، مگر ایک دفعہ انہیں گل  
 افزاء سے بات تو کرنے دی جاتی، یہاں آنے  
 سے پہلے انہیں اندازہ نہ تھا کہ یہ اتنا مشکل ہوگا۔  
 ”تمہارا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے، ہر ناٹھ  
 تم نے خود توڑا تھا، اس کی زندگی برباد کر دی، اب  
 کیا لینے آئے ہو۔“ وہ آہستہ مگر تند و تیز آواز میں  
 بولے تھے، چند ٹاپے غنفر علی خاموشی سے گل  
 افزاء کے متصل داد اس چہرے کو دیکھتے رہے،  
 جیسے اندازہ لگا رہے ہوں کہ وہ کیا چاہتی ہے، مگر  
 اس کے چہرے پر پھیلے دکھ اور بے بسی کے  
 اثرات اتنے گہرے تھے کہ ان کے لئے کوئی بھی  
 اندازہ لگانا مشکل تھا۔

”آپ ایک دفعہ اس سے پوچھ تو لیں کہ کیا  
 یہ مجھ سے بات نہیں کرنا چاہتی؟“ انہوں نے  
 آس بھری نظروں سے گل افزاء کی جانب دیکھا  
 تھا جو ہنوز خاموش تھی اور وہ بولتی بھی تو کیا، برسوں  
 پہلے اس شخص سے رحم کی بھیک مانگی تھی، منت  
 ساجت کی تھی، مگر اس نے اسے دھکا دیا تھا۔  
 ”اس کی خاموشی تمہیں یہ بتانے کے لئے  
 کافی ہے کہ وہ تم سے بات نہیں کرنا چاہتی۔“  
 بڑے ماموں غصے سے کھڑے ہو گئے تھے۔  
 ”نکلو یہاں سے۔“ گل افزاء کے آنسو

ایک توڑ سے بہہ رہے تھے۔

”اگر گل افزاء اپنے منہ سے کہے کہ میں چلا  
 جاؤں، تو میں چلا جاؤں گا۔“ یہی مرتبہ اس نے  
 اپنا جھکا ہوا سر اوپر اٹھا کر غنفر علی کی سمت دیکھا  
 تھا۔

”مجھ پر اتنا اعتماد کیوں؟ اس قدر مان کس  
 لئے، جب مجھے اعتبار اور مان چاہے تھا تب مجھے  
 تو دھکا دیا تھا، اب کس ناٹھے سے چسپ باتیں  
 کر رہے ہو۔“ وہ لب سے خاموش چپکے چپکے، مگر  
 اس کی شکوہ کناس آنکھیں سب کچھ کہہ گئی تھیں۔  
 ”بھائی جان میں نماز پڑھ لوں۔“ وہ اٹھ  
 کھڑی ہوئیں، غنفر علی کا جی چاہا آگے بڑھ کر  
 ہاتھ پکڑ کر اسے روک لے مگر وہ ایسا ہر حق برسوں  
 پہلے اپنی مرضی سے کچھ چکے تھے، سو بے بسی سے  
 اسے جانا دیکھتے رہے۔

☆☆☆

لوہہ کی ناراضی ختم ہونے کا نام نہ لے رہی  
 تھی، اس نے گھر میں سب سے بات کرنا بند کر  
 رکھا تھا، وہ بات کرنا چاہتی تھی تو صرف عیسیٰ احمد  
 سے اور شکل دیکھنا چاہتی تھی تو صرف اس کی، مگر  
 اب اسے یقین ہو چلا تھا کہ ہرگز رونا دن اسے  
 عیسیٰ احمد سے دور کر رہا ہے، اسے سب سے زیادہ  
 غصہ ماما پر تھا جنہوں نے اسے یہاں سے نکالا  
 تھا۔

آج اس نے دل میں ایک فیصلہ کیا اور تیار  
 ہو کر اپنے بیڈ روم سے باہر نکل آئی، اسے پتا چلا  
 تھا کہ عیسیٰ احمد آج کل عدیل کی طرف رہ رہا ہے،  
 وہ عیسیٰ لے کر ماموں کے گھر آگئی، ابھی اس نے  
 گھر میں قدم رکھا ہی تھا کہ اس کی عدیل سے  
 مدد بھیڑ ہو گئی۔

”السلام علیکم!“ اس نے حیرت سے اسے  
 اکیلے آتے دیکھا تھا۔

”اکیلی آئی ہو؟“ وہ پوچھے ہنسنے لگا۔  
 ”مجھے عیسیٰ احمد سے ملنا ہے؟“ اس کے  
 سوال کو قصداً نظر انداز کرتے ہوئے وہ گویا  
 ہوئی۔

”وہ ادھر اپنے روم میں ہے، ویسے مشکل  
 ہی ہے کہ وہ تم سے ملے ان فیکٹ تم لوگوں کی فیکٹی  
 کی وہ شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتا۔“ وہ صاف گوئی  
 سے بولا، لوہہ نے کوئی جواب نہ دیا اور اس کے  
 بتائے ہوئے کمرے میں آگئی، ہلکی سی دستک  
 دے کر اس نے بیڈ روم گھمایا اور اندر داخل ہو گئی،  
 سامنے بیڈ پر عیسیٰ احمد لیٹا ہوا تھا، اس نے بازو  
 آنکھوں پر رکھا ہوا تھا، کمرے میں ٹلگیا اندھیرا  
 پھیلا ہوا تھا، لوہہ نے لائٹس آن کر دیں، کمرہ  
 روشنیوں میں نہا گیا، عیسیٰ احمد نے بازو آنکھوں  
 سے ہٹایا۔

”تم؟“ اپنے سامنے لوہہ کو دیکھ کر نفرت اور  
 غصے کی شدید لہر اسے اپنے پورے بدن میں  
 سرایت کرتی ہوئی محسوس ہوئی تھی وہ اٹھ کر بیٹھ  
 گیا۔

”السلام علیکم!“ اس نے آہستگی سے سلام  
 کیا، عیسیٰ احمد اسے گھور کر رہ گیا۔

”کیوں آئی ہو یہاں؟“ وہ چٹانوں جیسی  
 سختی لہجے میں سو کر بولا تھا۔

”پتا نہیں محبت کی قسمت میں در بدر ہونا  
 کیوں لکھا ہے، محبوب دھکے دے یا گالیاں،  
 ٹھوکریں مارے یا دھکے مارے، پھر بھی محبت پلٹ  
 پلٹ کر اس کے پاس آتا ہے، دل کو چھین ہی نہیں  
 آتا اس کے ہاتھ۔“ وہ سر جھکائے کھڑی تھی۔

”تم اس شخص کی بیٹی ہو جس نے اپنی اتنی  
 محبت کرنے والی اور با دانا بیوی کو کس قدر سفاکی  
 سے اپنی زندگی سے نکال دیا اور اس ماں کی بیٹی ہو  
 جس نے اپنی ضد اور انا کی خاطر تین معصوم

جانوں کو عمر بھر کے لئے سولی پر لٹکایا، تمہارے  
 خون میں ہی محبت شامل نہیں، تم کیا جانو محبت کیا  
 شے ہے، کس بلا کا نام ہے۔“ یہی بار وہ اس کے  
 سامنے آرام سے مگر طنز بھرے لہجے میں بولا تھا اور  
 فی الحال لوہہ کے لئے یہ کافی تھا، کہ وہ اس کے  
 سامنے تھا، اس سے بات کر رہا تھا، اس کی بات  
 سن رہا تھا۔

”محبت کا کوئی حسب نسب نہیں ہوتا  
 عیسیٰ!“ وہ قدرے سکون سے بولی۔

”نا ہی محبت کا تعلق خون سے ہے، اس کا  
 تعلق تو بس دل سے ہے، جو سب کا اپنا اپنا ہوتا  
 ہے، آپ آزما کر دیکھ لیں مجھے۔“

”آزمایا وہاں جاتا ہے جہاں پانے کی تنہا  
 ہو، آزمائش اس کی جاتی ہے جس سے کوئی تعلق  
 ہو اور میرا تم سمیت تمہاری فیکٹی میں کسی سے کوئی  
 تعلق نہیں ہے۔“ اسے بخار تھا، اتنا بولنے سے وہ  
 تھک گیا تھا، اس نے بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائی  
 اور آنکھیں موند لیں۔

”میں جانتی ہوں آپ مجھ سے محبت نہیں  
 کرتے، آپ عروہ سے محبت کرتے ہیں، مگر اب  
 تو اس کی شادی ہو گئی ہے، آپ کسی ناکسی سے  
 تو.....“

”مجھے کسی سے شادی نہیں کرنی، تم کیوں  
 فضول میں میرے پیچھے پڑ گئی ہو۔“ وہ بیزار کن  
 لہجے میں بولا۔

”آپ تو ادھوری محبت کی تکلیف سے  
 گزر رہے ہیں، آپ تو میرا درد محسوس کر سکتے ہیں،  
 پھر کیوں مجھے بار بار دھکاتے ہیں، پلیز میری  
 محبت کو قبول کر لیں۔“ وہ اچانک اس کے قدموں  
 میں بیٹھ گئی اور اسے دونوں ہاتھ اس کے پاؤں پر  
 رکھ دیے، اس کی آنکھوں سے آنسو گر رہے تھے۔  
 ”لوہہ!“ عیسیٰ احمد زور سے چلایا، ساتھ

ہی اس کے ہاتھ جھٹکے۔

”آریومیڈ؟“ وہ شائد تھا اس کے پاگل پن پر۔

”کیوں! آپ نے بھی تو عروہ سے محبت کی ہے، تو کیا آپ پاگل ہیں۔“ وہ کسی بھی طرح ہارنا نہیں چاہتی تھی، وہ یہاں جیتنے آئی تھی، عیسیٰ احمد کو جیتنے۔

”تمہاری ماں نے تمہارے لئے عروہ کی زندگی برباد کی، اسے خاندان بھر کی نظروں سے گرایا، میں تم سے تو ہرگز شادی نہیں کر سکتا، اور مجھے کسی سے بھی شادی نہیں کرنی ہے، میں غضنفر علی نہیں ہوں۔“ اس نے دونوں الفاظ میں کہا تھا، نوبیلہ کے آنسوؤں میں روانی آگئی تھی، وہ جانتی تھی عیسیٰ احمد بہت نرم مزاج ہے، کسی کی تکلیف اسے برداشت نہیں ہوتی۔

”میں جانتی ہوں آپ عیسیٰ احمد ہیں، غضنفر علی نہیں، اسی لئے آپ سے اپنا درد کہنے آئی ہوں، میرے درد کی دوا صرف آپ کے پاس ہے، میرا سکون آپ کے ساتھ رہنے میں ہے، پلیز عیسیٰ۔“ وہ اس کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے رورہی تھی، نوبیلہ کے آنسو اسے عروہ کے دکھ اور نقصان کا اور زیادہ احساس دلارہے تھے، وہ لب بچھنے بیٹھا تھا، جیسے خود کو کوئی سخت بات کہنے سے روک رہا ہو۔

”آپ کی قسم ماما نے جو کیا مجھے اس کا کوئی علم نہ تھا، میں نے ایسا کبھی نہیں چاہا تھا کہ عروہ کے ساتھ ایسا ہو، مگر اب چاہ کر بھی آپ عروہ کو واپس نہیں لا سکتے، مگر میرا دکھ سمجھ سکتے ہیں، اسے ختم کر سکتے ہیں۔“ عیسیٰ احمد کسی طرح نامان رہا تھا، مگر وہ یہاں شکست کھانے نہیں آئی تھی۔

”میں عروہ کو واپس نہیں لا سکتا، مگر تم سے شادی کر کے اس کی نظروں میں گرنا نہیں چاہتا،

وہ یہ سمجھنے لگے کہ شائد میں بھی تمہاری ماں کے ساتھ ان کی پلاننگ میں شامل تھا اور تم پلیز جاؤ یہاں سے۔“ وہ اس کی بارکالی سختی سے بولا۔

”آپ کو بخار ہے؟ میڈیسن لی آپ نے؟“ وہ آنسوؤں کو بیدردی سے رگڑتے ہوئے بولی۔

”نہیں میری فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے اور اب جاؤ یہاں سے۔“ وہ درستی سے بولا۔

”دل پر کب کسی کا اختیار چلا ہے، کیا آپ کا دل عروہ کے معاملے میں آپ کی سستا ہے اور مانتا ہے؟“ اس نے عیسیٰ احمد کو لاپرواہ کر دیا تھا، وہ کچھ دیر اس کے پاس بیٹھی رہی تھی، خود ہی آنسو پھالی اور خود ہی انہیں پونچھ بھی لیتی، عیسیٰ احمد نے تسلی کا ایک لفظ نہیں کہا تھا، نا ہی اسے آس کا کوئی جتنو تھا یا تھا، مگر وہ دوبارہ آنے کا کہہ کر گئی تھی۔

☆☆☆

شام کا وقت تھا، عروہ میرس پر آگئی تھی، فارقلیط حسن کہیں بھی نظر نہ آ رہا تھا، وہ خاموش کھڑی آسمان پر اڑتے پرندوں کو دیکھ رہی تھی، جو یقیناً گھروں کو لوٹ رہے تھے۔

”اللہ! اس کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے تھے۔“

”کیوں ہوں میں اتنی اکیلی؟ ایسا کیا گناہ ہو گیا مجھ سے جس کی سزا اس تنہائی کی صورت مجھ پر مسلط کر دی گئی ہے۔“ آنسو ایک تو اتر سے اس کی آنکھوں سے بہہ رہے تھے، جنہیں صاف کرنا اس نے ضروری نہ سمجھا تھا، سردی کالی زیادہ تھی، مگر اسے شاید کچھ بھی محسوس نہ ہو رہا تھا۔

”ہیلو مزا“ دفعتاً اس کے عقب میں فارقلیط حسن کی آواز ابھری تھی، اس نے آتے ہی عروہ غضنفر کو بازوؤں کے گھیرے میں لے لیا اور ٹھوڑی اس کے کندھے پر رکادی۔

”کیا ہو رہا ہے یہاں سردی میں؟“ اس کا موڈ کافی خوشگوار تھا، عروہ نے چاہا کہ آنسو پونچھ ڈالے تاکہ وہ دیکھ نہ پائے، مگر اس کے دونوں ہاتھ فارقلیط حسن کے ہاتھوں میں تھے۔

”کچھ نہیں۔“ اس نے حتی الوسع آواز کو نارل رکھنے کی کوشش کی، مگر فارقلیط حسن نے فوراً جان لیا کہ وہ رورہی ہے، اس نے فوراً اس کا رخ موڑ کر اپنی جانب کیا، عروہ کے گالوں پر پھسلے آنسو اسے ساری کہانی سمجھا گئے تھے۔

”تو تم رورہی تھی؟“ وہ نگاہیں اس کے چہرے پر پھسلے آنسوؤں پر جماتے ہوئے بولا تو لمحہ بھر کو وہ خاموش رہ گئی، جیسے کوئی جواب نہ بن بڑا ہو، فارقلیط حسن نے اس کے چہرے کو اپنی ہتھیلیوں میں لے کر اسے خود سے قریب کیا۔

”میں نے کہا تھا نا مجھے ان آنکھوں میں آنسو نہیں چاہئیں، پھر کیوں بھول گئی تم میری بات۔“ اس نے احتیاط سے آنسوؤں کو پونچھا تھا اور عروہ کے آنسو اور تیزی سے بہنے لگے تھے۔

”ان آنسوؤں کے سوا میرا بھی کسی نے ساتھ نہیں دیا، یہی تو میں ہمیشہ سے میرے ساتھ، میرے ہمدرد۔“ اب کی بار اس نے آنسو بہنے دے دیے تھے اور انہیں فارقلیط حسن سے چھپانے کی کوشش نہیں کی تھی، وہ اس کا ہاتھ تمام کر اندر کی جانب بڑھا تھا، اسے ساتھ لے کر بیڈروم میں آیا، اسے بیٹھا کر خود اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

”اب تو تمہارے آنسوؤں سے میری ہڈی دھنسی ہوگئی، جنہیں ایسا لگتا ہے یہ تمہارے مجھ سے زیادہ قریب ہیں، انہیں تمہارا مجھ سے زیادہ خیال ہے۔“ عروہ کا ہاتھ ابھی بھی فارقلیط حسن کے ہاتھ میں تھا۔

”آپ بھی عجیب باتیں کرتے ہیں۔“ نا چاہتے ہوئے بھی اس کی بات پر وہ ہنس دی تھی،

اسے ہنسا دیکھ کر فارقلیط حسن کو ڈھیروں طمانیت کا احساس ہوا تھا۔

”محبت کرنے والے عجیب ہی ہوتے ہیں، سر پھرے، دیوانے، کیا جنہیں میری محبت پر یقین ہے؟“ اس نے اچانک ہی سوال کر ڈالا تھا اور عروہ غضنفر بس خاموشی سے اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ کیا جواب دے۔

”کیا تم مجھ سے محبت کرتی ہو؟“ اس نے سوال پر وہ گھبرا اٹھی تھی، اسے فارقلیط حسن سے اس سوال کی امید نہ تھی، وہ بناء پلٹیں جھپکائے اس کو دیکھے گی۔

”کیا میں نے کوئی غلط بات کہہ دی ہے؟“ اسے یوں خاموشی سے اپنی جانب دیکھنا پا کر وہ الجھ گیا تھا، سوچ پونچھنے لگا۔

”نہیں۔“ عروہ نے ایک لمبی سانس نفاس کے سپرد کرتے ہوئے نگاہیں جھکا لیں، اب وہ بھلا فارقلیط حسن کو اس بات کا کیا جواب دیتی، اسے تو محبت پر ذرا بھی اعتبار نہ رہا تھا، وہ رشتوں کی اور محبت کی ڈیسی ہوئی تھی۔

”تو پھر جواب دو۔“ اس کی طویل خاموشی کو محسوس کرتے ہوئے فارقلیط حسن نے اسے پھر سے مخاطب کیا۔

”کس بات کا؟“ وہ تجاہل عارفانہ سے کام لیتے ہوئے بولی۔

”Do you love me?“ اس نے ایک مرتبہ پھر سوال دہرایا اور نظریں اس کے روئے نقوش پر گاڑ دیں، اس کی جھکی آنکھوں پر سایہ قن گہری لہجی پلٹیں ابھی بھی میل تھیں، ناک کا اگلا حصہ سرخ ہو چکا تھا، روئے سے وہ اور زیادہ حسین لگنے لگی تھی۔

”ابھی ہماری شادی کو نا تم ہی کتنا ہوا ہے، اتنی جلدی تو.....“ قصداً اس نے بات ادھوری



مہرودی تھی۔

”محبت کرنے کے لئے دن مہینے یا سال نہیں چاہیے ہوتے، یہ تو لمحوں میں ہو جاتی ہے، ان نیکیت یہ خود بخود ہو جاتی ہے، سوچ سمجھ کر نہیں ہوتی۔“ وہ اسے ایسے سمجھا رہا تھا، جیسے وہ اس جذبے سے قطعی نااہل ہو، جبکہ خود وہ اس کا بچہ رہا ہو۔

”مگر میں آپ کی بہت عزتی کرتی ہوں، یہی ملاقات میں آپ جس طرح کا Impact مجھے دے کر گئے تھے آپ اس سے بالکل مختلف ہیں۔“ فارقلید حسن نے کوئی جواب نہ دیا اور اٹھ کر باہر چلا گیا، عروہ کو سوس ہوا کہ ایسے نہیں کہنا چاہیے تھا، وہ اٹھ کر باہر کی جانب بڑھی، وہ گاڑی میں بیٹھ کر باہر نکل گیا تھا۔

☆☆☆

فردا رات ہی وہیوں کی طرح تیار نہیں ہوئی تھی، نا بہت شوخ لباس اور نا ہی بہت ہیوی جیولری پہنی تھی، مگر پھر بھی وہ بہت پیاری لگ رہی تھی، موسیٰ علی کے ساتھ چل کر وہ اس کے گھر میں اس کے بیڈروم تک آئی تھی، اسے وہاں چھوڑ کر وہ نا جانے کہاں چلا گیا تھا، نا تو اسے پیٹنے کے لئے کہا اور نا ہی کوئی اور بات کی، وہ دل مسوس کر رہ گئی، بالآخر خود ہی جا کر بیڈ پر بیٹھ گئی، کافی دیر گزر گئی موسیٰ علی نہیں آیا تو اسے شدید کوفت ہونے لگی۔

”تو یہ تھی میری قسمت عیسیٰ احمد!“ وہ آنکھیں موندے جیسی انجانے میں اسے سوچنے لگی۔

”میں نے تمہارے کتنے خواب سناے تھے، تمہارے سوا میں کسی کے متعلق سوچنا بھی نہیں چاہتی تھی، مگر دیکھو، آکر ایک مرتبہ دیکھو وقت نے کیا ستم ڈھایا مجھ پر۔“ اچانک دروازہ کھلنے اور

پھر بند ہونے کی آواز آئی تھی، اس نے جھٹ سے آنکھیں کھول ڈالیں۔

”استغفر اللہ!“ اس کے دل نے اسے بری طرح سے سرزش کیا تھا، وہ سخت شرمسار ہوئی۔

”میں اب موسیٰ علی کی بیوی ہوں، اس کے علاوہ کسی دوسرے مرد کا خیال میرے لئے سخت گناہ ہے۔“ وہ سر جھٹک کر سیدھی ہوئی، موسیٰ علی بیڈ کی دوسری سائیڈ پر کھڑا معصوب کو لٹا رہا تھا، جو کہ اس کے سینے سے لگا سو رہا تھا، وہ خاموشی سے یہ منظر نکالنے سے روکتی رہی۔

”تم یقیناً تھک گئی ہو گی، چنچ کر کے سو جاؤ، میں بھی آرام کرنا چاہتا ہوں۔“ معصوب سے دوسری سائیڈ پر موسیٰ علی نیم دراز ہوتے ہوئے بولا تھا، فردا ہنوز خاموش تھی۔

”مگر اس سے پہلے میں تم سے کچھ باتیں کہنا چاہتا ہوں، آئی تو تم ابھی کم عمر ہو، مجھ سے کافی چھوٹی ہو، مگر پھر بھی مجھے امید ہے، کہ تم میری باتوں کو سمجھ کر ان پر عمل بھی کر دو گی۔“ اتنی لمبی تمہید پر فردا لحظہ بھر کوچکی ضرور مگر اس کو احساس نا ہونے دیا۔

”مجھے عیوہ سے بے پناہ محبت ہے، اس کے اس دنیا سے جانے کے بعد اس محبت میں کمی نہیں ہوئی بلکہ اضافہ ہی ہوا ہے، شاید میں یہ شادی نا کرتا، مگر عیوہ نے مرنے سے پہلے مجھ سے وعدہ لیا تھا کہ اس کے بعد میں تم سے شادی کر لوں۔“ وہ دم سادھے جیسی اس ظالم شخص کی باتیں سن رہی تھی، اسے کم از کم آج کے دن موسیٰ علی سے ان باتوں کی امید نا تھی، مگر وہ یہ بھی جانتی تھی کہ اس کی زندگی میں بھی وہ نہیں ہوتا جو وہ سوچتی ہے، اسے بھی وہ نہیں ملتا جو اسے چاہیے ہوتا ہے، یا جو اس کا دل مانگتا ہے۔

”پھر معصوب کی تم سے attachment

اور میرا والا قصہ مجھ یہ فیصلہ کرنے پر مجبور کر گیا، میں ابھی ڈننی اور دلی طور پر اس رشتے کو قبول کرنے کے قابل نہیں ہوں۔“ اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گیا، فردا جو ہر بات منہ پر کہہ دینے کی عادی تھی، اس کا جی چاہا اسے بتائے کہ وہ بھی عیسیٰ احمد کو بے پناہ چاہتی ہے اور اس کے علاوہ کسی سے محبت نہیں کر سکتی، وہ بھی اپنی ماں کی وجہ سے یہاں ہے اور اگر وہ اس رشتے کو قبول نہیں کرتا تو اسے تین لفظوں سے باندھ کر کیوں لایا، صرف اپنے بچنے کی کل وقتی ملازمہ بنا کر، مگر وہ ایسا نا کہہ سکتی تھی، سو مبر کے گھونٹ پی کر بیٹھی رہی۔

”میں نے عیوہ کے ساتھ اپنی زندگی کا بہترین اور یادگار وقت گزارا ہے اور میں اسے بھولنا نہیں چاہتا، مگر میں تمہارے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کروں گا۔“ اس کی بات نے فردا کو دل میں ہنسنے پر مجبور کر دیا تھا، موسیٰ علی کو اپنے رویے اور الفاظ کی بدصورتی کا ذرا احساس نہ تھا۔

”تم سن رہی ہو نا؟“ اچانک اس نے پوچھا۔

”جی!“ وہ سامنے والی پینٹنگ کو دیکھ رہی تھی، مختصر جواب دے کر دوبارہ خاموش ہو گئی۔

”بس تم بھی معصوب کو یہ احساس نا ہونے پڑتا کہ اس کی ماں نہیں ہے، اسے سکھاؤ کہ وہ انہیں ماما کہا کرے، میں نہیں چاہتا کہ میرا بیٹا اس میں اتنا برا احساس محرومی لے کر پرورش آئے، اگرچہ تم اس کی سگی ماں نہیں ہو، مگر وہ یہ لفظ لے کر تو نہ ترے۔“ وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی، اسے دلی علی سے شدید نفرت محسوس ہوئی تھی، اچھا تو یہ وہ بھی نا لگا تھا، مگر اس وقت اس کا شدت سے جی چاہ رہا تھا کہ اسے بتائے کہ وہ بھی اس ادی سے اتنی ہی ناخوش ہے جتنا کہ وہ۔

”میں چنچ کر کے آتی ہوں۔“ وہ ڈرینگ روم کی جانب بڑھی کہ موسیٰ علی کی غیر ارادی نظر اس کی سمت تھی۔

”رکو۔“ اگلے لمحے وہ تیزی سے اس کے قریب آیا تھا۔

”یہ سیٹ تو عیوہ کا ہے۔“ اس نے فردا کے کھلے کی طرف اشارہ کیا۔

”یہ تم نے کس سے پوچھ کر لیا؟“ اس نے ہاتھ بڑھا کر بیدردی سے لائٹ اس کے گلے سے کھینچا۔

”آہ۔“ مارے درد کے فردا کی چیخ نکل گئی۔

”خبردار اگر آئندہ عیوہ کی کسی چیز کو ہاتھ لگایا تو میں ہاتھ توڑ دوں گا۔“ اس نے اسی بیدردی سے اس کے کانوں سے بندے بھی نوچھے تھے، احساس ذلت سے اس کی آنکھیں لبالب نمکین پانیوں سے بھر آئی تھیں، سخت لہجے میں اسے اس کی اوقات اور حیثیت بتا کر وہ غصے کے عالم میں کمرے سے باہر نکل گیا تھا۔

”اُمی!“ وہ بیڈ پر گر کر اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی، وہ جو سوسنی لگنے پر بھی ماں کی گود میں منہ چھپا کر آنسو بہاتی تھی، اتنے بڑے دکھ پر تنہا رو رہی تھی۔

☆☆☆

”زن! بیٹا اٹھ جاؤ اب، کتنا سونا ہے؟“ فضیلہ بیگم کو کی بیسویں بار بیٹے کو جگانے آئی تھیں، مگر مجال ہے جو وہ اٹھ رہا تھا۔

”پانچ منٹ میں آتا ہوں آپ جائیں۔“ وہ پچھلے آدمے کھٹنے سے یہی کہہ رہا تھا۔

”نہیں، اب کی بار میں تمہیں ساتھ لے کر جاؤں گی، اتنا زیادہ اور دیر تک سونا خوش ہوتی ہے، اٹھ جاؤ شاہاش۔“ انہوں نے کبیل اس کے

اوپر سے ہٹایا۔

”کیا یار ماں، اتنے سارے پیپر کی تھکن ہے، اتارنے دیں۔“ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور پاؤں میں سلیپر پہنے لگا۔

”بس بہت سولیا، اٹھ جاؤ اور ناشتہ کرو، پھر مجھے میری سیکلی نازیہ کے گھر چھوڑ آؤ۔“ اسے اب ان کے اتنے اصرار پر جگانے کی وجہ سمجھ آئی تھی۔

”آپ دونوں سیلیوں نے یقیناً مل کر چغلیاں ہی کرنی ہوں گی تو وہ آپ لوگ نوں پر کر لیں۔“ وہ سنجیدگی سے کہہ کر دوش روم کی جانب بڑھا۔

”شہر و ذرا تم، شرارتی لڑکا۔“ انہوں نے کشن اٹھا کر اس کی طرف اچھالا مگر وہ دوش روم میں گھس چکا تھا، ہنستے ہوئے وہ باہر کی جانب بڑھ گئیں، زمین ان کا اکھوتا بیٹا تھا، ان کے مرحوم شوہر کی نشانی، ان کے گھر دل اور زندگی کا سکون اور دقت۔

☆☆☆

غفنفر علی کا کام و نامراد لوٹے تھے، ان کا خیال تھا گل افراء آج بھی ویسی ہی ہوگی معصوم اور بھولی بھالی، فوراً ان کی بات سن لے گی اور انہیں معاف بھی کر دے گی، مگر اس کے سامنے جا کر انہیں اندازہ ہوا کہ ان کے درمیان صدیوں کی خلیج حائل ہے، ایک طویل جدائی اور دقت گل افراء نے کس تکلیف اور اذیت میں گزرا تھا، یہ سب اس کا چہرہ اور آنکھیں بیان کر رہے تھے، وہ بہت کمزور اور بوڑھی لگ رہی تھی۔

”گل افراء! کاش میں تمہاری بات سن لیتا، مان لیتا، تو آج ہم دیوں الگ الگ نا ہوتے، ہماری بیٹیاں قبیوں کی طرح رخصت نا ہوتیں۔“ گاڑی سست رفتاری سے چل رہی تھی، ان کا گھر جانے کو بالکل دل نا چاہ رہا تھا، مگر اس

کے سوا اور کہاں جاتے، رات ہو رہی تھی، سو مجبوراً وہ گھر کو لوٹ گئے۔

گاڑی پورچ میں کھڑی کر کے وہ بیڈ روم میں آ گئے تھے، صوفیہ کہیں نظر آئیں تو انہوں نے شکر ادا کیا، پہنچ کر کے واپس آئے تو وہ کمرے کے وسط میں کھڑی ہوئی نظر آئیں، وہ نظر انداز کر کے بیڈ کی جانب بڑھے، تکیہ اٹھایا اور صوفیہ پر رکھ کر لیٹ گئے، کچھ دیر وہیں کھڑی ہو کر وہ دیکھتی رہیں پھر ان کے قریب آ کھڑی ہوئیں۔

”غفنفر کھانا نہیں کھائیں گے؟“ اس کے اتنے سکون سے بولنے اور کھانے کا پوچھنے پر غفنفر علی کے اندر اٹھتے طوفان میں غلیانی بڑھنے لگی تھی، مگر وہ جب سادھے، چہرے پر بازو دیکھ لائق بنے لپٹے رہے، مگر مقابل بھی صوفیہ تھی جس نے بارنا تو سیکھا ہی نا تھا۔

”غفنفر ایک دفعہ میری بات۔۔۔۔۔“

”بند کرو یہ ڈرامے بازی مکار عورت۔“ وہ زور سے دھاڑتے ہوئے اٹھ بیٹھے۔

”جہیں اندازہ بھی ہے تمہارا گناہ کتنا نا ہے، تم نے مجھے برا بکریا دیا، مجھ سے میری محبت چھین لی، اپنی خواہش کے حصول کے لئے ایک بے گناہ اور معصوم لڑکی کو بے گھر اور بے درکروا تم کتنی بے حس ہو، تمہیں کبھی خدا کا خوف نہیں آ جابائے اس کہ تم اپنے گناہ پر پچھتاؤ، اس پر معافی مانگو، وہی گناہ پھر سے دوہرایا، اپنی بیٹی اس کی محبت دلوانے کے لئے تم نے میری بیٹی الزام لگایا، اسے لاوارثوں کی طرح رخصت کر اور پھر تم اپنی بہادر ہوا بھی میرے سوا کھڑی ہوئی ہو، جہیں تو شرم سے ڈوبا چاہیے، مجھ سے منہ چھپا کر کہیں چلے چاہیے۔“ اتنے برسوں میں پہلی مرتبہ اس گھر

درو دیوار نے غفنفر علی کی دھاڑ سنی تھی، انہیں غصے میں دیکھا تھا، ورنہ جیسے بھی حالات آئے جو بھی ہوا انہوں نے ہمیشہ مبرہہ دل کا مظاہرہ کیا۔

”میں آپ سے محبت کرتی ہوں، بچپن سے یا شاید تب سے جب سے ہوش سنبھالا، گل افراء نے آپ کو مجھ سے چھینا، تو کیا میرا حق نا بنتا تھا کہ میں آپ کو واپس لوں اس سے۔“ شاید پہلی مرتبہ وہ اعتراف گناہ کر رہی تھیں۔

”وہ تو کہیں جانتی بھی نا تھی، اس نے مجھے نہیں چھینا تم سے، اسے چھینا آتا ہی نہیں۔“ وہ آج بھی گل افراء کے حق میں بول رہے تھے، اس کی محبت جوان کی آنکھوں سے چھلکا کرتی تھی آج زبان اس کی گواہی دے رہی تھی اور صوفیہ کو تکلیف میں مبتلا کر رہی تھی۔

”غفنفر مجھے معاف کر دیں، پلیز مجھ سے ناراض مت ہوں۔“ وہ منت کرنے لگیں۔

”میں تمہیں معاف نہیں کر سکتا، مجھے گل افراء سے معافی نہیں ملی، اس نے میری بات بھی نہیں سنی، اس نے مجھ سے کچھ نہیں کہا، اس نے تو مجھے برا بھلا بھی نہیں کہا، وہ اب مجھے اس قابل بھی نہیں سمجھتی یا شاید اب بھی اسے کسی کو تکلیف دینا نہیں آتا، نہ ہاتھ سے اور نہ زبان سے اور یہی مومن کی نشانی ہے۔“ صوفیہ ہاتھ ملتی رہ گئیں، ساری زندگی انہوں نے غفنفر علی کے دل سے گل افراء کی محبت ختم کرنے کے لئے جتن کیے ہر ممکن کوشش کی کہ وہ اسے بھول جائیں، مگر اس کا عکس وہ ہمیشہ غفنفر علی کی آنکھوں میں دیکھتی رہیں اور آج زبان پر اس کا ذکر اس کی محبت اور اس کے لئے تڑپ دیکھ کر صوفیہ انگاروں پر لوٹ رہی تھیں۔

”میری ایک بیٹی کو میرے پاس ہوتے ہوئے بھی تم نے میرے قریب نہیں آنے دیا،

ایک مسلسل خوف مجھ پر مسلط کیے رکھا کہ وہ گل افراء کی بیٹی ہے، اسی جیسی ہوگی اور نہ جانے اسے کیسے ڈرایا ہوا تھا کہ وہ ہر وقت سبکی رہتی تھی، میری دوسری بیٹی نہ جانے کن حالوں میں پرورش پالی رہی، نہ جانے کتنی بار کھلونوں کی دکانوں کے سامنے سے گزرتے ہوئے اس نے ٹھنڈی آہیں بھر کر سوچا ہوگا کاش میرا باپ زندہ ہوتا۔“ صوفیہ کے پاس ان کی کسی بات کا کوئی جواب نہیں تھا، اسی دقت سے وہ ہمیشہ ڈرتی رہیں، جو آج ان کے سامنے آ کھڑا ہوا تھا اور انہیں آئینہ دکھا رہا تھا۔

”غفنفر صرف میرا قصور نہیں ہے سارا آپ کی ماں اور بہن کی پلاننگ تھی، مجھے انہوں نے اس مقصد کے لئے استعمال کیا۔“ اس نے کمزور سادفاز کرنا چاہا۔

”یہی میری بد قسمتی ہے کہ مجھے سب رشتوں نے دھوکہ دیا، کسی نے میرے متعلق نہ سوچا، سب کو اپنی اپنی ضد اور انا عزیز تھی۔“ وہ گاڑی کی چابی لے کر باہر کی جانب بڑھے تھے۔

”غفنفر رک جائیں کہاں جا رہے ہیں اس دقت۔“ وہ پیچھے لپکی تھیں، مگر غفنفر علی ان سنی کرتے ہوئے ہا ہر نکل گئے، وہ خود بھی نہیں جانتے تھے کہ وہ کہاں جا رہے ہیں۔

☆☆☆

موسیٰ علی ٹیرس پر آ کھڑا ہوا تھا، اسے فردا کے ساتھ کی گئی زیادتی پر ذرا بھی افسوس یا شرمندگی نا تھی، اسے عمیرہ کی یاد پر جیموں کی طرح سینے پر لگتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی، وہ اپنے فیصلے پر پچھتانے لگا تھا، اسے لگنے لگا تھا کہ وہ بہت بڑی غلطی کر بیٹھا ہے۔

”عمیرہ تمہاری جگہ میں کسی کو نہیں دے سکتا، تمہاری جگہ کوئی اور لے ہی نہیں سکتا، میں

نے صرف تم سے کیا اپنا وعدہ نبھایا ہے اور پھر مصعب کے لئے بھی ضروری تھا یہ سب۔“ وہ وہاں سے عیصرہ اور اپنے بیڈروم میں آ گیا تھا، سامنے دیوار پر ان دونوں کی شادی کی تصویر لگی ہوئی تھی جسے دیکھ کر اس کے دل کی حالت غیر ہونے لگی تھی۔

”کیوں چلی گئی تم مجھے چھوڑ کر؟ ذرا بھی نہیں سوچا کیسے رہوں گا میں تمہارے بغیر۔“ وہ شکستہ قدموں سے چلتا ہوا اس کی تصویر کے سامنے آ کھڑا ہوا تھا۔

”پتا نہیں وقت ایسا کیوں کرتا ہے ہمارے ساتھ کہ جوتا عزیز اور پیارا ہوتا ہے ہمیں اسی کو ہم سے چھین لیتا ہے اور جن کا ہونا نہ ہونا، ہمارے لئے کوئی معنی نہیں رکھتا وہی لوگ ہمارے ارد گرد آس پاس ہر وقت ہوتے ہیں۔“ اسے پتا بھی نہ چلا تھا اور اس کی آنکھ سے آنسو نکل پڑے تھے۔

”میں نے اس دنیا میں تم سے زیادہ کسی کو نہیں چاہا، تمہاری خاطر اپنی نیکی کو بھی چھوڑ دیا، ذرا سا تو خیال کرتی میرا۔“ تمام رات وہ ماضی کی یادوں اور بھول بھلیوں میں کھویا رہا تھا۔

اس نے ایک لمحے کو بھی نہ سوچا کہ وہ ایک جیتی جاگتی جذبات اور احساسات رکھنے والی چھوٹی سی لڑکی کو کس طرح ہرٹ کر کے آیا ہے، کیسے اس کے ارمانوں میں آگ لگا کر آیا ہے، وہ روتی ہوئی، اس کا انتظار کر رہی ہوگی، مگر اسے تو صرف عیصرہ کی بردہ تھی، صرف اس سے محبت تھی، اس کی زندگی میں بھی اور اب اس کے جانے کے بعد بھی، اسے اس بات سے کوئی فرق نہ پڑتا تھا کہ کوئی اور کیا سوچتا ہے، یا کیا چاہتا ہے۔

وہ کمرے میں موجود اس کی ایک ایک چیز کو

بہت محبت اور عقیدت سے چھو رہا تھا، چوم رہا تھا، سینے سے لگا رہا تھا، فجر کی اذان ہوئی تو جیسے وہ ہوش میں آیا، اچانک جس طرح خواب سے جاگا۔

وہ واپس بیڈروم میں آ گیا، سامنے ہی وہ بیڈ پر بیٹھی تھی، دروازے کی جانب اس کی پشت تھی، موسیٰ علی نے آہستگی سے دروازہ کھولا تھا اور دے قدموں اندر داخل ہوا تھا، مگر فروا کو پتا چل گیا تھا کہ وہ اندر آیا ہے، وہ اپنی جگہ سے ذرا سا بھی نہ اٹھی اور اسی طرح ساکت و صامت بیٹھی رہی، اس کے پاس سے گزر کر وہ وارڈ روب کی جانب گیا تھا، دونوں میں صرف تھوڑا ہی فاصلہ تھا، وہ اس کے سامنے کھڑا تھا، مگر فروا اس کی جانب دیکھ نہ رہی تھی۔

کپڑے نکال کر وہ واش روم میں محسوس کیا، کچھ ہی دیر میں وہ نکلا تو نظر فروا پر پڑ گئی، اس کا متورم چہرہ، سوچی ہوئی آنکھیں اور منموم انداز اسے کہیں سے بھی ایک دن کی دہن ثابت نہیں کرتا تھا، موسیٰ علی سر جھٹک کر آگے بڑھا اور جائے نماز بچھانے لگا، اس نے نماز کی نیت کی۔

”ادنبہ! انسانوں کی تذلیل کرنے والا، خدا کے سامنے تو ایسے کھڑا ہے جیسے بڑا عاجز بندہ ہے۔“ اس کے اندر غصے کی شدید لہر اٹھی تھی، وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

”مجھے بھی نہیں رہنا یہاں، کیا سمجھتے ہو تم خود کو، میری اتنی انسلٹ کرو گے اور میں پھر بھی بیٹھی رہوں گی، میری ایسی کوئی مجبوری نہیں۔“ وہ دل میں تہہ کر کے اٹھی اور دروازہ کھول کر باہر نکل گئی، اس کا پورا بدن ٹھکن سے چور تھا، تمام رات وہ بیٹھی روتی رہی تھی۔

”فروا تم.....؟“ امی اسے دیکھ کر گھبرا اٹھی تھیں اور اسے بھی اپنی حماقت اور جلد بازی پر

انسوس ہونے لگا تھا، کچھ بھی سوچے سمجھے بغیر وہ یہاں آ گئی تھی۔

”خیریت ہے نا؟“ وہ کھوجتی نظروں سے اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے پوچھیں۔

”آپ کی بہت یاد آ رہی تھی تو میں آ گئی۔“ اس نے بات بنانے کی کوشش کی، مگر ان کی تسلی نہ ہوئی تھی۔

”موسیٰ کو بتا کر آئی ہو؟“ ایک اور سوال کیا۔

”جی ای ا!“ وہ آگے بڑھی اور جا کر لیٹ گئی، اسی جگہ پر جہاں پر کل تک وہ سوئی تھی۔

”وہ نماز پڑھ رہے تھے، میں انہیں بتا کر آئی ہوں۔“ اس نے کبل اٹھا کر اوڑھ لیا، آنکھیں بند کرتے ہی آنسو ایک مرتبہ پھر پلوں کی باڑھ توڑ کر گالوں پر بہہ نکلے تھے۔

دوسری جانب موسیٰ علی نے نماز پڑھ کر دیکھا، وہ کمرے میں نہیں تھی، اسے فکر ہونے لگی کہ وہ اپنی امی کو کچھ نہ بتا دے، مگر اس وقت وہ کچھ نہ کر سکتا تھا، سو خاموش ہی رہا، جائے نماز رکھ کر وہ قرآن پاک پڑھنے لگا، مگر دھیان مسلسل اس کی طرف تھا۔

☆☆☆

”نویلہ تم عیسیٰ سے ملے گی تھی؟“ وہ بے چینی میں ادھر سے ادھر ٹہل رہی تھی جب صوفیہ اس کے روم میں آئیں، وہ چلتے چلتے رک گئی مگر جواب نہ دیا۔

”میں تم سے کچھ پوچھ رہی ہوں نویلہ!“ اب کی بار وہ ذرا سادھتی سے پوچھیں۔

”جی! اگلی تھی۔“ وہ بھی ٹھٹکی سے بھر پور لہجے میں بولی اور جا کر صوفیہ پر بیٹھ گئی۔

”کیوں؟“ انہوں نے مزید استفسار کیا۔

”یہ میں آپ کو نہیں بتا سکتی۔“ اس نے

صاف انکار کرتے ہوئے کہا، تو وہ حیران نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

”میں ماں ہوں تمہاری۔“ انہوں نے متاسف نظروں سے لاڈلی بیٹی کو دیکھا تھا۔

”آپ مزید میرا کام بگاڑیں گی، میں خود ہینڈل کر لوں گی سب، آپ پلیز عیسیٰ اور خالہ سے دور رہیں، وہ دونوں بہت زیادہ غصے میں ہیں۔“ انہوں نے دیکھا کہ نویلہ دن بدن بدخیز اور ضدی ہوئی جا رہی تھی۔

”تم بھی اسے نہیں مناسکتی، وہ ایسے نہیں ماننے والا اور پھر نویلہ کیا فائدہ ایسے شخص سے شادی کرنے کا جس کے دل میں کوئی اور ہے۔“ وہ جس کرب سے آج تک خود گزر رہی تھیں، انہیں چاہتی تھیں کہ وہی ان کی بیٹی کے نصیب میں لکھا جائے۔

”آپ نے بھی تو پاپا سے شادی کی تھی نا، ان کے دل میں ہی نہیں زندگی میں بھی کوئی اور تھا۔“ اس نے جتانے والے انداز میں کہا تھا۔

”اپنے تجربے سے ہی سیکھا ہے، ایسے مرد سے شادی کر کے عورت تمام تمام عمر نارسائی کے عذاب سے گزر رہی ہے، مرد اگر واقعی کسی عورت سے محبت کرنے لگے تو اسے اس کے دل سے نکالا نہیں جاسکتا، عیسیٰ اس دنیا کا آخری لڑکا نہیں ہے۔“ وہ اسے سمجھانے کی ہر ممکن کوشش کر رہی تھیں مگر انہیں اس میں کوئی کامیابی نظر نہ آ رہی تھی، وہ ان ہی کی طرح ضدی تھی۔

”میرے لئے ہے اور آپ سن لیں ماما۔“ اس نے ان کی آنکھوں میں دیکھا۔

”اگر عیسیٰ احمد میرا نا ہوا تو میں سوسائیز کر لوں گی۔“ اس کی بات نے انہیں ہلا دیا تھا، وہ خوفزدہ نظروں سے اسے دیکھ رہی تھیں۔

”دوبارہ ایسی فضول بات مت کرنا۔“

اہلوں نے متکثر نظروں سے اس کے خدی چہرے کو دیکھا تھا کچھ دیر خاموشی رہی اور پھر وہ باہر نکل گئیں۔

نویلہ نے اپنا موبائل اٹھایا اور عدیل کا نمبر ڈائل کرنے لگی، جو اس نے علیحدہ کے موبائل سے نکالا تھا، نورانی کال رسیو ہو گئی۔  
”السلام علیکم! عدیل بھائی!“ اس نے جھٹ سلام کیا۔

”نویلہ بات کر رہی ہوں۔“ اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر وہ بولی تھی۔

”ہاں نویلہ کہو۔“ اس کی کال سے عدیل کو اچھٹا ہوا تھا، کیونکہ اس سے پہلے تو اس نے اسے کبھی فون نہیں کیا تھا۔

”آپ میرا ایک کام کر سکتے ہیں؟“ وہ ہنسی انداز میں بولی تھی۔

”ہاں، بولو۔“ عدیل متحس ہوا۔

”مجھے عیسیٰ کا نمبر دے دیں، لیکن پلیز انہیں مت بتائے گا کہ میں نے آپ سے نمبر لیا ہے۔“ عدیل کسی حد تک اس کی عیسیٰ کے لئے پسندیدگی سے واقف ہو گیا تھا۔

”ٹھیک ہے میں تمہیں سینڈ کرتا ہوں۔“ اس نے کال بند کر دی اور اس کے ایک منٹ بعد ہی اسے نمبر مل گیا، دھڑکتے دل کے ساتھ اس نے نمبر ملایا تھا۔

☆☆☆

عروہ کو افسوس ہوا تھا کہ اس نے فارقلیط حسن کو فغا کر دیا تھا، وہ تو اس کا محسن تھا، اس سے محبت کرتا تھا مگر عروہ کو کب محبت پر یقین تھا، پھر بھی اسے فارقلیط حسن کے جذبات کی قدر تھی، وہ اس کی احسان مند تھی کہ مشکل وقت میں وہ اس کے کام آیا تھا، وہ بے چینی کے عالم میں ادھر سے ادھر ٹہل رہی تھی، مگر فارقلیط حسن نا آیا، عشاء کی

نماز پڑھ کر وہ اب گھڑی سامنے رکھے اس کی واپسی کی منتظر تھی، وقت جیسے جیسے گزر رہا تھا اس کی بے چینی اور پریشانی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔  
”کہیاں چلے گئے؟“ اسے سخت تشویش ہونے لگی تھی، نا تو اس کے پاس موبائل تھا، نا ہی فارقلیط حسن کا نمبر، گھڑی نے دس اور پھر گیارہ بجا دیے، سردیوں کی رات، ہر سوناٹا تھا، اتنا بڑا گھر اور وہ تنہا، ایسے گھبراہٹ کے مارے پیسے آنے لگے، لاؤنج میں لینڈ لائن فون پڑا تھا، مگر کس سے بات کرنی؟ کس سے پوچھتی، پریشانی اور بے بسی کے احساس سے اسے رونا آنے لگا تھا۔

”یا اللہ میری مدد کر، کیا کروں میں۔“ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تھے۔

”میرے پاس کھونے کے لئے اب کچھ بھی باقی نہیں ہے، یہ میرا آخری سہارا ہے، یہ مت چھیننا مجھ سے۔“ وہ رونے جا رہی تھی اور وقت گزرتا جا رہا تھا، اس نے ایک مرتبہ پھر گھڑی کی سمت دیکھا تھا جو رات کا ڈیڑھ بج رہی تھی۔

”نہیں اللہ میاں جی۔“ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی، بیڈ کے سامنے فلور کشن پر بیٹھی سر گھٹنوں میں دیے وہ زور زور سے رو رہی تھی۔

”فارقلیط حسن واپس آ جائیں، پلیز میرے ساتھ ایسا مت کریں، میرا آپ کے سوا کوئی نہیں ہے۔“ اس کے رونے میں شدت آتی جا رہی تھی، دفعتاً بیڈ روم کا دروازہ کھلا تھا اور فارقلیط حسن اندر داخل ہوا، جیسے ہی اس کی نظر عروہ پر پڑی وہ تیر کی سی تیزی سے اس کے قریب آیا۔

”عروہ!“ اس نے اسے ہکا بکا اور اس کے قریب زمین پر بیٹھ گیا، عروہ نے فوراً سر اوپر اٹھایا، فارقلیط حسن ہکا بکا رہ گیا۔

”What happened? is every thing alright“ اس کی حالت

پردہ سخت پریشان ہوا تھا۔

”کہیاں تھے آپ؟ کب سے آپ کا انتظار کر رہی ہوں، نا میرے پاس موبائل تھا، نا آپ کا نمبر، نا ہی کسی ایسے شخص کا نام یا نمبر جس سے آپ کے متعلق پوچھتی۔“ وہ ایک مرتبہ پھر چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا کر رونے لگی تھی، فارقلیط حسن شرمندہ ہوا تھا کہ وہ اس کی وجہ سے پریشان رہی مگر یہ بات اسے خوشگوار حیرت میں بھی مبتلا کر رہی تھی، اس نے عروہ کے چہرے سے دونوں ہاتھ ہٹائے تھے، اس کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔  
”سوری یار میں ضروری کام سے گیا تھا۔“ اس نے بات بتائی تھی۔

”میری یہاں جان پر بنی ہوئی ہے، نا تم دیکھا ہے آپ نے۔“ اس کے آنسو تھمنے کا نام نا لے رہے تھے، فارقلیط حسن نے ہاتھ بڑھا کر انسو پونچھنے کی کوشش کی مگر عروہ غصے سے اس کا ہاتھ جھٹک دیا، وہ ناراض دکھائی دیتی تھی۔

”رہنے دیں، اس ہمدردی کی ضرورت نہیں ہے مجھے، جھوٹ بولتے ہیں آپ، مجھ سے کوئی محبت نہیں ہے آپ کو۔“ اس کی بات پردہ ہنس دیا تھا۔

”اور تم بھی جھوٹ بولتی ہو مجھ سے محبت نہیں کرتی، میں تو سوچ رہا تھا تم سوری ہو گی، لیکن اب پتا چلا کہ ہے آگ دونوں طرف برابر لگی ہوئی۔“ وہ اسے چھیڑ رہا تھا اور عروہ کا پارہ ہائی ہونے لگا تھا، اپنے مزاج کے خلاف وہ اس وقت غصے میں آ گئی تھی۔

”اس بات کا کیا مطلب؟ ایک تو مجھے اتنا پریشان کیا؟ اوپر سے فضول باتیں کر رہے ہیں، مجھ سے بات نا کریں۔“ وہ وہاں سے اٹھی اور دور جا بیٹھی۔

”ہا ہا۔“ فارقلیط حسن نے زوردار قہقہہ لگایا

تھا۔

”بس کر دو اب، تم مزید اس محبت کو چھپا نہیں سکتی۔“ وہ لطف لیتا ہوا اٹھ کر اس کے قریب آ بیٹھا۔

”میں کوئی محبت و جت نہیں کرتی۔“ وہ سخت انکاری تھی، مگر مقابل بھی فارقلیط حسن تھا، بڑا گھٹاک اور زیرک تھا، لہجوں میں انسان کے اندر تک دیکھ لیتا تھا۔

”اچھا ادھر آؤ۔“ اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے دیوار گیر آئینے کے سامنے لے گیا۔

”یہ دیکھو اپنا حال۔“ اس کے کہنے پر عروہ نے آئینے میں دیکھا، اس کا حلیہ واقعی اجاڑ اور دیران تھا، آنکھیں بہت سرخ اور سوچی ہوئی تھیں۔

”میں واقعی بہت پریشان تھی، آپ کو احساس ہے؟“ وہ ایک مرتبہ پھر آنسو آنکھوں میں بھرتے ہوئے بولی تھی اور واپس جا کر بیڈ پر بیٹھ گئی۔

”سوری کہہ تو رہا ہوں؟“ وہ اس کے پیچھے آیا تھا۔

”آپ مسلسل میرا مذاق اڑا رہے ہیں۔“ وہ خفگی سے بھرپور لہجے میں بولی۔

”اُئی سوئیر میں مذاق نہیں اڑا رہا۔“ اب کی بار وہ سنجیدگی سے بولا تھا۔  
”مگر تم بھی مان جاؤ نا۔“

”جو بات ہے ہی نہیں اس کو کیوں مانوں۔“ وہ ابھی بھی انکاری تھی۔

”تمہیں پتا ہے تمہارے نام کا مطلب کیا ہے؟“ وہ اس کے برابر میں بیٹھ گیا اور بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائی۔

”جی پتا ہے۔“ مختصر جواب آیا۔

”کیا مطلب ہے؟“ اس نے اٹھا سوال

چھوڑا۔

☆☆☆

آج زین کا انٹرویو تھا، وہ خوب تیار ہو کر اور امی کی ڈیڑھوں دعائیں لے کر گھر سے نکلا تھا، ہاتھ میں فائل پکڑے اعتماد سے قدم اٹھا تا وہ کئی نگاہوں کا مرکز بنا ہوا تھا، اس کی سفید رنگت، لائٹ براؤن آنکھیں، دراز قامت اسے برکشش بناتے تھے، خوبصورت ستواں ناک اس کی نیچر اور مزاج کے خلاف کافی غرور اور شان سے چہرے پر کھڑی تھی، طبعاً وہ لاہالی سا لوجوان تھا۔

”السلام علیکم سراً“ اندر داخل ہوتے ہی اس نے سلام کیا تھا، موسیٰ علی نے سر سے پاؤں تک اس کا جائزہ لیا تھا۔

”وعلیکم السلام! Have a seat۔“ اس نے کرسی کی طرف اشارہ کیا اور زین بیٹھ گیا۔

”تھینک یو سر۔“ اس نے فائل اس کے سامنے میز پر رکھ دی اور موسیٰ علی کے ساتھ ساتھ آفس کا بھی جائزہ لینے لگا، اچانک موسیٰ علی نے سر اڑھا دیا۔

”آپ کا تعلیمی ریکارڈ بس نارل سیا ہے، بہت اچھا نہیں ہے۔“ اس نے زین کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”سر جس پوسٹ کے لئے میں نے اپلائی کیا ہے وہ بھی تو نارل سی ہے، بہت شاندار تو نہیں۔“ اس کے اتنے اعتماد سے اور صاف گوئی سے کہنے پر لمحہ بھر کو تو موسیٰ علی حیران رہ گیا، پھر فائل بند کر دی۔

”سر دیسے میں بہت انٹیلی جینٹس ہوں، بس پڑھائی کا اتنا مجھے شوق تھا، امی کی خواہش تھی پڑھوں اور چاب کروں، اپنے پاؤں پر کھڑا ہو جاؤں تو بس ٹھوڑا بہت پڑھ لیتا تھا۔“ وہ

کہا۔ ”محبت کرنے والی۔“ اس نے بناء توقف کے جواب دیا، فارقلیط حسن نے مسکراہٹ دبا کر اس کی جانب دیکھا۔

”غلط۔“ اس نے اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔ ”تو صحیح کیا ہے، آپ بتا دیں۔“ اس نے ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی۔

”شوہر سے محبت کرنے والی۔“ اس نے رخ پھیر کر فارقلیط حسن کی طرف دیکھا۔

”بیوی، میں نے کئی جگہوں سے چیک کیا، یہی مطلب ہے۔“ عروہ خاموش ہو گئی، مزید بحث کا ارادہ منوف کیا اور ایک گہری سانس فضا کے سپرد کی۔

”آپ کا نام بہت خوبصورت ہے، بہت یونیک سا، میں نے پہلے کبھی نہیں سنا، اس کا کیا مطلب ہے؟“ گویا اس کی ناراضی ختم ہو چکی تھی، فارقلیط حسن نے شکر ادا کیا تھا۔

”اچانک نیلی تو معنی مجھے بھی نہیں پتا ہیں، دراصل یہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نام ہے، جو بائبل میں لکھا ہوا ہے۔“ اس نے سنجیدگی کے ساتھ عزت و احترام سے جواب دیا تھا۔

”مجھے نیند آئی ہے، سونے لگی ہوں۔“ وہ لیٹ گئی تھی۔

”اچھا لڑائی تو ختم کر دنا۔“ وہ اسے منانے لگا تھا۔

”میری کوئی لڑائی نہیں ہے آپ سے۔“ وہ ابھی بھی غلطی سے بولی تھی۔

”اچھا چلو تمہیں کافی بنا کر پلاتا ہوں۔“ اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھایا جن کی طرف بڑھا۔

”فارقلیط حسن چھوڑیں، نیند آئی ہے مجھے۔“ مگر اس نے ایک ناسی اور ہنسن میں لا کر

صاف گوئی سے بولا۔

”پڑھائی بھی امی کی خواہش پر کی اور اب چاب بھی امی کی خواہش پر کر رہے ہو، تو آفس میں کام کیسے کرو گے؟“ موسیٰ علی نے اسے استفہامیہ نظروں سے دیکھا۔

”سر وہ میں کر لوں گا، ڈونٹ وری، آئی نو کہ چاب کروں گا تو ہی میری شادی ہوگی اور چاب تب ہی Continue رہے گی جب میں محنت کروں گا۔“

”اگر ہم آپ کو اپائنٹ کریں تو کیوں کریں؟ آپ کیسے خود کو Justify کریں گے In our woods آپ میں ایسا کیا خاص ہے کہ ہم آپ کو اپائنٹ کریں۔“ موسیٰ علی کو وہ خاص دلچسپ اور کام کا بندہ لگ رہا تھا، لہذا وہ اس سے سوال پر سوال کر رہا تھا، دوسری جانب بھی زین تھا، حاضر جواب پر اعتماد۔

”سر ایک تو میں خوبصورت بہت ہوں۔“ اس نے بات کا آغاز کیا۔

”اچھا تو آپ کی خوبصورتی کا ہمیں کیا فائدہ ہوگا؟“ موسیٰ علی اس کی بات پر حیران ہوا تھا۔

”دیکھیں سر اگر کوئی کہنی آپ کے ساتھ کانٹریکٹ کرنے لگے گی، یا کوئی بھی بزنس ڈیل کرنی ہوئی تو مجھے ساتھ رکھے گا، لوگ خوبصورتی سے بہت متاثر ہوتے ہیں، اس سے آپ کا بہت فائدہ ہوگا۔“ اس نے بہت سنجیدگی سے مذاق کیا تھا۔

”بزنس ڈیل کرنی ہے، رشتہ نہیں، جو آپ کی خوبصورتی سے متاثر ہوں گے۔“ موسیٰ علی نے بشکل اپنی ہنسی روک لی تھی۔

”سر ہو سکتا ہے کہ مجھے رشتہ بھی دے دیں، اس طرح آپ کے ساتھ ساتھ میرا بھی بھلا ہو

جائے گا۔“ وہ مزید شرارتی ہوا۔

”جتنی غیر سنجیدگی سے آپ یہ انٹرویو دے رہے ہیں آپ کو کیا لگتا ہے کہ آپ کو سلیکٹ کیا جائے گا؟“ موسیٰ علی ان اسے مزید چیک کرنا چاہا۔

”سر رنجکت کرنے کی کوئی وجہ مجھے نظر نہیں آتی۔“ وہ ذرا بھی نا جھجکا۔

”اور اگر میں کہوں کہ آپ کو رنجکت کیا جاتا ہے؟“ موسیٰ علی نے اس کی فائل بند کر کے میز پر اس کی جانب کھسکا دی۔

”تو سر آپ اپنا ہی نقصان کریں گے۔“ اس نے لا پرواہی سے شانے اچکاتے ہوئے کہا اور فائل اٹھا کر کھڑا ہو گیا۔

”We well call you۔“ موسیٰ علی نے رسی انداز میں کہا، زین ندیم سر ہلا کر باہر نکل گیا۔

☆☆☆

عینی احمد کا بخارا ترانے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا، نا ہی وہ میڈیسن کھا رہا تھا، ماما اس کی منتیں کرتے کرتے تھک گئی تھیں، مگر اس نے مان کر نا دیا۔

”عینیٰ میں نماز پڑھنے جا رہی ہوں، میرے آنے تک یہ سوپ لی لینا۔“ ماما اسے ہدایت جاری کر کے چلی گئی تھیں، مگر وہ ان سنی کر کے لینا رہا، اچانک اس کے فون کی بیل بجی، اس نے دھیان نادیا، مگر جب دوبارہ اور پھر سر بارہ کال آئی تو اس نے بیل فون اٹھا کر دیکھا۔

”ہیلو۔“ کوئی انجان نمبر تھا۔

”السلام علیکم! دوسری طرف سے آہنگی سے سلام کیا گیا، وہ پہچان نہ سکا۔

”کون؟“ اس نے استفسار کیا۔

”آپ کی طبیعت کیسی ہے اب؟“ اس

سوال پر وہ پہچان گیا تھا وہ نویلہ تھی۔

”میرا نمبر کہاں سے لیا ہے؟“ وہ درشتی سے بولا۔

”آپ کی فکر ہو رہی تھی، مجھے سے رہا نہیں گیا، اس لئے۔“

”جسٹ شٹ اپ نویلہ، زیادہ اسرارٹ بننے کی ضرورت نہیں ہے۔“ وہ دانت پیستے ہوئے سخت لہجے میں بولا تھا۔

”آپ اتنے ظالم تو نا تھے عیسیٰ! کم از کم بات ہی آرام سے کر لیں۔“ وہ اس کے طرز گفتگو پر دل گرفتہ ہوئی تھی، کال کرنے سے پہلے اسے اندازہ تھا کہ وہ اس سے ناراض ہوگا، ڈانٹے گا، مگر پھر بھی جب اس نے ڈانٹا تو اسے ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی بہت انہونی ہوئی ہے، جس کی اسے امید نا تھی۔

”جتنا بھی ظالم ہو جاؤں، تمہاری فیملی سے زیادہ نہیں ہو سکتا۔“ اس نے طنز کا شہر چھوڑا تھا۔

”میں اپنی فیملی جیسی نہیں ہوں، وقت ثابت کر دے گا آپ پر۔“ اس نے بہت بڑا دھوئی کیا تھا۔

”اوہ یہ۔“ عیسیٰ احمد نے سر جھکا۔

”سوئیٹلی ہی سہی، مگر تو تمہاری بہن، اس کے نوے خوابوں کی سلکتی راکھ پر غم اپنی خواہشوں اور آرزوؤں کا کل تعمیر کرنا چاہتی ہو، تم کیسے کہہ سکتی ہو کہ تم مختلف ہو اپنی فیملی سے، اس کے جانے سے تم نے سوچا کہ تمہارا راستہ صاف ہو گیا، کوئی فرق نہیں تم میں اور تمہارے گھر کے باقی افراد میں۔“ عیسیٰ احمد نے اسے آئینہ دیکھانے کی کوشش کی تھی، لحظہ بھر کو وہ چپ رہ گئی، جیسے کچھ سوچ رہی ہو۔

”میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ میں آپ سے محبت.....“

”اپنی خود غرضی اور ضد کو محبت کا نام مت دو، محبت کرنے والوں کے دل بہت نرم ہوتے ہیں، وہ کسی دوسرے کو تکلیف میں مبتلا نہیں دیکھ سکتے، ان فیکٹ تمہاری فیملی اس لفظ کے لہجوں سے بھی واقف نہیں ہے۔“ نویلہ کے منہ سے اظہار محبت اسے تپا گیا تھا، وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ خود غرض اور ظالم ماں باپ کی بیٹی ہے، جنہیں صرف اپنی خواہشوں سے پیار ہے، جنہیں کسی کے جیسے یا مرنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

”میں جانتی ہوں آپ میرا یقین نہیں کریں گے، مگر پھر بھی آپ جو کئی بار بتا چکی ہوں کہ عروہ کے ساتھ جو ہوا اس کے متعلق میں بھی اسی طرح بے خبر تھی جیسے آپ، مجھے نہیں معلوم تھا کہ.....“

”بہتر ہوگا کہ عروہ کو بچ میں مت لاؤ، اس کا نام سنتے ہی میرے اندر تم لوگوں کے لئے نفرت کا احساس مزید بڑھنے لگتا ہے، جی چاہتا ہے کہ ہر چیز کو جس نہس کر دوں۔“ نویلہ کی محبت جیسے جیسے اس کے لئے شدت اختیار کر رہی تھی، عیسیٰ احمد کی نفرت اسی تیزی سے بڑھ رہی تھی۔

”محبت کا نا سہی، نفرت کا ہی سہی، چلیں کوئی تعلق تو ہے ہم میں۔“ وہ آنسو ضبط کرتے ہوئے بولی۔

”نا تو میں تمہاری ایسی باتوں سے متاثر ہونے والا ہوں اور نا ہی نرم، جنہیں جتنی بھی کوشش کرتی ہے کر لو۔“ اس نے فون بند کر دیا تھا، اسے نویلہ سے کسی طرح کا لگاؤ محسوس نہیں ہوتا تھا، اس کے معاملے میں اس کا دل پتھر سے پتھر ہوتا جا رہا تھا، اس کے لوح دل پر اگر کوئی نام نقش تھا تو وہ صرف عروہ غنفر کا تھا، جسے کوئی بھی مٹا ہی نہیں سکتا تھا، مگر رتا وقت اس کی محبت میں مزید اضافہ کر رہا تھا، اس کی یاد ایک تڑپ اور کلک بن کر ہر وقت اس کے ساتھ رہتی تھی،

اسے سوچنا، اسے یاد کرنا عیسیٰ احمد کو بہت اچھا لگتا تھا۔

☆☆☆

فردا کو نمبر پتھر تھا، موسیٰ علی آفس جاتے ہوئے مصعب کو ایکسی میں چھوڑ گیا تھا، اس وقت فردا سو رہی تھی، آفس سے واپس آ کر وہ سیدھا دہن آیا تھا، سامنے ہی ساجدہ بیٹھی ہوئی تھی، وہ ان کے پاس آ گیا۔

”السلام علیکم!“ مصعب نے اسے دیکھتے ہی شور مچانا شروع کر دیا، وہ اسے پاپا کہنے لگا تھا، موسیٰ علی نے آگے بڑھ کر اسے اٹھایا تھا۔

”علیکم السلام، چیتے رہو۔“ وہ خوش دلی سے مسکرائیں۔

”آؤ بیٹھو۔“ انہوں نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

”نہیں، وہ میں بس ان دونوں کو لینے آیا تھا، آفس سے سیدھا ادھر آیا ہوں۔“ اس نے انکار کیا۔

”فردا کو تو بہت تیز بخار ہے، صبح سے بے سدھ پڑی ہے، اس کے ماموں بھی کسی ضروری کام سے گھٹے ہوئے ہیں صبح سے، میں نے کہا میں ڈاکٹر کے پاس لے جاتی ہوں، مگر مان ہی نہیں رہی، بس خاموش لیٹی ہے، کچھ کھا لی بھی نہیں رہی۔“ وہ ماں تھیں، ان کے دل میں سو طرح کے اندیشے اور دوسو سے زائد تھے، سارا دن وہ پریشان ہی تھیں، اب جو موسیٰ علی کو سامنے دیکھا تو ان سے رہا نا گیا اور بس کہہ نکلیں۔

”سردی بھی کالی ہے، اسی لئے نمبر پتھر ہو گیا ہوگا۔“ اس نے انہیں مطمئن کرنے کی کوشش کی، مگر وہ نا جانتا تھا کہ ماں کا دل اتنی آسانی سے مطمئن نہیں ہوتا۔

”بیٹا یہ کون سا سردی میں پھرتی رہی ہے،

کل یہاں سے جب گئی ہے تو بالکل ٹھیک تھی طبیعت، پھر آپ نے کون سا سردی میں بٹھایا ہو گا، پتا نہیں کیا ہوا، میں تو بہت پریشان ہوں۔“ ان کی باتوں نے اسے دل ہی دل میں سخت شرمندہ کیا تھا، مگر اس بات پر اس نے شکر ادا کیا تھا کہ فردا نے اپنی امی کو کچھ نا بتایا تھا، اگر وہ بتا دیتی تو وہ بھی ان کے سامنے سراٹھا کر کھڑا نا ہو سکتا تھا۔

”میں دیکھتا ہوں۔“ اس سے کوئی جواب نا بن پڑا تو مصعب ان کو پکڑا کر اندر کی جانب بڑھا، سامنے ہی وہ کبل سر تک تانے پڑی ہوئی تھی۔

”فردا!“ موسیٰ علی اس کے پاس جا کھڑا ہوا اور اسے آواز دی، مگر جواب نادر۔

”فردا اٹھو تمہیں ڈاکٹر کے پاس جانا ہے۔“ اس نے دوبارہ آواز دی، مگر اس نے کوئی جواب نا دیا اور نا ہی اس کے وجود میں کوئی جنبش ہوئی۔

”میں جانتا ہوں تم جاگ رہی ہو اور میری بات سن رہی ہو، منہ سے کبل ہٹاؤ۔“ وہ آہستہ آواز میں نرمی سے بولا، مگر وہ اسی طرح لیٹی رہی۔

”دیکھو فردا.....“ اس نے کبل اس کے چہرے سے ہٹایا اور بولتے ہوئے اچانک اس کی زبان بند ہو گئی، اس کا چہرہ بہت سرخ ہو رہا تھا، آنکھیں بے حد سرخ ہو رہی تھیں۔

”فردا!“ وہ کرسی کھینچ کر اس کے قریب بیٹھ گیا اور ایک مرتبہ پھر اسے آواز دے ڈالی، مگر وہ کسی بے جان وجود کی طرح پڑی ہوئی تھی۔

”آنکھیں تو کھولو پارا!“ اس نے ہاتھ اس کی پیشانی پر رکھا اور نور اوپس کھینچ لیا، اسے بہت بخار تھا، اس کا وجود کونکوں کی مانند دھک رہا تھا، موسیٰ علی کو شرمندگی نے آن گھیرا، وہ جانتا تھا اس

سب کا ذمہ دار وہ ہے۔

”فردا! پلیز میری بات سنو۔“ موسیٰ علی نے ہولے سے اس کا گھل تھپتھپایا، وہ ذرا سا کسمپاسی، اس نے پھر اسے آواز دی، اب کی بار اس نے لمحہ بھر کو آنکھیں کھولیں، اس کی آنکھوں میں موجزن حزن و ملال اسے صاف دکھائی دے رہا تھا، موسیٰ علی نے دیکھا اس کی آنکھیں بہت زیادہ سرخ ہو رہی تھیں، اس نے دوبارہ آنکھیں موند لیں۔

”فردا بات سنو پلیز۔“ اس نے ہاتھ ایک مرتبہ پھر اس کی پیشانی پر رکھا تھا، جسے فردا نے بغیر کسی لحاظ کے جھٹک دیا تھا۔

”آپ نے جتنا مجھے سنا تھا سنا چکے، اب خاموشی سے یہاں سے چلے جائیں، ورنہ میں امی کو سب کچھ بتا دوں گی۔“ اس نے زہر آلود نظروں سے موسیٰ علی کو دیکھا اور دوبارہ کمرل سر تک تان لیا، چند ثانیے وہ خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا، پھر ہمت کر کے دوبارہ گویا ہوا۔

”میرے ساتھ گھر چلو، وہاں جا کر جو مرضی کہہ لیتا۔“ وہ مصالحت آمیز انداز میں بولا تھا، مگر فردا کسی طور پر ماننے کو تیار نہ تھی، سو خاموش رہی کچھ دیر وہ بیٹھا رہا اور پھر اٹھ کر باہر آ گیا، مصعب کو اٹھایا اور باہر کی جانب بڑھا۔

”بالکل بچوں جیسی ہے، بعد ہے کہ ڈاکٹر پاس نہیں جانا، میں میڈیسن لا دیتا ہوں، آپ اسے کھلا دیں۔“ وہ باہر نکل گیا تھا، امی نور فردا کے پاس آئی تھیں۔

”فردا! مجھے سچ بتاؤ کیا ہوا ہے؟ تم کیوں نہیں مگنی اس کے ساتھ، میرا دل ہول رہا ہے، میں مزید دکھ نہیں اٹھا سکتی۔“ وہ اس کے پاس بیٹھ کر منت بھرے انداز میں بولیں تو فردا کو ان پر ترس آ گیا، وہ صبح سے اس کی منتیں کر رہی تھیں،

کبھی کچھ کھانے کے لئے، کبھی میڈیسن لینے جانے کے لئے۔

”امی میں ٹھیک ہو جاؤں گی، میڈیسن کی ضرورت نہیں ہے، آپ خواہ مخواہ کیوں پریشان ہو رہی ہیں، میری طبیعت ٹھیک ہوگی تو میں چلی جاؤں گی، ابھی آپ کے پاس رہنا چاہتی ہوں، آپ پتا نہیں کیا سوچ رہی ہیں، موسیٰ بہت اچھے ہیں، آپ کو فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔“ اس نے انہیں تسلی دینے کے لئے کہا۔

”فردا میں نے زندگی میں بہت دکھا اٹھائے ہیں، میرے پاس اب تمہارے سوا اور کوئی نہیں ہے، میں نے ہمیشہ کوشش کی ہے، کہ تمہیں کوئی دکھ اور پریشانی نا ہو، پتا نہیں کیوں جب سے تم آئی ہو مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے میں نے غلط فیصلہ کیا ہے تمہارے لئے موسیٰ کا رشتہ قبول کر کے۔“ ان سے رہنا مان گیا اور اندیشہ ان کی نوک زبان پر آئی گیا اور تب فردا کو اپنی غلطی کا احساس ہوا، وہ جانتی تھی اس کی ماں آل ریڈی بہت پریشان ہے، وہ انہیں مزید پریشان نہیں دیکھ سکتی تھی۔

”امی آپ کا فیصلہ بہت اچھا ہے، آپ کو بلاوجہ وہم ہو رہے ہیں، موسیٰ ہمارے لئے کوئی انجان تو نہیں ہیں، ہم برسوں سے انہیں جانتے ہیں، کیا آپ کو ان کی شرافت اور اچھائی پر کوئی شک ہے؟“ اس نے ماں کو مطمئن کرنے کی ہر ممکن کوشش کر ڈالی۔

”فردا تمہارے ابو آئے تھے کل۔“ انہوں نے اچانک ہی کہا تھا، فردا لب بلبھیج کر رہ گئی۔

”تمہارے ماموں نے انہیں بے عزت کر کے نکال دیا۔“ وہ افسردگی سے بولیں۔

”امی پہلی بات تو یہ کہ میں اس شخص کو اپنا باپ تسلیم نہیں کرتی۔“ وہ نفرت سے بولی۔

”دوسری بات یہ کہ ماموں نے بہت اچھا کیا ہے، جو جس قابل ہوا سے دیے ہی ٹریٹ کرنا چاہیے۔“ اس کی بات سن کر وہ بالکل خاموش رہ گئیں۔

”کیا ابھی بھی آپ کے دل میں اس شخص کے لئے کوئی یزیم کوشہ ہے؟“ اسے امی کے رویہ پر حیرت ہوئی تھی۔

”فردا میں اس شخص کو اپنے دل سے نکال چکی ہوں، مجھے صرف اپنی بیٹی کی فکر ہے، میں عروہ سے ملنا چاہتی ہوں۔“ انہوں نے اسے بتایا۔

”تو ٹھیک ہے، ان سے کہیں عروہ کو آپ کے پاس لے آئیں، جب وہ آپ سے ملے گی تو یقیناً آپ کے پاس ہی رہے گی، کیونکہ اسے انہوں نے یہی بتایا ہے کہ اس کی ماں اس دنیا میں نہیں ہے۔“ وہ امی سے باتیں کر رہی تھی جب موسیٰ علی میڈیسن لے کر آ گیا تھا، وہ قصد اس کی جانب دیکھنے سے اجتناب کر رہی تھی، موسیٰ علی نے میڈیسن رکھی اور مصعب کو لے کر باہر کی جانب بڑھا۔

”مما! مصعب، فردا کے پاس آنے کے لئے بے چین ہو رہا تھا، موسیٰ علی رک گیا۔

”بیٹا! ممما کو بخار ہے، وہ میڈیسن کھا کر آرام کریں گی۔“ اس نے بیٹے کو پیار سے سمجھایا، مگر وہ فردا کے پاس جانے کے لئے ضد کر رہا تھا، وہ انجان بنی لیٹی رہی۔

”موسیٰ، بیٹھ جاؤ بیٹا میں چائے بنا کر دیتی ہوں آپ کو۔“ امی اپنی جگہ سے اٹھی تھیں، موسیٰ علی بخور فردا کی جانب دیکھ رہا تھا جو اس کے ساتھ مصعب کو بھی اگنور کر رہی تھی۔

”شکریہ آئی اس کی ضرورت نہیں ہے۔“ وہ روتے ہوئے بیٹے کو سینے سے لگائے باہر نکل

گیا۔

☆☆☆

عروہ نے ملازم کو بھیج کر لکھنے کا سامان منگوایا تھا، فارقلیط حسن گھر پر نہیں تھا، وہ صوبہ میں پیٹھی ناول لکھ رہی تھی۔

”فائزہ اس کی بہترین دوست تھی، جسے وہ سگی بہنوں سے بڑھ کر چاہتی تھی، فائزہ بھی اس سے بہت محبت کرتی تھی، مگر کل رات والے واقعے کے بعد اسے پتا چلا کہ اس سے کوئی بھی محبت نہیں کرتا، فائزہ بھی نہیں، محبت بھی ہمارے لئے آکسیجن کی طرح ہوتی ہے، جو اگر ملتی رہے تو دل کی سر زمین پر سرسبز و شاداب رہتی ہے اور اگر نالے تو دل بخر اور ویران ہو جاتا ہے، اس پر زندگی کے آثار ختم ہونے لگتے ہیں، کچھ ایسا ہی وہ بھی محسوس کر رہی تھی۔“

عروہ غصہ کو بالکل اندازہ ہی نا ہو سکا اور فارقلیط حسن اس کے سر پر پٹخ گیا، اس نے جلدی سے ہال پوائنٹ بند کر دی اور رائٹنگ پیڈ کو گود میں الٹا کر کے رکھ دیا، فارقلیط حسن نے فوراً محسوس کر لیا کہ وہ کچھ چھپا رہی ہے۔

”ہیلو سزا!“ وہ اس کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔

”کیا ہوا رہا ہے؟“ اس نے اس کی گود میں پڑے رائٹنگ پیڈ کی طرف اشارہ کیا۔

”کچھ..... نہیں، کچھ خاص نہیں۔“ وہ ذرا سا گڑبڑائی مگر پھر خود کو سنبھال کر گویا ہوئی۔

”تمہیں ایک اہم بات بتانی تھی؟“ اس کا دھیان ابھی بھی رائٹنگ پیڈ کی طرف تھا، اسے تجسس تھا کہ عروہ کیا لکھ رہی تھی، مگر وہ فی الفاظ اسے کچھ نا کہہ سکا۔

”جی! بتائیے۔“ وہ پوری طرح اس کی جانب متوجہ تھی، درحقیقت وہ اس کی توجہ اپنے

ناول سے ہٹانا چاہتی تھی جو کہ اسے خاصا مشکل دکھائی دے رہا تھا۔

”میں نے ڈیڈ کو بتا دیا ہے کہ میں نے شادی کر لی ہے۔“ اس کی بات پر عروہ نے چونکتے ہوئے اس کی طرف دیکھا مگر بولی کچھ نہیں۔

”اور میری توقع کے عین مطابق وہ مجھ سے سخت خفا ہیں، ان فیکٹ بات ہی نہیں کر رہے۔“ عروہ کو شرمندگی نے آن گھیرا، اسے کچھ سمجھنا آ رہا تھا کہ کیا کہے، سو وہ خاموش بیٹھی رہی۔

”آپ کو ابھی انہیں بتانا نہیں چاہیے تھا، واپس آ جانے دیتے۔“ کانی دیر خاموش رہنے کے بعد وہ گویا ہوئی۔

”میرا ابھی کوئی ارادہ نا تھا، مگر ڈیڈ کے فریڈ رنچ انکل نے ڈیڈ کو بتایا کہ فارقلیط کے ساتھ آج کل گھر میں کوئی لڑکی رہ رہی ہے، مجبوراً مجھے ڈیڈ کو حقیقت بتانی پڑی، وہ سن کر بہت ناراض ہوئے، کہتے ہیں میں اب بھی واپس نہیں آؤں گا۔“ عروہ کو تو بہت کمینشن ہونے لگی۔

”اب کیا ہوگا؟“

”جہنیں اس لئے نہیں بتایا کہ تم پریشان ہو، جہنیں بتانے کا مقصد یہ ہے کہ ہمیں ڈیڈی کے پاس جانا ہوگا، وہ مجھ سے بھی ناراض نہیں ہوئے، آج تک میری ہر غلط حرکت کو انہوں نے انکوری کیا ہے، مگر اب کی بار تو میں نے ایک جائز کام کیا ہے، مگر وہ.....“ اتنا کہہ کر فارقلیط حسن خاموش ہو گیا تھا۔

”آپ ان کے اکلوتے بیٹے ہیں، آپ کی شادی کے حوالے سے انہوں نے بہت سے خواب دیکھے ہوں گے، ان کی ناراضی بجا ہے۔“

عروہ ان کی سائیڈ لیتے ہوئے بولی۔

”مجھے یقین ہے کہ تم سے مل کر تمہیں دیکھ کر

ان کی ناراضی ختم ہو جائے گی۔“ عروہ نے کوئی جواب نہ دیا۔

”آج تمہارے ہاتھ کی چائے پینے کا دل چاہ رہا ہے۔“ عروہ کی پریشانی کو بھانپتے ہوئے وہ اسے ریٹیکس کرنے کے لئے بلاشت سے مسکراتے ہوئے فرمائش کرنے لگا۔

”میں بنا دیتی ہوں۔“ وہ اٹھتے ہوئے بولی۔

”یہ رائٹنگ پیڈ مجھے دیتی جاؤ، تمہارے آنے تک میں بوریت سے بچا رہوں گا۔“ اس کی چالاکی پر وہ ہنس دی۔

”آپ بوریت سے بچنے کے لئے موبائل پر ٹیکس کھیل لیں۔“ مسکراہٹ دبا کر کہتے ہوئے وہ اندر چلی گئی، کچھ ہی دیر میں فارقلیط حسن بھی کچن میں آ گیا تھا، وہ چائے بنا چکی تھی، فارقلیط حسن نے اسے موبائل فون دیا جو وہ ابھی اس کے لئے خرید کر لایا تھا۔

”چائے بہت مزیدار ہے۔“ فارقلیط حسن نے ایک سیپ لے کر کہا۔

”اگر اس میں شوگر ہو تو اور مزے کی لگے۔“ عروہ نے چونک کر اس کی جانب دیکھا تھا۔

”اوہ، آئے ایم سوری، میں شوگر ڈالنا بھول گئی۔“ اس نے کپ فارقلیط حسن کے ہاتھ سے پکڑ لیا۔

”تم وڈ آؤٹ شوگر چائے پیتی ہو؟“ عروہ شوگر کس کر رہی تھی اس کی بات پر اس نے کوئی جواب نہ دیا، فارقلیط حسن نے کپ اٹھا کر لبوں سے لگا لیا۔

☆☆☆

انگل پر لگا زخم بہت چھوڑا اور معمولی تھا، دل پر لگا زخم بہت بڑے اور گہرے تھے، جو کبھی

مندبل نا ہو سکے تھے اور روح تو قدم قدم پر گھماٹل ہوئی تھی، اسے آج تک سمجھ نا آئی تھی کہ اس کے ساتھ زندگی نے ہمیشہ برائی کیوں کیا ہے۔

”آہ۔“ اس کے سینے سے ایک بوجھل سانس برآمد ہوا تھا، دل دکھ سے بڑھ چلا تھا تو بدن جھکن سے چور اور جب اپنی منزل کا بھی علم نا ہو، یہ بھی معلوم نا ہو کہ باقی کتنا سفر رہ گیا ہے تو تنھن اور بڑھ جاتی ہے، اس کے قدم بھی فکلتہ تھے، اسے آج تک سب نے دھتکارا تھا، ہر شے نے ٹھکرایا تھا، مگر ایسا تو اس نے بھی نا سوچا تھا کہ اس کے بچے بھی اسے ضرورت کے وقت دھتکار دیں گے۔

”کیا تم لوگوں کے دل میں بھی میرے لئے محبت نہیں ہے۔“ وہ خود کلامی انداز میں بڑبڑاتی تھی، شوہر نے گھر سے اور زندگی سے نکالا، تو بیٹے کا خیال آیا، اس نے بھی ٹھکرایا تو اسے یقین تھا کہ بیٹی اسے ضرور اپنائے گی، اپنے پاس لے جائے گی، اگرچہ وہ بیٹی کے گھر جانا نہ چاہتی تھی، تاہی اس شخص کا سامنا کرنے کی اس میں ہمت تھی، مگر فی الوقت اس کے پاس کوئی ٹھکانہ نا تھا، سو بیٹی کا گھر بھی غنیمت محسوس ہو رہا تھا، مگر تب اس کے دکھ اور حیرت کی انتہا نا رہی تھی جس اس نے بھی وہی سب کہا جو اس کے بیٹے نے کہا تھا۔

”کہاں جاؤں میں؟“ وہ خود سے سوال کرنے لگی تھی، اسے کچھ سمجھ نا آ رہا تھا کہ کیا کرے۔

”کیا میرے لئے موت بھی نہیں ہے؟“ اس لمحے اس کے دل نے شدت سے مر جانے کی خواہش کی تھی، کیونکہ وہ جان تھی کہ زمین اس پر تنگ ہو چکی ہے، اس کا اس دنیا میں کوئی نہیں ہے اور اس کا تو دنیا میں کوئی بھی تھا ہی نہیں، بس

وہ خوش گمانیوں میں جیتی رہی تھی، ہمیشہ کی طرح دل کی یہ خواہش بھی پوری ہوئی دکھائی نا دیتی تھی، اسے ابھی اور جینا تھا اور دکھا اٹھانے تھے۔

☆☆☆

صوفیہ نے ہر طرح سے غنفر علی کو منانے کی کوشش کر ڈالی تھی مگر انہوں نے مان کر نہ دیا، وہ ان سے بات ہی نا کر رہے تھے، سارا دن آفس میں گزارنے کے بعد شام بھی گھر سے باہر گزارتے اور رات کا کھانا بھی باہر سے کھا کر آتے، گھر آتے ہی اسٹڈی میں محسوس جاتے اور رات وہیں بسر کرتے، صوفیہ کے لئے یہ وقت انتہائی کڑا تھا، دولوں بیٹیاں تھی ان سے خاتمیں اور شوہر تو بات کرنا درکنار ان کی شکل بھی دیکھنے کے روادار نا تھے۔

اس پر عدیل کا علیشہ کے لئے رشتہ آنا غضب ثابت ہوا، غنفر علی آفس سے واپس آئے تو ان کا موڈ سخت آف تھا، وہ گل افزاء سے ملنے گئے تھے، مگر پچھل بار کی طرح اب بھی انہوں نے ملنے سے انکار کر دیا تھا، دل میں صوفیہ کے لئے ڈیرد نفرت لئے وہ گھر آئے تھے اور سامنے جو منظر تھا وہ ان کی برداشت سے باہر تھا۔

عدیل اپنے والدین کے ہمراہ وہاں موجود تھا، علیشہ بھی بیٹھی ہوئی تھی اور وہ سب چائے پیتے ہوئے خوش گپیوں میں مصروف تھے، علیشہ بہت خوش دکھائی دے رہی تھی، صوفیہ بھی مطمئن تھی۔

”غنفر بھائی ہم ابھی نہ آتے، جانتے ہیں یہ مناسب وقت نہیں، آپ بہت بڑی اذیت سے گزر رہے ہیں، مگر دراصل عدیل کا باہر جانے کا پلان ہے اور جانے سے پہلے ہم اس کی شادی کرنا چاہتے ہیں۔“ بات کا آغاز عدیل کے پاپا نے کہا تھا، علیشہ نے اپنے باپ کے سنجیدہ چہرے



کو دیکھا، صوفیہ بالکل خاموش بیٹھی ہوئی تھیں، غففر علی نے کوئی جواب نہ دیا اور اٹھ کر اندر چلے گئے، کچھ ہی دیر میں صوفیہ بھی ان کے پیچھے آئیں۔

”غففر اس طرح تو مت کریں، میرے بھائی نے اتنے مان سے.....“

”جسٹ شٹ اپ صوفیہ!“ وہ زور سے دھاڑے۔

”اگر تم میں ذرا سی بھی انسانیت ہے تو چلی جاؤ یہاں سے، میں نے انی مل تمہاری شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتا۔“ وہ نفرت سے پھکارے تھے، صوفیہ چند لمحے خاموش رہیں، جیسے سوچ رہی تھیں کہ اب کیا بات کریں۔

”مجھ سے نفرت ہے، اپنی بیٹیوں سے تو نہیں نا۔“

”تم سے منسلک ہر چیز سے نفرت ہے مجھے۔“ وہ بولے۔

”غففر!“ صوفیہ بے یقینی سے انہیں دیکھ رہی تھیں۔

”اگر آپ کے یہ الفاظ آپ کی بیٹیوں نے سن لئے تو۔“ وہ جیسے انہیں احساس دلانا چاہ رہی تھیں کہ انہوں نے بہت غلط بات کی ہے، مگر ان کا قصہ اس بات سے مزید بڑھ گیا تھا۔

”سنی ہیں تو سن لیں، کیا فرق پڑتا ہے، اگر محل افراد یہ سن سکتی ہے کہ اس کا شوہر اسے بے وفا سمجھتا ہے، اس کا شوہر دوسری شادی کر چکا ہے، اگر عروہ یہ سن سکتی ہے کہ اس کا باپ اسے بد کردار سمجھتا ہے، اس سے پوچھنے بغیر اس کا ہاتھ کسی اجنبی کے ہاتھ میں دے رہا ہے تو تمہاری بیٹیاں کیوں نہیں کچھ سن سکتیں۔“ صوفیہ جھٹکتی تھیں کہ ان کی بیٹیاں ان کے لئے بہت خاص اور قیمتی مہرے ہیں، جنہیں وہ کسی ایسے ہی وقت پر

استعمال کر سکتی ہیں، مگر اب انہیں اندازہ ہوا تھا کہ غففر علی کے سامنے وہ بے بس ہوتی جا رہی تھیں۔

”خدا کے لئے غففر میری غلطی کی سزا میری بیٹیوں کو مت دینا۔“ وہ منت کرنے لگیں۔

”تم نے غلطی نہیں، گناہ کیا ہے اور گناہوں کی سزا انسان نہیں خدا دیتا ہے، اس سے دعا کرو کہ تمہارا کیا تمہاری بیٹیوں کے سامنے نہ آئے۔“ وہ اس قدر ٹھور ہو گئے تھے، صوفیہ کو یقین نا آتا تھا، نوبلہ میں تو ان کی جان تھی، مگر جان تو محل افزاء میں بھی تھی، اگلے ہی لمحے انہیں یاد آ گیا تھا۔

☆☆☆

فارقلید حسن کیسی ضروری کام کے سلسلے میں گیا ہوا تھا، عروہ بخت گھبراہٹ اور بے چینی محسوس کر رہی تھی، وہ ذرا بیور کے ساحل سمندر پر آگئی۔

”آپ جاؤ، میں خود واپس آ جاؤں گی۔“ وہ تنہا کھڑی سمندر کے نیلے سینے پر بے چینی سے تڑپتی لہروں کو دیکھ رہی تھیں۔

”اللہ!“ اس نے آسمان کی جانب نگاہ اٹھائی تھی، اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تھے، کئی دنوں کا غبار تھا، جو اس وقت آنسوؤں کے رستے نکل رہا تھا، وہ اگر گرد سے مکمل طور پر انجان اور بے نیاز کھڑی تھی، اس کا وجود ایک بڑی اور گرم شال میں لپٹا ہوا تھا، ماضی کسی فلم کی طرح اس کی نظروں کے سامنے گھوم رہا تھا۔

”عروہ!“ اسے کسی نے پکارا تھا، مگر وہ سن ناپائی اور ویسے ہی پتھر کی مورلی بنی کھڑی رہی۔

”عروہ!“ پکارنے والا اب اس کے عین سامنے کھڑا تھا اور اسے دیکھ کر وہ اچانک جیسے بے ہوشی سے پورے ہوش میں آئی تھی۔

”پلیز ایک بار میری بات سن لیں۔“ وہ منت کرنے لگا۔

”میں آپ کو نہیں جانتی۔“ وہ روکھائی سے بولی۔

”مگر میں آپ کو جانتا ہوں۔“ عیسیٰ احمد نے ہمت کرتے ہوئے کہا۔

”آپ صرف ایک دفعہ میری بات سن لیں پھر میں دوبارہ بھی آپ کے سامنے نہیں آؤں گا۔“ اس نے عروہ کے سامنے ہاتھ جوڑے تھے، وہ رخ پھیر گئی تھی۔

”آپ جانتی ہیں میں اتنا برا ہرگز نہیں ہوں، پھر کیا میں آپ کے ساتھ ایسا کر سکتا ہوں؟“ وہ اس سے جواب مانگ رہا تھا، عروہ غففر اس کی جانب دیکھ نہیں رہی تھی۔

”میں نہیں جانتی آپ کیسے ہیں، مگر اتنا ضرور پتا چل گیا کہ میرے ساتھ آپ نے برا کیا ہے اور اس کی وجہ پتا ہے کیا ہے؟“ اس نے اتنے وقت میں پہلی بار عیسیٰ احمد کی آنکھوں میں جھانکا تھا، وہ ہر تن گوش تھا، اس کے لئے تو یہ غیبت تھا کہ وہ بات کرنے پر آمادہ تو ہوئی تھی۔

”میں نے غلطی کی، بہت بڑی غلطی، ایک نامحرم پر اعتبار کیا، اکیلے میں اس کی بات سنی، مجھے اس کی سزا ملی، ایسی سزا جس کا میں نے تصور بھی نہیں کیا تھا، میں کبھی گزند سے فریج نہیں ہوئی، بات بھی نہیں کی، مجھے آپ سے بھی نہیں کرنی چاہیے تھی، مگر آپ بنا اجازت میرے پاس آ جاتے تھے اور میری نرم طبیعت کسی کی انسلٹ کر کے، اس کی عزت نفس کو مجروح کرنا گوارہ نہیں کرتی تھی۔“ وہ بات مکمل کر کے واپس مڑی تھی اور تیز تیز قدم اٹھاتی اس سے دور ہونے لگی تھی، عیسیٰ احمد یکدم ہوش میں آیا تھا، وہ اس سے دور ہو رہی تھی، وہ بھاگ کر اس کے قریب آیا

تھا۔

”عروہ!“ اس نے ایک مرتبہ پھر اسے پکارا تھا۔

”عیسیٰ احمد میرا چچا کرنا چھوڑ دیں، ورنہ میں یہ سمجھوں گی کہ میں ایک اچھی لڑکی نہیں ہوں، ایک اچھا شخص میری وجہ سے بھگ گیا۔“ وہ ہر بار اس کی اذیت اور پچھتاوے بڑھا دیتی تھی۔

”جائیں میں نے آپ کو معاف کیا، میں نے مان لیا آپ بے قصور ہیں۔“ اس نے منوں بوجھ اس کے سینے پر رکھ دیا تھا۔

”مجھے معاف نا کرو عروہ، پلیز۔“ وہ آنکھوں کی سطح پر تیرتی نمی کو اس سے چھپاتے ہوئے بولا۔

”اس سے میرا دکھ، احساس جرم اور بڑھ رہا ہے۔“ اس کی آواز بھاری ہونے لگی تھی۔

”میں سب کو معاف کیسے بنا سونہیں سکتی، اتنے دنوں سے آپ کو اور ماما کو معاف نہیں کر پا رہی تھی اور ٹھیک سے سو بھی نہیں پا رہی تھی، آج میں نے آپ دونوں کو معاف کیا۔“ اس نے ایک لمبی سانس فضا کے سپرد کی تھی۔

”ہیں معاف مت کرو، اتنا بڑا احسان مت کرو عروہ، جس کا بدلہ ہی نا چکا سکوں، تم اپنے دل کا بوجھ مجھ پر ڈال رہی ہو۔“ وہ خاموشی سے آگے بڑھ گئی تھی اور عیسیٰ احمد وہیں گیلی ریت پر کھڑا رہ گیا تھا، خالی ہاتھ، خالی دل۔

عروہ یہ عیسیٰ میں واپس گھر آئی تھی، تمام راستہ وہ روٹی رہی تھی۔

”محبت تو اچھی لڑکیوں کو بھی ہو جاتی ہے عیسیٰ احمد۔“ اس کے آنسوؤں میں روائی آگئی تھی۔

گھر میں داخل ہوئی تو پوریج میں فارقلید حسن کی گاڑی دیکھ کر ٹھنک گئی۔

”فارقلیط!“ وہ بیڈروم میں داخل ہوئی تو سامنے ہی وہ دکھائی دیا، ہاتھ میں اس کا رائٹنگ پیڈ لئے وہ بیٹھا ہوا بڑے انہماک سے پڑھ رہا تھا، اس کے پکارنے پر بھی کوئی جواب نہ دیا۔  
”کتنی غلط بات ہے، میں نے منع کیا تھا آپ کو۔“ اس نے فارقلیط حسن سے چھٹنا چاہا مگر وہ مکمل طور پر ہوشیار تھا، ہاتھ پیچھے کر لیا۔  
”زیادتی ہے یہ ویسے۔“ اس نے احتجاج کیا، جبکہ وہ ہنس دیا، اس کی ہنسی عروہ کو چڑانے لگی تھی۔

”ہیں تو معلوم ہی نہ تھا، کہ ہماری سز راسٹر ہیں، لو بھلا یہ بات مجھ سے چپانے کی کیا ضرورت تھی۔“ وہ خوش تھا اور ساتھ حیران بھی کہ عروہ یہ بات اس سے چپانا کیوں چاہ رہی تھی، جبکہ اسے تو لکھر سے تانا چاہیے تھا۔  
”بس میں کسی کو نہیں بتاتی۔“ وہ برا سامنہ بناتے ہوئے اس سے کچھ فاصلے پر جا بیٹھی، فارقلیط حسن کو اس کا خفا خفا چہرہ بہت مزادے رہا تھا۔

”میں “کسی“ نہیں تنہا رابرینڈ ہوں اتفاق سے۔“ اس نے جیسے اسے یاد دلایا ہو، وہ خاموشی سے اٹھ کر باہر نکل گئی، کچھ ہی دیر میں فارقلیط حسن بھی اس کے پیچھے آ گیا تھا، وہ بیڈروم پر کھڑی آسمان پر اڑتے پرندوں کو دیکھ رہی تھی۔  
”تم روٹی رہی ہو۔“ وہ اس کے پاس آ کھڑا ہوا اور بغور اس کی طرف دیکھا، اس نے کوئی جواب نہ دیا۔

”مجھے پرندے بہت پسند ہیں۔“ اس کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے اس نے آسمان پر اڑتے پرندوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔  
”مگد تو ہم بھی مگر میں رکھ لیتے ہیں، بتاؤ کون سے پرندے ہمیں پسند ہیں؟“ فارقلیط

حسن نے اس کے کھوئے ہوئے انداز کو محسوس کرتے ہوئے کہا۔  
”محبت قید کرنے کا نام تو نہیں، جن سے محبت کی جائے انہیں کھلی فضا میں سانس لینے دینا چاہیے۔“ اس کی بات پر وہ دھتے سر دھتے سرکرا دیا تھا۔

”Everything is fair in war and love“ اور پھر میرا خیال ہے جس سے محبت کی جائے اسے ہر وقت آنکھوں کے سامنے رکھنا بھی تو ضروری ہوتا ہے، کیا میں نے تم کو قید کر رکھا ہے؟“ اس نے اچانک سوال کیا تھا، عروہ کو اس وقت اس سے ایسے سوال کی امید نہ تھی، چند لمحوں کے لئے وہ سوچنے لگی کہ کیا جواب دے۔

”ہم پرندوں کی بات کر رہے تھے آپ خود کوچ میں کہاں لے آئے؟“ اس نے جواب دینے کی بجائے اس سے سوال کر ڈالا، جس پر فارقلیط حسن ہنس دیا۔

”بہت گہری ہوش، آسانی سے نا سمجھ آنے والی۔“ اور عروہ کے لئے یہ جملہ کوئی نیا نا تھا، وہ اس کی عادی تھی۔  
”مجھے تمہیں بتانا تھا کہ پرسوں ہماری فلائٹ ہے، پکٹنگ کرلو تم۔“ اس کی عروہ فغفغر اسے شام ہی کا کوئی حصہ معلوم ہوئی تھی، اسی کی طرح گہری، اداس اور تنہا۔

☆☆☆

فغفغر علی نے ہمت نہ ہاری تھی، وہ بار بار اسی چوکھٹ پر معافی کی بجھک مانگتے جاتے تھے اور دھکار دیتے جاتے تھے، اب کی بار ان کا سامنا فردا سے ہو گیا تھا۔

”آپ کیوں آ جاتے ہیں یہاں؟“ انی اندر نماز پڑھ رہی تھی، ماموں بھی کہیں باہر گئے

ہوئے تھے، وہ زیادہ وقت گھر سے باہر ہی گزارتے تھے۔

”اپنی ماں سے کہو صرف ایک موقع دے دے، میں اس کے سب شکوے دور کر دوں گا۔“ انہوں نے بغور نرو کو دیکھا۔

”جس عورت کو انیس سال پہلے تڑپنے اور خوار ہونے کے لئے چھوڑ گئے تھے، جس نے ایک ایک دن اذیت میں گزارا، ایک ایک رات سو لی پر لٹکتے ہوئے بتائی، ابھی سوچا ہے آپ نے اس نے تنہا کیسے وقت گزارا ہو گا؟“ فغفغر علی نے دیکھا تھا یہ سب کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں کیسی اذیت تھی، ان کا جی چاہا تھا ہاتھ جوڑ کر اس سے معافی مانگیں اور پھر اسے سینے سے لگالیں، مگر اس خواہش کو دل میں دبائے وہ کھڑے اسے دیکھتے رہے۔

”انیس سال کی اذیتوں کو ایک لمحے میں معاف کر دانا چاہتے ہیں۔“

”ہمارے خلاف بہت بڑی سازش ہوئی تھی بیٹا!“ انہوں نے کمزور سا احتجاج کیا تھا۔  
”اونہہ، سازش۔“ اس نے زیر لب بڑبڑاتے ہوئے سر جھٹکا۔

”جو خود محبت اور غلوس میں سچے اور ثابت قدم ہوں، جن کے اپنے دل صاف ہوں، ان کے خلاف کوئی سازش نہیں کر سکتا۔“ وہ ذرا بھی ان کی بات سے متاثر نہ ہوئی تھی۔

”میں آپ کا باپ ہوں بیٹا، کیا آپ مجھے.....“

”کیا؟“ وہ زور سے چلائی تھی۔

”امیر ہو یا غریب، ہر بچے کو جو پہلی چیز اپنے باپ سے ملتی ہے وہ اس کا نام اس کی شناخت ہوتی ہے، مجھے تو وہ بھی نا مل آپ سے، آپ کیسے کہہ سکتے ہیں آپ میرے باپ ہیں

فغفغر صاحب۔“ اس نے انتہائی دکھ سے کہا تھا، شرم کے مارے فغفغر علی کا جی چاہا زمین پھٹے اور اس میں سما جائیں۔

”ماما..... ماما۔“ اسی وقت مصعب چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ہوا اس کے پاس آ گیا، فغفغر علی حیرت سے کبھی اسے تو کبھی پیٹنے مصعب کو دیکھ رہے تھے۔

”جی بیٹا!“ اس نے آگے بڑھ کر اسے اٹھا لیا۔

”ماما!“ فغفغر علی کو حیرت کا شدید جھٹکا لگا تھا، ان کا دل اس حقیقت کو ماننے سے سخت انکاری تھا۔

”یہ..... یہ..... بچہ کون ہے؟“ انہوں نے پوچھا، نکاح کے وقت اسے موسیٰ علی کی گود میں دیکھ کر انہیں شک تو ہوا تھا۔

”میرے شوہر کا بیٹا ہے اور اب میرا بھی۔“ اس نے کسی روئین کی طرح جواب دیا۔

”جس کے لئے اس کے باپ نے دوسری شادی کی، ان کی پہلی بیوی اس دنیا میں نہیں ہے۔“ فغفغر علی کے پاس جیسے الفاظ ختم ہو چکے تھے۔

”ایک شادی شدہ مرد سے کیوں شادی کی آپ کی، آپ کی ماما نے؟“ انہوں نے پوچھا اور ان کا یہ پوچھا غصہ ثابت ہوا۔

”آپ کو کیا لگتا ہے ایک تنہا غریب عورت کی بیٹی کو بیٹے کوئی بڑے مین یا کوئی ڈاکٹر، انجینئر آتے، امیر تو میرے ہر بیٹا بھی بہت ہیں، مگر وہ اپنے بیٹے اور مرحومہ بیوی سے بہت محبت کرتے ہیں۔“ وہ باہر نکل گئی، فغفغر علی کے پاس نہ تو الفاظ تھے اور نہ ہی حق اور اختیار تھا کہ اسے روکتے، سو خاموشی سے اسے جانا دیکھتے رہے۔

☆☆☆

موسیٰ علی آفس سے آیا تو کمرے میں داخل ہوتے ہی ٹھک کر رک گیا، سامنے بیڈ پر فردا اور مصعب سو رہے تھے، مصعب اس کے بازو پر سر رکھے سو رہا تھا، موسیٰ علی خاموشی سے آگے بڑھ گیا۔

فریش ہو کر وہ کچن میں چلا گیا، اپنے لئے چائے بنا کر لایا اور صوفے پر بیٹھ کر پینے لگا۔  
”زندگی کتنی عجیب چیز ہے۔“ وہ فردا اور مصعب کو دیکھ رہا تھا۔

”کاش عزیزہ تم نہ جاتی اور تمہاری جگہ فردا چلی جاتی۔“ اس کے موبائل پر کال آنے لگی تھی، وہ تیزی سے اپنی جگہ سے اٹھا، موبائل سائیڈ ٹیبل پر بڑا تھا، وہ اٹھانے کے لئے جھکا، فردا کی آنکھ کھل گئی تھی، موسیٰ علی کو دیکھ کر وہ تیزی سے اٹھی تھی، وہ موبائل اٹھا کر واپس اپنی جگہ پر جا بیٹھا تھا، وہ دوپٹہ اوڑھ کر واش روم میں چلی گئی تھی، واپس آئی تو موسیٰ علی چائے پی رہا تھا، موبائل اس کے سامنے میز پر پڑا تھا، وہ باہر کی جانب بڑھی۔

”سنو فردا!“ وہ غیر ارادی طور پر اسے پکار بیٹھا تھا، وہ رک گئی اور پلٹ کر اس کی جانب دیکھا، مگر منہ سے کچھ نہ بولی۔

”چائے پیو گی؟“ اس نے پوچھا اور پھر خود ہی حیران ہونے لگا کہ وہ اسے کیوں بلارہا ہے۔  
”نہیں، شکریہ۔“ وہ پھر دروازے کی جانب بڑھی، اب کی بار موسیٰ علی تیر کی تیزی سے اس کے قریب آیا تھا۔

”یہاں آؤ میری بات سنو۔“ وہ زبردستی اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے واپس لایا اور صوفے پر بیٹھا دیا اور خود بھی اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

”آئی ایم سوری، مجھے تم سے اس طرح بی ہیو نہیں کرنا چاہیے تھا۔“ اس نے معافی مانگی تھی۔

”بہت اچھا ہوا کہ آپ نے مجھے بتا دیا کہ میری کیا اوقات ہے آپ کی نظر میں، لیکن آپ پریشان مت ہوں، میں نے نہ تو ای کو کچھ بتایا ہے نہ ہی بتاؤں گی، کیونکہ میں انہیں دھکی نہیں کرنا چاہتی اور دوسری بات۔“ وہ چند لمحے سانس لینے کو رک گئی تھی، موسیٰ علی بخور اس کے سنے نقوش کو دیکھ رہا تھا۔

”مجھے آپ اس شادی سے ناخوش ہیں، اتنی ہی میں بھی ناخوش ہوں۔“ اس نے اپنی انسلٹ کا بدلہ لیا تھا۔

”تم سے کس نے کہا میں ناخوش ہوں۔“ موسیٰ علی نے پہلی مرتبہ اس کو غور سے دیکھا تھا، وہ کم عمر اور خوش شکل ہونے کے ساتھ خود سر اور ضدی لگ رہی تھی۔

”جیسے آپ کو اپنے بچے کے لئے فل ٹائم ملازمہ چاہیے تھی، ایک ایسی ٹیئر لکڑائی کو میرے لئے ایک فل ٹائم گارڈ چاہیے تھا، سوانہوں نے آپ کو میرے لئے سلیکٹ کیا، وہ میرے لئے ہمیشہ بہتر فیصلہ کرتی ہیں، کیونکہ وہ مجھ سے بہت پیار کرتی ہیں۔“ اس کے خفا انداز اور باتوں پر وہ زیر لب مسکرا دیا تھا۔

”ابھی تک تو مجھے اس فیصلے میں کوئی اچھائی نظر نہیں آ رہی، مگر کیونکہ یہ میری امی کا فیصلہ ہے، مجھے اسے نبھانا ہے، اسی لئے میں خود آئی ہوں۔“ وہ اس کے پاس سے اٹھ رہی تھی، موسیٰ علی فوراً اس کے قریب آیا تھا۔

”تو تم لڑائی کا موڈ بنا کر آئی ہو، مجھے جھگڑالو عورتیں بالکل پسند نہیں ہیں۔“

”بیویوں کو پاؤں کی جوتی سمجھنے والے مرا مجھے زہر لگتے ہیں۔“ وہ دہو دہو بولی تھی۔

”میں نے کب ایسا کہا؟“ وہ حیران رہ گیا تھا۔

”بس منہ سے کہنے کی کسری باقی ہے، کہہ میں۔“ وہ طنز کے نشتر چھوڑنے لگی تھی، موسیٰ علی نے فی الوقت خاموشی میں ہی عافیت جانی، کچھ غور کرنے پر اسے معلوم ہوا تھا کہ لفظی اس کی بھی ہے۔

☆☆☆

غفنفر علی نے کچھ سوچتے ہوئے علیہ اور عدیل کے رشتے کے لئے ہاں کہہ دی تھی۔

اس کے اگلے ہی دن نویلہ کا رشتہ لے کر عیسیٰ احمد کے والدین آئے تھے، نویلہ کے تو پاؤں زمین پر نہ ٹک رہے تھے، غفنفر علی نے نویلہ کے منتیں کرنے اور خود کشی کی دھمکیاں دینے پر ہاں کر دی تھی، عدیل نے باہر جانا تھا اس لئے اسی بچنے ان کی شادی طے پا گئی۔

نویلہ کو ابھی تک یقین نہ آ رہا تھا کہ وہ مسز عیسیٰ احمد بن چکی ہے، رخصتی کے وقت وہ ذرا بھی ناروئی تھی، عیسیٰ احمد اسے گھر کی بجائے ہوٹل میں لے آیا تھا، جہاں اس نے کمرہ ریزرو کر دیا رکھا تھا، اس کی ہر ای میں چلتی ہوئی وہ کمرے میں داخل ہوئی تھی، عیسیٰ احمد خاموش تھا، جبکہ وہ بیڈ پر جا بیٹھی، عیسیٰ احمد کھڑکی میں کھڑا ہر دیکھ رہا تھا۔

”میں نے آپ کو معاف کیا۔“ بھیکا لہجہ اس کے کانوں میں گونجا تھا۔

”آپ برے نہیں ہیں، لیکن آپ نے میرے ساتھ برا کیا ہے۔“ اسے سسکیاں سنائی دے رہی تھیں، اس کے اندر شدید نفرت کا احساس ابھرا تھا، اس نے گردن گھما کر سر جھکا کر بیٹھی نویلہ کو دیکھا تھا۔

”میں نے زندگی میں کبھی کسی سے بدلہ نہیں لیا، معاف کر دینا میری فطرت اور تربیت میں شامل ہے، مگر.....“ اس نے اس کی جانب دیکھے بغیر بات کا آغاز کیا۔

”کچھ غلطیاں اور زیادہ جتن معاف نہیں کی جا سکتیں اور آج میں تمہاری ماں کو بتاؤں گا کہ بے بسی کے کہتے ہیں، سچا ہو کر جھوٹا کہلوانا کتنا تکلیف دہ ہے، مظلوم ہو کر ظالم بنا دیا جانا کتنا اذیت ناک ہے، میں تمہاری ماں کو عروہہ کی خوشیوں کا قتل معاف نہیں کروں گا اور اسی لئے زندگی میں پہلی مرتبہ، میں قتل کے بدلے قتل کروں گا۔“ نویلہ کا شرم سے جھکا سر خوف کے باعث اوپر اٹھ گیا تھا، وہ خوفزدہ نظروں سے عیسیٰ احمد کی جانب دیکھ رہی تھی، جس کی آنکھوں میں خون اترا ہوا تھا، اسے کوئی جائے پناہ نا نظر آئی تھی، اس نے عیسیٰ احمد کا یہ روپ تو کبھی خواب میں بھی نا دیکھا تھا۔

(باقی آئندہ ماہ)

☆☆☆

اچھی کتابیں پڑھنے والیے

ابن انشاء

☆ اردو کی آخری کتاب.....

☆ خار گندم.....

☆ دنیا گولی ہے.....

☆ آوارہ گرد کی ڈائری.....

☆ ابن بطوطہ کے تعاقب میں.....

☆ چلتے ہو تو چین کو چلئے.....

☆ گمری گمری پھر اسافر.....

☆ لاہور اکیڈمی، چوک اردو بازار، لاہور

7321690-7310797.



مریم چائے پی کر اپنی کلاس میں چلی گئی تھی  
پروفیسر مشتاق بیگ صاحب کو اکیلے پا کر ان کے  
قریب آگئے تھے۔

”پار مشتاق تمہاری کسی بات کا برا میں نے  
کب منایا ہے، تم نے جو بھی کہنا ہے کل کر کہو۔“  
”بیگ بھابھی کے جانے کے بعد جس  
طرح تم گھر اور کالج میں گمن چکر بن گئے ہو اور  
تمہاری سرسبز و شاداب زندگی پر جس طرح  
خزاؤں نے بیرا کر رکھا ہے اسے دیکھ کر دل  
بہت تڑپتا ہے، یا رب تک اس زندگی سے تنہا

”مبالغہ آرائی نہیں حقیقت پسندی۔“ وہ  
جھٹ بولی تھی۔

”میرے خیال میں یہاں کارڈور میں  
کھڑے کھڑے بائیں کرنے سے زیادہ اچھا ہے  
کہ کسی جگہ چل کر ایک گرم کپ چائے کا پی  
لیا جائے، میرا تو بول بول کر حلق خشک ہو گیا  
ہے۔“ بیگ صاحب نے کہا تھا۔

”کیوں نہیں، ایسی آخر ہو تو پھر دیر کس بات  
کی ہے۔“ وہ دونوں چل پڑے تھے۔  
”یار ایک بات کہوں برا تو نہیں مانو گے۔“

## ناولٹ

لڑتے رہو گے، میرے خیال میں تمہیں دوسری  
شادی کے بارے میں سوچنا چاہیے، میں مانتا  
ہوں کہ بھابھی کی یادیں تمہارے دل سے کھینچ  
ہو سکتیں، نہ ان کی محبت تمہارے وجود سے ختم  
سکتی ہے مگر یہ بھی تو دیکھو نا کہ وہ اتنی ہی عمر لکھوا کر  
آئی تھیں تمہارا اور ان کا ساتھ اتنا ہی تھا، وہ تو چلا  
گئیں ہیں اور تمہیں اکیلا کر گئیں ہیں۔“ مشتاق  
صاحب کافی دنوں سے بیگ صاحب سے  
بات کرنا چاہ رہے تھے اور آج انہیں موقع مل  
گیا تھا۔

”مشتاق تم صرف میرا ہی کیوں سوچا رہے  
ہو، میرے دو بچے بھی تو ہیں، میں اب اپنے  
نہیں ان کے لئے جینا چاہتا ہوں، وہ ماں تو  
کچھ ہیں میں اب باپ کا پیار تو ان سے نہیں  
سکتا۔“



”بجدا بیگ یار میں صرف تمہارا نہیں ان دو معصوم جانوں کا بھی فائدہ سوچتا ہوں، تم جتنا بھی چاہو انہیں ماں کا پیار نہیں دے سکتے ہو، وہ شاید تمہارے سامنے ظاہر نہ کرتے ہوں مگر ایک ماں کی آغوش کی آرزو ان کے دل میں بھی ضرور ہسکتی ہوگی۔“

”تم کون سا دنیا کے حالات جانتے نہیں ہو آج کل کون کسی کی اولاد کو اپنی اولاد سمجھتا ہے، یہاں سب خود غرض ہیں، میں اپنی اچھی بھلی پر سکون زندگی میں بچل چانا نہیں چاہتا۔“ بیگ نے مشتاق سے کہا تھا۔

”یار آج کیا اس موضوع کو ہی رگیدتے رہو گے۔“ بیگ صاحب مسکراتے ہوئے بولے تھے۔

”ہاں اور میری نظر میں تو اس مسئلے کا بڑا خوبصورت حل بھی موجود ہے۔“

”اچھا وہ کیا ہے؟“

”مس مریم علوی۔“ مشتاق صاحب نے جلدی سے کہا تھا۔

”واٹ، مریم علوی۔“ پردیسر بیگ کو مشتاق کی بات پر شاک سا لگا تھا۔

”پلیز مشتاق، کسی انہوی کو اپنی مرضی کا رنگ مت دو، اول تو میں دوسری شادی کے لئے

ہی تیار نہیں ہوں اور پھر مریم کے بارے میں میری سوچوں میں دور دور تک ایسا کوئی نکتہ موجود

نہیں ہے، مس مریم میں کسی چیز کی کمی نہیں ہے کہ اسے کوئی اچھا رشتہ نہ مل سکے، میں تو دوسری شادی

کرنا ہی نہیں چاہتا اور بالفرض اگر میرے دل میں ایسا کوئی خیال بھی آئے تو ایسی خود غرضی میں نہیں

دکھا سکتا، مس مریم کے لئے دو بچوں کا باپ ہی رہ جاتا ہے کیا۔“

”تمہاری ہر بات اپنی جگہ پر درست ہے

مگر ایک فیکٹر کو تم سرے سے ہی نظر انداز کر رہے ہو۔“ مشتاق نے پھر کہا تھا۔

”اب کون سا فیکٹر باقی بچتا ہے۔“ بیگ صاحب نے پوچھا تھا۔

”محبت اور پسندیدگی کا اور یہ سب سے مضبوط اور پائیدار فیکٹر ہے، تم اتنے بچے نہیں ہو

کہ کچھ جان نہ سکو، ہاں جان بوجھ کر نظر انداز کر دو تو الگ بات ہے، مس مریم تمہیں پسند کرتی ہیں

تمہاری اور ان کی انڈر اسٹینڈنگ بھی ہے، تم ایک بار ہاں تو کر دو کیہ لینا وہ اپنے دل کی خوشی سے

تمہاری زندگی میں شامل ہونا چاہیں گی۔“

”وہ ہماری کو لیک ہے، جس طرح ہم سب کی انڈر اسٹینڈنگ ہے اسی طرح ان کی بھی ہے،

تم اس انڈر اسٹینڈنگ کو کوئی اور نام تو نہ دو۔“

بیگ صاحب ماننے پر تیار ہی نہ تھے۔

”تم نہ مانو تو اور بات ہے مگر میں اپنے موقف سے ایک انچ بھی پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں

ہوں، چلتا ہوں ابھی تو میری نکاح کا نام ہو گیا ہے اس موضوع پر پھر بات ہوگی۔“ مشتاق

صاحب اپنی دائر کی اٹھا کر چلے گئے تھے جبکہ پردیسر بیگ کے لئے سوچنے کے لئے کافی کچھ

چھوڑ گئے تھے۔

☆☆☆

پاگل آنکھوں والی لڑکی

اتنے مہنگے خواب نہ دیکھو

تھک جاؤ گی

کا بچے سے نازک خواب تمہارے

ٹوٹ گئے تو بچھتاؤ گی

تم کیا جانو

خواب..... سفر کی دھوپ کے شیشے

خواب..... ادھوری رات کا دوزخ

خواب..... خیالوں کا پھٹتاؤ

خوابوں کا حاصل تنہائی

مہنگے خواب خریدتا ہوں تو

آنکھیں بچنا پڑتی ہیں

رشتے بھولنا پڑتے ہیں

اندیشوں کی ریت نہ چھانکو

خوابوں کی اوٹ سراب نہ دیکھو

پیارے نہ دیکھو

اتنے مہنگے خواب نہ دیکھو

تھک جاؤ گی

ساتم نے پاگل آنکھوں والی لڑکی۔

موعد نے بڑی دلچسپی سے یہ خوبصورت سی

لظم منی دانیہ کے بالوں کو ہلکا سا چھیڑا تھا۔

”کیا ہے موعد، تم تو ہر وقت مجھے ڈراتے

ہی رہتے ہو، تم نے تو محبت کا دوسرا نام اندیشے

اور خوف ہی رکھ چھوڑا ہے، یہ بایوی والی باتیں

مجھے اچھی نہیں لگتیں، محبت امید بھی تو ہے، روشنی

اور رنگ بھی تو ہے، بہادری بھی تو ہے، پھر کیا

ضروری ہے کہ ہم اس کا ایک ہی رخ دیکھیں۔“

”واہ واہ کیا بات ہے، دانیہ عماد صاحبہ

کی، کوئی خوش فہم ہو تو آپ سا۔“ موعد نے اسے

پھر چھیڑا تھا۔

”خوش فہم، جی نہیں یہ خوش فہمی نہیں اعتماد

ہے۔“ وہ تقاضے گردن کڑا کے بولی تھی۔

”اوکے میڈم اب ذرا یہ بتا دیں کہ خادم

آپ کو لینے کب آئے۔“ وہ مہارت سے گاڑی

ڈرائیو کرتے ہوئے پولا تھا، گھر سے تو دانیہ پچھلی

سیٹ پر ہی بیٹھ کر آئی تھی مگر باہر آتے ہی وہ گاڑی

رکوا کر موعد کے برابر فرنٹ سیٹ پر بیٹھنے کو ترجیح

دیتی تھی، وہ اب اسے ایک ڈرائیور کی نظر سے تو

نہیں اپنے محبوب کی نظر سے دیکھا کرتی تھی۔

”میں کہاں جا رہی ہوں جو آپ مجھے لینے

آئیں گے۔“ وہ بھی اسی شوخی سے بولی تھی۔

”میرا خیال ہے کہ میڈم دانیہ صاحبہ کو اپنی

دوست سے نہایت ضروری کام تھا جس کے لئے

میری نیند خراب کی گئی اور مجھے امیر جنسی میں بستر

سے اٹھا کر اس گاڑی میں بٹھا دیا گیا اور اب آپ

شاید بھول رہی ہیں کہ میں آپ کو آپ کی دوست

کی طرف چھوڑنے جا رہا ہوں۔“

”مگر میں تو کسی دوست کی طرف نہیں جا

رہی ہوں۔“ وہ معصومیت سے بولی تھی۔

”کیا..... تو وہ۔“ موعد نے گاڑی کو بریک

لگائے تھے، گاڑی ایک جھٹکے سے روڈ پر رک گئی

تھی۔

”تو وہ تو آپ جناب کو ساتھ لانے کی

سازش تھی، میڈم دانیہ صاحبہ کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ

جناب موعد صاحب کے ساتھ جا کر ایک کپ

آئس کریم کا کھا کر آئے اور کچھ وقت بھی ساتھ

گزارے۔“ وہ گہری نظریں اس پر جماتے

ہوئے بولی تھی۔

”گویا آپ نے ایک کپ آئس کریم کے

لئے میری اتنی قیمتی نیند خراب کی۔“

”آپ کی نیند زیادہ قیمتی ہے یا میرا

ساتھ۔“ وہ اٹھلائی تھی۔

”میری نیند۔“ موعد نے شرارت سے کہا

تھا۔

”کیا؟“ وہ اتنی زور سے چبکی تھی کہ پاس

سے گزرتے لوگ رک کر ان کو دیکھنے لگے تھے۔

”حد کرتی ہیں آپ بھی۔“ موعد لوگوں کے

متوجہ ہونے پر شرمندہ سا ہو کر بولا تھا۔

”گاؤں کب جا رہے ہو۔“ دانیہ نے پوچھا

تھا۔

”اگلے ہفتے۔“

”شادی کی سب تیاریاں ہو گئی ہیں نا۔“

”میرے خیال میں ہو گئی ہوں گی باقی تو

وہاں جاؤں گا تو پتہ چلے گا نا، ویسے بھی جو کام میرے کرنے والے ہیں وہ مجھے ہی کرنے پڑیں گے، اماں نے اپنے حصے کے کام تو نمٹائے ہوں گے مگر باہر کے زیادہ تر کام تو میرے لئے ہی رکھے ہوں گے۔“

”وہاں جا کر مجھے بھول نہ جانا، وہاں بھی جب اور جس چیز کی ضرورت ہو مجھے بلا تکلف کال کر لینا، تمہیں یا تمہارے گھر والوں کو کسی قسم کی پریشانی نہیں ہونی چاہیے، تمہیں بہت اچھے طریقے اور دھوم دھام سے اپنی بہن کو رخصت کرنا ہے۔“

”میں تو پہلے ہی تمہارا احسان مند ہوں اکثر سوچتا ہوں میں اس احسان کا بدلہ کیسے اتار پاؤں گا۔“

”کس بات اور کس چیز کا احسان۔“ وہ ناراضگی سے بولی تھی۔

”وہ.....“ اس نے کچھ کہنے کے لئے لب کھولے ہی تھے کہ وانیہ نے جلدی سے کہا تھا۔

”پلیز موصد اس بات کو یہیں ختم کر دو، دو دوستوں کے درمیان احسان تب ہوتا ہے جب دوستی کی بنیادیں کمزور ہوں اگر تم سمجھتے ہو کہ ہماری دوستی بھی کمزور اور دھکی ہے تو پھر تم احسان مان سکتے ہو۔“

”تم تو ناراض ہو گئی ہو۔“

”تم نے بات ہی ناراض ہونے والی کی ہے۔“

”چلو چھوڑو یہ بتاؤ میرے ساتھ میرے گاؤں چلو گی عابدہ کی شادی میں۔“ وانیہ کو موصد کی بات نے دکھی کر دیا تھا، موصد اپنی بات کا اثر زائل کرنے کے لئے وانیہ کا دھیان بناتے ہوئے بولا تھا۔

”تم کہاں لے کر جاؤ گے، ورنہ میرا دل تو

بہت کر رہا ہے۔“

”کیوں نہیں لے کر جاؤں گا۔“  
”اتنی ہمت ہے۔“ وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی تھی۔

”ہاں ہے۔“ موصد نے کہا تھا۔

”اسنے گھر والوں سے کیا کہو گے۔“

”کہنا کیا ہے ہمارا تمہارا ایک اور تعلق بھی تو ہے، میرے گھر والے تو پہلے ہی تمہارے بڑے مشکور ہیں دیکھنا جب تم وہاں جاؤ گی تو تمہیں کیسے ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا، تم خود بھی حیران رہ جاؤ گی۔“

”اور میرے گھر والوں سے کیا کہو گے؟“

”وہ تمہارا مسئلہ ہے۔“ یہ ایک مشکل سوال تھا موصد نے اس کے کھاتے میں ڈال دیا تھا۔

”کیا اب میرا اور تمہارا مسئلہ ایک نہیں۔“

وانیہ نے پوچھا تھا۔

”بالکل ایک ہے، میں نے یہ کب کہا، میرا اور تمہارا تو ہر مسئلہ ہی مشترک ہے۔“

”کہا تو تم نے ہی ہے کہ یہ تمہارا مسئلہ ہے۔“ وانیہ کو موصد کے سامنے ہال کی کھال اتارنے میں مزہ آتا تھا۔

”وہ سامنے دیکھو کتنا خوبصورت پرندہ ہے۔“ موصد نے ہاتھ کے اشارے سے اس کو بتایا تھا۔

”واہ جناب کیا انداز ہے بات بدلنے کا۔“

وانیہ نے جل کر کہا تھا اور موصد کا قبضہ بھر گیا تھا۔

☆☆☆

کائنات کے خالق و مالک اپنی عطا کردہ کتاب للاح میں فرماتے ہیں ”کہ ہم نے انسان کو جو صلاحیتیں دی ہوئی ہیں اپنی کسی اور مخلوق کو ایسی صلاحیتیں نہیں دیں سوچنے سمجھنے اور فیصلہ کرنے کی صلاحیتیں، ان صلاحیتوں سے کام لے

کر حالات کے مطابق کچھ کر گزرنے کی صلاحیتیں لیکن وہی انسان جب راہ راست کو پہچانے اور اس پر قائم ہو جانے سے انکار کر دیتا ہے اور پستی کی راہ پر چل پڑتا ہے تو ہم اسے پستی کی اس منزل تک جانے دیتے ہیں کہ اتنا پست کوئی اور ہوتا نہیں کیونکہ ہماری دکھاہی راہ راست کو چھوڑ کر پستی کے سفر کا اور اس کے آخری پڑاؤ تک پہنچ جانے کا فیصلہ اس نے خود کیا ہوتا ہے۔“

”ایمن نے خود کشی کر لی ہے۔“ صبح اٹھتے ہی جودل دہلا دینے والی خبر اس کو ملی تھی وہ یہی

”کیا؟“ اس نے بے اختیار دل کو تھا ہاتھ۔

”خدا یا اس کی حفاظت فرماتا۔“ ساتھ ہی دھڑکنوں نے دعائیں اٹھنا شروع کر دی تھیں، لیکن اپنی نادانی اور ہوس میں مبتلا ہو کر جس راہ کا انتخاب

ایمن نے کیا تھا وہ تو پستیوں کی طرف لے کر جانے والی تھی، وہ راہ ہی کوئی تھی اور انسان کو بھی

نکھوٹا کر دینے والی تھی۔

اس نے ایمن کے سیل پر کال کی تھی، کافی دیر کے بعد کال ریسپونڈ کر گئی تھی اور وہ جواب ایمن کی آواز سننے کی منتظر تھی، دوسری طرف سے آتے

شور و جج و بکار اور دل کو بیقرار دینے والے بین سن کر اس کے اپنے جسم سے جان نکلنے لگی تھی،

کال جانے کس نے ریسپونڈ کی تھی اور کسی کے کچھ

بولنے سے پہلے ہی حریم کے ہاتھ سے موبائل

چھوٹ کر نیچے جا گرا تھا۔

”تو کیا ایمن مر گئی، وہ ہنستی مسکراتی، جیتی

جاگتی، شوق و تخیل لڑکی منوں مٹی تلے دب جائے

گی، ایک بھیڑیے کا شکار بن کر وہ ہمیشہ ہمیشہ کے

لئے اس دنیا سے منہ موڑ گئی، آہ ایمن یہ کیا کیا تم

نے، تمہاری خواہشات نے کس طرح تمہاری

جان لے لی، تمہاری تمناؤں نے کس طرح

تمہاری بوڑھی ماں کو بے آسرا کر دیا، ایمن ظہیر تم ا بنا اور اپنے سے وابستہ لوگوں کا کتنا بڑا نقصان کر چکی ہو۔“ وہ سوچتی جاتی تھی اور آنسو ایمن ظہیر کی بے وقت موت پر اس کی آنکھوں سے بھل بھل بہے جاتے تھے۔

ایمن کی گلی میں بہت رش تھا، گلی میں

شامیانے لگا کر مردوں کے بیٹھنے کا انتظام کیا گیا

تھا، اس نے گلی کی ٹکر پر عرفان صاحب کی گاڑی

کھڑی دیکھی تو خون اس کے پورے وجود میں

کھولنے لگا تھا، اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ

ساری دنیا کے سامنے اس بھیڑیے کا منہ بوجھ لے

اور اصل حقیقت سے سب کو آشنا کر دے اس

طرح کے لوگ اس اونچی شان و شوکت والے مرد

پر تھو تھو کریں۔

ایمن کا وجود سفید کفن میں لپیٹا ہوا تھا، وہاں

موجود ہر آنکھ اشک باریقی اور ساتھ ہی اس نے

دبے دبے لفظوں میں لوگوں کی سرگوشیاں بھی سنی

تھیں، وہ سرگوشیاں جو ایمن کی خودکشی کے متعلق

تھیں، ہر کوئی اس موت کو اپنی مرضی کا رنگ دے

رہا تھا، وہ بھی سب سن رہی تھی مگر اس وقت وہ

ایمن ظہیر کے لئے کچھ نہ کر سکتی تھی اور اس کو اپنی

اس بے بسی کا پورا پورا اعتراف تھا، بس دھکی دل

سے خون کے آنسو بہانا اس کے بس میں تھا اور

ایمن ظہیر کے لئے یہ کام وہ بے دریغ کر رہی

تھی۔

”مس حریم۔“ ایمن کے جسد خاکی کو

تدفین کے لئے لے جایا گیا تھا، پیچھے بس آپہں

تھیں آنسو تھے، کانور اور اگر بیٹوں اور تیز خوشبو

تھی اور ہاتھ تھیں، وہ مرے مرے قدموں سے

اپنی جگہ سے اٹھتی تھی اور ایمن کے گھر سے باہر نکل

آئی تھی، وہ اپنے خیالوں میں مست چلتی رہی تھی

جب پیچھے سے اسے کسی نے پکارا تھا، اس نے مڑ

کر دیکھا تھا اور آواز دینے والے کی ڈھٹائی دیکھ کر خون اس کی آنکھوں میں اتر آیا تھا۔

”آئیے میں آپ کو ڈراپ کر دوں۔“ عرفان صاحب نے آواز دینے کے بعد اسے پیش کش کی تھی۔

”ایمن ظہیر کو تو آپ نے قبر کے اندھیروں تک پہنچا دیا، اب آپ اور کیا جاتے ہیں، میں یہ بات سنا جاتی ہوں کہ آپ جیسے شکاریوں کا دل نہیں بھرتا بھی تھی، جن کے منہ کو تازہ خون لگ جائے انہیں اور کچھ نہیں سو جاتا مگر مسٹر عرفان ابھی اس کی قبر پر مٹی تو ڈالنے دیں پھر نیا شکار بھی پھانس لیں۔“ وہ بولی نہیں پھنک رہی تھی۔

”کیا بکواس کر رہی ہو۔“ عرفان صاحب کے چہرے کا رنگ ہلکے بھر میں خفیر ہوا تھا۔

”بکواس نہیں حقیقت بیان کر رہی ہوں۔“ وہ اپنی بات پر زور دے کر بولی تھی۔

”لگتا ہے تمہارا دماغ کچھ زیادہ ہی خراب ہو گیا ہے۔“ حریم کی آنکھوں میں اپنا اصل رنگ دیکھ کر وہ شائستگی کا دامن ہاتھ سے چھوڑ بیٹھے تھے، ویسے بھی ان کو حریم کے پاس ہونے کا زعم بھی تو تھا کہ وہ جو کچھ کریں ان کے ماتحت ان کے ساتھ آنکھ اٹھا کر بات نہیں کر سکتے۔

”غیر سے بات کریں میرے ساتھ مسٹر عرفان صاحب۔“ حریم کو مزید پیش آ گیا تھا۔

”کیا یہ تم مجھے کہہ رہی ہو، کیا بھول گئی ہو کہ میں کون ہوں، میں تمہارا پاس ہوں جو تمہیں ابھی کھڑے کھڑے نوکری سے نکال سکتا ہوں۔“ عرفان صاحب کو لگا تھا کہ ایمن ظہیر کی موت نے حریم کا دماغ اس قدر ماؤف کر دیا ہے کہ اسے سب کچھ بھول گیا ہے۔

”لغت جیتی ہوں میں تم پر اور تمہاری دو ٹکے کی نوکری پر، تم خدا نہیں ہو کہ جو رزق دینے پر

قادر ہے، پھر تمہیں اس قدر زعم ہے کس بات پر، ابھی ساری دنیا کے سامنے تمہارا پول کھول دوں گا تو تمہاری یہ نام نہاد عزت ایسی چور ہے پر دو منٹ میں تار تار ہو جائے، لیکن میں ایسا کچھ نہیں کروں گی کہ انصاف کرنے والا اور بیٹھا ہے، وہ بہتر انصاف کرتا ہے، میں ایمن ظہیر کا معاملہ خدا کے سپرد کرتی ہوں پھر دیکھا اس خدا کا انصاف۔“ وہ اس شخص کے پاس کھڑے ہونا بھی اپنی توہین سمجھتی تھی اسے کھری کھری سنا کر اور اپنے دل کی کچھ بھڑاس نکال کر وہ چلتی بنی تھی۔

”ہونہ، بد دماغ لڑکی۔“ عرفان صاحب تو اس وقت کوکوس رہے تھے جب انہوں نے آواز دے کر حریم کو مخاطب کیا تھا گویا آواز دے کر اپنی شامت کو بلایا تھا، وہ جلتے بجھتے گاڑی میں جا بیٹھے تھے۔

”حریم شہزاد زندگی کے کسی موڑ پر بھی تم میرے ہاتھ لگ گئیں تو چھوڑ دوں گا تمہیں بھی نہیں، بڑی اکر ہے تم میں۔“ گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے انہوں نے نفرت سے سوچا تھا۔

☆☆☆☆

”پریشان بھی لگ رہی ہو اور ڈسٹرب بھی۔“ اسے نیند نہیں آ رہی تھی وہ رات کے دوسرے پہر میں اپنے کمرے سے باہر نکلی کر ہاسٹل کے ہرے بھرے لان میں چلی آئی تھی، اس میں بھیکے ہوئے گھاس پر ننگے پاؤں بیٹھتے ہوئے وہ اپنی سوچوں میں گم تھی جب مشائم جانے کہاں سے نکل کر اس کے پاس چلی آئی تھی۔

”ہوں۔“ اس نے ایک سرسری سی نظر مشائم پر ڈالی تھی۔

”میں نے سنا ہے تمہاری کو لیک کی ڈیجھ ہو گئی ہے کیا اس لئے پریشان ہو، مشائم اس کے

ساتھ ساتھ چلنے لگی تھی۔“ حریم نے سر ہلایا تھا۔

”سب کہہ رہے تھے اس نے خودکشی کی ہے، کیوں؟ تمہیں تو پتہ ہوگا۔“

”مجھے نہیں پتہ ہو سکتا ہے اس کی کچھ گھریلو پر ابھر ہوں۔“ حریم نے مختصر سا جواب دیا تھا۔

”گھریلو پر ابھر تو ہر کسی کے ساتھ ہوتی ہیں مگر یوں جان سے گزر جانا کب اچھی بات ہے، یہ تو سراسر بزدلی ہے، زندگی کو فیس کرنا چاہیے۔“ کچھ لوگ ہمت رکھتے ہیں اور فیس کر جاتے ہیں جبکہ کچھ لوگ نہیں کر پاتے۔“ حریم نے جواب دیا تھا۔

”مجھے ایک بات کی سمجھ نہیں آتی کہ ایسے لوگ اتنے بزدل ہوتے ہیں کہ زندگی کو فیس نہیں کر پاتے، دوسری طرف اپنی جان لے لینا بزدلی نہیں بہادری ہے۔“

”ہر کوئی اتنا بہادر بھی نہیں ہوتا، اب کوئی تمہیں پوچھتا ہے کہ تو کیا تم اپنی لے سکتے ہیں۔“ مشائم نے اس سے پوچھا تھا۔

”چھوڑو، یہ ہر بندے کا اپنا اپنا فعل ہے۔“ حریم نے بات ہی ختم کر دی، وہ اب مشائم علوی کو کیا بتانی کہ جو چیز ایمن ظہیر نے کھوئی تھی اس کے بعد تو پچتا کچھ بھی نہیں ہے، مگر اسے ایمن کا پردہ بھی تو منظور تھا اس لئے اس نے بات ہی بدل دی تھی۔

”تمہاری جاب کیسی جا رہی ہے۔“ مشائم نے پھر پوچھا تھا۔

”کافی ٹائم ہو گیا ہے، مگر لگتا ہے تمہیں ابھی تک نیند نہیں آ رہی۔“ حریم نے اس کی بات کا جواب دینے کی بجائے کہا تھا۔

”میں تو بہت لیٹ سوتی ہوں، تم میری فکر نہ کرو، یہ بتاؤ جاب کیسی جا رہی ہے۔“

”جاب تو میں نے چھوڑ دی ہے۔“ حریم

نے بڑے آرام سے کہا تھا۔

”واٹ، جاب چھوڑ دی، مگر کیوں اور پیچھے تمہارے گھر والے۔“ مشائم نے جان بوجھ کر بات ادھوری چھوڑی تھی، کیونکہ وہ جانتی تھی حریم کی سوئلی ماں نے اسی لئے تو بھیجا ہے یہاں کہ وہ پیسہ کما کر لائے۔

”بس میں وہاں مطمئن نہیں تھی، اب کوئی نئی جاب ڈھونڈوں گی۔“

”تم کہو تو میں اپنے بھائی سے بات کروں، اصل میں پایا آج کل ملک سے باہر ہیں اور پاکستان میں بھائی ہی ان کے سارے کاروبار کی لگ آفر کر رہے ہیں۔“

”تو کیا تم مجھے جاب دلوا سکتی ہو۔“ حریم نے لہجے میں آس بھر کر اس سے پوچھا تھا، اسے لگا تھا کہ ایک در بند ہوتا ہے تو سوا در محل جاتے ہیں۔

مشائم اچھی لڑکی تھی اور پھر اس کی اس سے تھوڑی بہت جان پہچان بھی تھی اس کے بھائی کے پاس جاب کرنے کا مطلب تھا کہ وہ اپنی بہن کی دوست جان کر اسے اچھا ماحول بھی دے گا اور اچھی جاب بھی، وہ بے طرح خوش ہو گئی تھی۔

”ہاں بالکل اگر تم چاہو تو۔“

”میں کیوں نہ چاہوں گی، مجھے اس وقت جاب کی ہی تو اشد ضرورت ہے، تم تو میرے لئے رحمت کا فرشتہ بن کر آئی ہو مشائم، مجھے تمہارا یہ احسان ہمیشہ یاد رہے گا۔“

”یار یہ کوئی احسان و حسان نہیں ہے، میں کلی ہی بھائی سے بات کرتی ہوں پھر اس کے بعد تمہیں کچھ بتاؤں گی۔“

”اوکے، میں تمہاری طرف سے اچھی خبر کا دیٹ کروں گی۔“ حریم نے کہا تھا۔

”انشاء اللہ اچھا ہی ہوگا۔“

”چلو آؤ اب اپنے اپنے کمروں میں چلیں، سونا نہیں ہے کیا۔“ حریم کو احساس ہوا تھا کہ وقت کا پی ہو گیا ہے اب سونا چاہیے۔

”ابھی خبر ملی ہے تو ساتھ ہی نیند بھی آنے لگی ہے۔“ مشائم نے اسے چھیڑا تھا۔

”ایسا تو پھر ہوتا ہی ہے۔“ حریم نے کہا تھا اور قدم اندر کی طرف بڑھا دیئے تھے، مشائم بھی اس کے ساتھ ساتھ اندر آگئی تھی۔

☆☆☆

اک چھوٹا سا پینا تھا

اس پینے میں کوئی اپنا تھا

اس اپنے میں کچھ سکون تھا

جو زندگی کا جنون تھا

اس جنون میں ایک راحت تھی

جو صرف حیرتی جاہت تھی

اس جاہت میں اک انداز تھا

جو میری دھڑکنوں کا راز تھا

اس راز میں اک خوشبو تھی

جو میری سوچ کی جستجو تھی

اس جستجو میں اک حرارت تھی

جو میری خوشیوں کی شرارت تھی

اس شرارت میں ایک احساس تھا

کہ تو جو میرے پاس تھا

اس پاس میں جو آرام تھا

وہ بس تیرا نام تھا

یہ تھا شاخو بصورت کا رڈ پر ابھرے یہ گلابی الفاظ جن کی خوشبو میں وانیہ کا لکس نازہ تھا مود کو سرشار سا کر گئے تھے، وہ عابدہ کی شادی کے لئے گاؤں جا رہا تھا اور زادراہ کے طور پر وانیہ نے اس کے ہر پل کو جو وانیہ سے دور ہو کر گزرتے اپنی محبت کی ڈوری میں باندھ دیا تھا۔

”کیا ہے یہ لڑکی بھی، لڑکی نہیں بلکہ امیر

زادی، جانے اسے مجھ معمولی سے ڈرائیور میں کیا نظر آیا ہے جو اپنی جیتی اور نایاب محبت یوں مجھ پر نچھاور کرنے پر تلی ہوئی ہے۔“ وہ سوچ رہا تھا۔

شاید محبت انسان کو وقتی طور پر اندھا کر دیتی ہے، اسے اپنے ارد گرد کچھ بھی دیکھنے نہیں دیتی، اس کے سوچ کو جواب خود ہی مل گیا تھا۔

”میرا پتر آگیا ہے، بھیا آگئے ہیں۔“ اس کی ماں اس کی بہن اسے دیکھ کر پر جوش ہو گئی تھیں، ان کے گھر کا واحد مرد آگیا تھا اب انہیں کسی چیز کی فکر نہ تھی، اس نے سب کچھ خود ہی کر لیا تھا اور یہ بات حقیقت بھی تھی کہ اللہ پاک نے

مردوں کو ایسی ہمت اور استقامت دی ہے کہ اپنے جیسے کے کام وہی کر سکتے ہیں عورتیں ان کا بوجھ نہیں اٹھا سکتیں۔

”ارے یہ تو ہے عابدہ، میری عابو۔“ پہلے تلکے سے جوڑے میں انہیں کی خوشبو سے مہکتا عابدہ کا وجود عجیب ہی روشنی نکھیر رہا تھا، گاؤں کے رسم و رواج کے مطابق اسے شادی سے ہفتہ پہلے ہی ماہوں بٹھا دیا گیا تھا، وہ ذرا سا مسکراتے ہوئے شرمائی تھی۔

”پہلی تو بھی پرانی ہو جائے گی۔“ مود نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا تھا ساتھ ہی اس کی آنکھیں بھیکنے لگی تھیں، ماں بھی دوپٹے کے پلو سے آنکھیں پونچھتے ہوئے ادھر ادھر ہو گئی تھی،

عابدہ کی تو آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو بہنے لگے تھے۔

”ارے یہ کیا، بس چپ کر جاؤ، بس میں تمہاری آنکھوں میں اب ایک آنسو بھی نہ دیکھوں۔“ مود نے اپنے ہاتھوں سے بہن کے آنسو صاف کرتے ہوئے اسے تسلی دی تھی۔

”مود پتر ادھر آؤ، مجھے تم سے ایک بات

کرنی ہے۔“ ماں نے ان دونوں کو اس جذباتی لمحے سے نکلانے کے لئے مود کو بلا لیا تھا۔

”ہاں اماں بتا کیا بات ہے۔“ وہ ماں کے پاس آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا تھا۔

”پتر جو پیسے تم نے بعد میں بھیجے تھے ان سے میں نے عابدہ کے لئے کچھ زیور بنانے کا آرڈر دے رکھا ہے تم آج مغرب سے پہلے پہلے سناڑ کے پاس جا کر وہ زیور تو اٹھا لاؤ، کس نہی بھاری کام رہ گیا ہے، بانی کپڑا تو سب تیار ہے، زیور گھر آجائے تو سکون سے پھر دوسرے کاموں کا سوچیں گے۔“

”اماں میں کچھ دیر بعد جا کر لے آتا ہوں، بس تم اور کام بتانی جاؤ، بارات والے دن سے پہلے پہلے ہر کام تیار ہونا چاہیے۔“

”میں پتر، تم نے تو ماں کی ہر پریشانی پہلے ہی ختم کر رکھی ہے۔“ وہ جھولی اٹھا کر بیٹے کو دعائیں دے لگی تھیں۔

”اماں یہ تو وانیہ بی بی کی مہربانی ہے سب، دعائیں دینی ہیں تو اس کو دو۔“ مود نے اماں کو سب بتا رکھا تھا کہ عابدہ کی شادی کے لئے سارا پیسہ وانیہ نے دیا ہے اور اب اس کے ذکر پر اس کی آنکھوں میں روشنیاں ہی پھونکنے لگی تھیں۔

”اس کو تو میں ہر وقت اٹھتے بیٹھتے دعائیں دیتی ہوں، لوگ ایسے ہی کہتے ہیں بڑے لوگوں کے دماغ بھی بڑے ہوتے ہیں خیرہ ہی خیرہ ان میں بھرا ہوتا ہے، وہ کہتے ہوتے ہیں یہ جھولی بی بی تو ان سب کا الٹ ہے، اتنی رحم دل اتنی سخی اور اتنے کلمے دل والی، تم جا کر اسے کہنا کہ میرے

ماں تمہیں جھولیاں بھر بھر کر دعائیں دیتی ہے اور ہاں جب خیر سے شادی نمنا کر تم جاؤ تو اس کے لئے ایک سوٹ دوں گی نہیں، وہ اسے دے دینا جا کر اسے کہنا کہ یہ ہماری محبت کا معمولی سا اظہار

کرنی ہے۔“ ماں نے ان دونوں کو اس جذباتی لمحے سے نکلانے کے لئے مود کو بلا لیا تھا۔

”ہے۔“

”اماں میری پیاری اماں سے کہہ بھی دوں گا اور سوٹ بھی دے دوں گا۔“ وانیہ کے متعلق اسے اپنی ماں کے خیالات جان کر خوشی بھی ہو رہی تھی اور اچھا بھی بہت لگ رہا تھا، اسے لگا تھا کہ وانیہ اس کے قریب ہی نہیں ہے، اس کے اپنوں کے دلوں کے بھی بہت قریب ہے۔

دو تین دن مصروفیت میں اور کاموں میں کیسے گزرے تھے پتہ ہی نہیں چلا تھا، نہ دن کی خبر ہوئی اور نہ شام کی، ایسے ہی کاموں میں گئے گئے مہندی کا دن آن پہنچا تھا، آج مود نے اپنے گھر کو روشنیوں سے سجایا تھا، چھت پر مٹی کے دئے چلائے تھے، صحن میں رنگ رنگی جھنڈیاں لگائی تھیں، آج پوری برادری ان کے گھر میں جمع تھی، اتنا شور اور ایسی رونق تھی کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔

”کیا کر رہے ہو؟“ مصروفیت کے عالم میں بیک نہایت سریلی سی آواز کانوں میں دس گھولنے لگی تھی۔

”صبح عابدہ کی بارات آئے گی میں بارات کے کھانے کے لئے تیاری کر رہا ہوں۔“ وہ دیکوں کے پاس کھڑا تھا، ذرا ہٹ کے موبائل کانوں سے لگائے فاصلے پر ہو گیا تھا۔

”بارات صبح آئے گی اور تم کھانے کی تیاری ابھی کر رہے ہو۔“ وانیہ نے کہا تھا۔

”ہاں تو ساری رات کھانا کپے گا تو صبح بارات کو دیا جائے گا۔“

”یہ تو بہت ذمہ داری کا کام ہے۔“ وہ مود کے بارے میں فکر مند ہو رہی تھی، مود بے شک اس سے دور تھا مگر تصور کی آنکھ سے وہ ایسے کاموں میں ہلکان ہوتے سکتی تھی۔

”ذمہ داری کا کام ہے مگر ہمارے لئے



مشکل نہیں، ہم تو سخت محنت کے عادی ہیں اور پھر تو یہ کام ایسا ہے کہ عابدہ کے عزت کے ساتھ اپنے گھر ہو جانے کے احساس نے میرے اندر کیسی پھرتی اور جوش بھر دیا ہے، اس کا آپ اندازہ بھی نہیں کر سکتیں۔“

”میں اندازہ کر سکتی ہوں کیونکہ جتنا پیار تم اپنے گھر والوں سے کرتے ہو اس کو مد نظر رکھا جائے تو اندازہ ہو جاتا ہے۔“

”گھر والوں کے علاوہ اس دنیا میں ایک اور شخص بھی تو ایسا ہے جسے میں سب سے زیادہ پیار کرتا ہوں۔“ وہ یہاں دور آ کر وانیہ کو مس کر رہا تھا، اور اس وقت اس نے اس بات کا اظہار کرنا بھی ضروری سمجھا تھا۔

”اچھا وہ کون ہے۔“ دوسری طرف وانیہ کا دل دھک دھک کرنے لگا تھا۔

”ہے ایک پیاری سی باگلی سی منفرد سی لڑکی۔“ وہ اپنے لہجے میں چاشنی سمو کر بولا تھا۔

”اس لڑکی کا نام بھی تو بتاؤ۔“ وانیہ نے جلدی سے پوچھا تھا۔

”اس لڑکی کا نام تو میرے دل کی ہر دھڑکن پر لکھا ہے، ذرا غور سے سنیں دھک دھک کے علاوہ وہ ایک اور آواز بھی تو آرہی ہوگی وانیہ، وانیہ، وانیہ۔“ موحد نے وانیہ کے کانوں کو گر مادی

تھا، وانیہ کا چہرہ شرم سے لال ہو گیا تھا۔

”اب کچھ بولیں نا، خاموش کیوں ہو گئیں۔“ موحد نے پھر اسے چھیڑا تھا۔

”موحد اب بس بھی کرو، بلکہ یہ بتاؤ کب آؤ گے واپس۔“ وہ بات بدلنے ہوئے بولی تھی۔

”جب آپ حکم کریں۔“

”اگر میں کہوں ابھی آ جاؤ تو کیا سارے کا ادھرے چھوڑ کر میرے لئے آ جاؤ گے۔“

”ہاں آ جاؤں گا۔“ قدرے توقف کے بعد

موحد نے کہا تھا، وانیہ کا مان کچھ اور بڑھ گیا تھا۔

”مگر میں ایسا کیوں کہوں گی، میں یا میری محبت تمہارے کسی کام میں رکاوٹ نہیں بننا چاہوں گی، اللہ کرے عابدہ خیریت سے اپنے گھر جائے، تم پھر ہی آنا۔“

”او کے میڈیم اور کوئی حکم۔“ وہ بے طرح خوش ہو گیا تھا۔

”نہیں بس آج کے لئے اتنا ہی کافی ہے، فون بند کر لی ہوں، تم تو بڑی تھے نا خدا حافظ۔“

”او کے، خدا حافظ، مگر ایک بات اپنا خیال رکھئے گا۔“ موحد نے ہولے سے کہا تھا اور یہ لہجہ وانیہ کے روم روم میں خوشی بن کر اتر گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

”پپی برتھ ڈے تو ٹیو، پپی برتھ ڈے تو بیگ صاحب!“ بیگ صاحب اپنے کمرے میں کام میں مصروف تھے جب مریم علوی کی سریلی آواز کمرے میں گونجی تھی، انہوں نے چونک کر سر اٹھایا تھا، بلیک اور میرون کلر کے سوٹ میں گھری

گھری مریم علوی ان کے سامنے کھڑی تھی جس کے چہرے کی مسکراہٹ میں بھی ایک سرخمی اور آنکھوں میں چپکنے والے ستارے بھی اسرار و رموز سے پر تھے۔

”ٹھیک یوس مریم۔“ وہ اپنی سین سے اٹھ کھڑے ہوئے تھے، عورت کو ایسا احترام دینا ان کی سرشت میں شامل تھا۔

”اس میں ٹھیک یو والی کیا بات ہے۔“ وہ کرسی بھیت کر ان کے مقابل بیٹھ گئی تھی۔

”مس مریم تم سے محبت کرتی ہیں، تمہیں پسند کرتی ہیں، تمہاری اور ان کی انڈر اسٹینڈنگ بھی ہے۔“ پروفیسر مشتاق کی باتیں یکدم بیگ صاحب کی ساعتوں میں گونجنے لگی تھیں۔

”آپ نے میرا جنم دن یاد رکھا اور مجھے

وش کیا ٹھیک یو اس بات پر، جب سے ساتھ نبھانے والی ہستی نے منہ موڑا ہے تب سے ایسا کوئی بھی دن یاد نمی نہیں آتا، وہ بھی تو ایسے دنوں کو بہت اہتمام سے منایا کرتی تھی۔“ بیگ

صاحب کو اس موقع پر اپنی شریک حیات ٹوٹ کر یاد آئی تھیں کہ جسے ان سے بہت محبت تھی مگر جس کا ساتھ انہیں بہت کم ملا تھا، وہ بھی اس محبت کی

گرمی کو ترس رہے تھے اور ان کے بچے بھی۔

”اس کائنات میں خدائے بزرگ و برتر نے ہر چیز کا نعم البدل رکھا ہے، اس محبت کا نعم البدل بھی موجود ہے جو آپ کی مرحومہ بیوی آپ سے کرتی تھی بلکہ ہو سکتا ہے اس محبت سے بھی

بڑھ کر کوئی آپ کو چاہتا ہو۔“ آج تک جو بات مس مریم کے دل میں تھی بیگ صاحب کے تر سے ہوئے لہجے نے دونوں میں ٹوک زبان پر لا دی تھی۔

”کیا مطلب ہے آپ کا۔“ مریم علوی کی آنکھوں کی جوت بیگ صاحب سے چھپی تو نہ تھی پھر بھی وہ کہنے لگے تھے۔

”میں نے کوئی ایسی مشکل بات تو نہیں کی۔“ مریم ہنسی تھی اور بیگ صاحب کو لگا تھا کہ

آج وہ لمحہ آچکا ہے جس سے کافی عرصے سے وہ بچتے چلے آ رہے تھے اور آج ان چپکنے ستاروں اور

نیریں لہجے سے فرار ممکن نہ ہوگا۔

”بات کچھ آسان بھی نہیں ہے۔“ وہ ہولے

تھے۔

”بہت آسان ہے ایک محبت آپ سے کھو

گئی اور منوں مٹی تلے جا سوئی اور دوسری محبت آپ کے سامنے موجود ہے اور اب اس خوشی کے

موقع پر اپنے جنم دن کے موقع پر آپ چاہیں تو

اس محبت سے دامن بھر سکتے ہیں۔“ وہ پھیلیاں

بھونکا چاہ رہے تھے اور مریم علوی پوری طرح

کھل گئی تھی۔

”مگر مریم..... میں کیسے اس محبت سے

دامن بھریں تمہارے سامنے اک عمر بڑی ہے

بہت سے روشن راستے ہیں بہت اونچی منزلیں

ہیں اور میں اپنے دبجوں کے ساتھ اک جگہ پڑاؤ

ڈال چکا، جنہیں اس جھکے ہوئے شخص سے کیا ملے

گا۔“

”کیا اس پڑاؤ میں، میں نہیں ٹھہر سکتی کیا

اس جھکے ہوئے شخص کی ساری ٹھکن میں نہیں چن

سکتی کیا آپ کو میری صلاحیتوں پر کوئی شک

ہے۔“

”نہیں مس مریم ہمیں بلاشبہ آپ کی

صلاحیتوں پر کوئی شک نہیں۔“ مریم علوی اپنا

مقدمہ خود ہی بڑی مضبوطی سے لا رہی تھی،

پروفیسر مشتاق نے آ کر اس مقدمے کے حق میں

مضبوط دلائل دینے شروع کر دیئے تھے۔

”گلتا ہے آج میں بری طرح پھنس چکا

ہوں۔“ بیگ صاحب نے ہتھیار پھینک دیئے

تھے بس ان دونوں کے سامنے اپنی ہار کا اعتراف

کرنا ہائی رہ گیا تھا۔

”پھنس تو تم بڑی دیر کے چکے ہو مائی ڈیئر

فرینڈ، مگر جنہیں خبر نہ ہو سکی اس پھندے کی۔“

مشتاق، مریم علوی کی طرف دیکھ کر مسکرائے تھے

اور مریم کے خوبصورت چہرے پر روشنیاں سی

پھوٹ پڑی تھیں۔

”مشتاق مگر میرے بچے۔“ وہ اپنے بچوں

پر اپنی زندگی بھی قربان کر سکتے تھے یہ محبت کیا چیز

تھی، وہ اس موقع پر اپنے بچوں کی طرف سے اگر

کسی قسم کے تخطیلات کا شکار تھے تو بے جا نہ تھا۔

”وہ صرف آپ کے بچے نہیں ہم دونوں

کے بچے ہوں گے، ان معصوموں کا ساتھ مجھے

آپ سے بھی زیادہ پیارا ہوگا۔“ مریم علوی کا

ظرف کتاب بڑا تھا اس نے بیگ صاحب کا ہر خدشہ چنگیوں میں اڑا دیا تھا۔

”تم کیا سمجھتے ہو تم انہیں ماں کا پیار دے سکتے ہو، یہ تمہاری بھول ہے، تم لاکھ چاہو وہ پیار نہیں دے سکتے جو مس مریم انہیں دے سکتی ہے۔“ پروفیسر مشتاق نے کہا تھا۔

”مس مریم ایک دفعہ ایک اچھی طرح سوچ لیں، میں جلد بازی میں کوئی فیصلہ نہیں کرنا چاہتا۔“

”یہ جلد بازی میں نہیں ہے، یہ فیصلہ تو محبت نے کروایا ہے اور محبت میں کوئی جلد بازی نہیں ہوتی۔“

”مس مریم آپ کے گھر والے۔“ بیگ صاحب نے ایک نیا سوال اٹھایا تھا۔

”میرے گھر والوں کی آپ فکر نہ کریں، وہ میری رضا میں راضی ہیں، پچھلے نئی سالوں سے میں نے ہر اچھا رشتہ ٹھکرا رہا ہے اور اب تو وہ شکر ادا کریں گے کہ میں نے کسی کے ساتھ کی حالی تو بھری۔“

”یار بیگ اب بس بھی کرو، کیا بال کی کھال اتارنے پر تلے ہوئے ہو مس مریم کی محبت کے سامنے سر تسلیم خم کر دو۔“ پروفیسر مشتاق نے کچھ دیر بعد جوں سے کہا تھا۔

”اسے بال کی کھال اتارنا نہیں کہتے یار پوری زندگی کا معاملہ ہے، ایک لمحے کی جلد بازی پوری عمر پر محیط ہو جاتی ہے اور پھر بندہ پچھتانے کے سوا کچھ نہیں کر سکتا۔“

”آپ کو میرا ساتھ خوشی دے گا پچھتاؤا نہیں۔“ مریم علوی جلدی سے بولی تھی۔

”او کے مجھے بھی عرصہ ہوا خوشی کا منہ دیکھے ہوئے۔“ بیگ صاحب نے سر جھکا دیا تھا اور ان کے اقرار نے مریم علوی کے چہرے پر خوشیوں

کے پھول کھلا دیئے تھے۔

”آئی تم پروفیسر بیگ سے شادی کر رہی ہو۔“ مشائم علوی نے سنا تو حیران رہ گئی تھی۔

”ہاں تمہیں کوئی اعتراض ہے۔“ مریم علوی ناخن فائل کر رہی تھی اپنا کام روک کر اس کی طرف دیکھنے لگی تھی۔

”وہ شادی شدہ ہیں، دو بچوں کے باپ ہیں، آپ سے عمر میں بہت بڑے ہیں اس شادی پر ایک نہیں کئی اعتراضات اٹھ رہے ہیں۔“

”میں سب جانتی ہوں ان کے بارے میں پھر جب مجھے کوئی اعتراض نہیں تو کسی دوسرے کو بھی نہیں ہونا چاہیے۔“

”آپ اگر کوئی غلط فیصلہ کر رہی ہیں تو ہمارا فرض بنتا ہے کہ ہم آپ کو اس غلطی پر ٹوکیں۔“

”تم کس طرح کہہ سکتی ہو کہ یہ فیصلہ غلط ہے، ویسے بھی تم چھوٹی ہو چھوٹی بن کر ہی رہو، بڑوں کے معاملات میں بولنے کا تمہیں کوئی حق نہیں۔“ مریم نے مشائم کو جھڑپا دیا تھا، مشائم تاسف سے اپنی بڑی بہن کو دیکھ کر رہ گئی تھی۔

☆☆☆

یاسر علوی کا آفس حریم شہناز کی سوچوں سے زیادہ شاندار تھا، مشائم علوی کے چلے کو دیکھ کر اتنا تو اسے اندازہ تھا کہ اس کا تعلق کسی اچھی فیملی سے ہے مگر یہ تو اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ اتنی امیر و کبیر فیملی سے تعلق رکھتی ہو گی۔

”اندر چائے آپ۔“ اس نے چٹ پر اپنا نام لکھ کر اندر بھجوا دیا تھا اور کچھ ہی دیر بعد اسے اندر آفس میں بلوا لیا گیا تھا، مشائم علوی کی مضبوط سفارش جو اس کے ساتھ تھی، یاسر علوی کی خوش رو سیکرٹری نے بڑے احترام سے اسے اندر بھیجا تھا، وہ کچھ کچھ تھکے ہوئے اندر چلی گئی تھی۔

یاسر علوی ایک وجہ پر نوجوان تھا، مشائم خود بہت خوبصورت تھی اور اس کا بھائی کیسے بد صورت ہو سکتا تھا پراقتی دولت نے خود ہی شخصیت میں رعب و دبدبہ اور نکھار پیدا کر دیا تھا۔

”بیٹھے۔“ وہ فائل پر کچھ لکھ رہے تھے اسے کہہ کر پھر سے اپنے کام میں جت گئے تھے۔

”دو کپ کافی بھجوا دیں اندر۔“ وہ جب تک اس کے آفس کی ایک ایک چیز دیکھ چکی اور ہر چیز کو سراہ چکی تب یاسر علوی نے فائل بند کی تھی، اپنا سر کرسی کی بیک سے لگا دیا تھا اور ساتھ ہی انٹرکام پر کافی کا کہہ کر اس کی طرف متوجہ ہو گئے تھے، ان کے دیکھنے پر اس نے جلدی سے اپنی سی دی ان کے سامنے رکھ دی تھی۔

”ہونہہ غلطی ریکارڈ تو اچھا ہے کچھ تجربہ وغیرہ بھی ہے۔“ یاسر علوی نے پروفیشنل انداز میں پوچھا تھا۔

”جی سر دو سال کا۔“

”دیری گڈ، ویسے تو مجھے آپ سے کچھ بھی نہیں پوچھنا چاہیے تھا کیونکہ جس ہستی نے آپ کی سفارش کی ہے میں اس کی بات کسی قیمت پر بھی نہیں ٹال سکتا۔“ یاسر علوی کے لہجے میں بہن کے لئے محبت ہی محبت بول رہی تھی۔

”آپ کل سے جوائن کر سکتی ہیں، باقی آپ کی حاب کی نیچر اور سیلری وغیرہ کے بارے میں میری سیکرٹری آپ کو بریف کر دے گی آپ اس سے مل لیں۔“

”او کے سر اینڈ ٹھینک یو دیری جی۔“ وہ ممنوعیت کے اظہار کے طور پر بولی تھی اور ساتھ ہی جانے کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

”ابھی بیٹھے کافی آ رہی ہے، وہ بے بغیر تو آپ نہیں جاسکتیں۔“ یاسر علوی نے سادہ سے انداز میں کہا تھا اور حریم دوبارہ سے بیٹھ گئی تھی۔

”اور کیا ہائیز ہیں آپ کی۔“ وہ اب چہرے سے سنجیدگی کا لہجہ اتار کر ہلکے پھلکے لہجے میں پوچھنے لگا تھا۔

”بس سر کچھ خاص نہیں، مجھے صرف مطالعہ کرنا پسند ہے۔“

”دیری گڈ، کچھ خاص کیوں نہیں یہ بھی خاص ہے، اس کا مطلب ہے آپ کے پاس کافی ہانچ ہوگا۔“

”جی سر بکس پڑھنے کا یہ فائدہ تو ہوتا ہی ہے۔“ اس کا زلی اعتماد آہستہ آہستہ لوٹنے لگا تھا۔

”آپ میں مجھے مشائم کا عکس نظر آیا ہے، آپ میرے لئے اسی جیسی ہیں۔“ یاسر نے کہا تھا اور اس کے حریم کا دل چاہا تھا کہ اس خوبصورت اور وجہہ مرد کا بے بہا شکر یہ ادا کرے جس نے اسے بہن کا درجہ دے کر اپنی ہی نظروں میں معتبر کر دیا تھا۔

”لیجئے کافی آ گئی ہے۔“ بیون ٹرے اٹھائے اندر داخل ہوا تھا۔

اور پھر مریم نے بہت اطمینان سے گھونٹ گھونٹ کافی اپنے اندر اتاری تھی اسے اب اس جگہ سے بہت ہی تحفظ اور اپنائیت کا احساس ہو رہا تھا، رشتے واقعی جذبول کا مان بڑھا دیتے ہیں۔

(ہاتی آئندہ ماہ)

☆☆☆

## سورج فی گڑھ مہوڑوفا

شبانہ شوکت



حالانکہ اس کا خود کا ہاں نکل بھی دل نہیں تھا، چائے پینے کا، کمرے میں آئی تو وہ دانش روم سے باہر آ رہا تھا، چائے پی کر اس نے کھانے کی اور لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں۔

”چلو چھٹی ہوئی، دل نہ چاہنے کے باوجود چائے اس لئے پی لی کہ محترم سے گپ شپ کروں گی اور وہ ہے کے سو گئے اور یہاں اب دو کھٹے تک نیند آنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔“ وہ جھلا کر میسر پر چلی آئی، وہاں بھی بمشکل بیس منٹس بیٹھیں اور اندر آ کر ایک ناول لے کر بڑھنے لگی، کافی ٹائم گزر گیا اس نے اپنا دودھ کا گلاس پیا اور کھانے کے لیٹ گئی، آتے آتے نیند بھی آ ہی گئی تھی۔

☆☆☆

صبح وہ شامیں کو گود میں لے لی دی لاؤنج میں بیٹھا اور ٹی وی پر کارٹون لگائے، بڑے

”اللہ تیرا شکر ہے۔“ فارین آہستگی سے بیڈ پر سے اٹھی تھی، شامیں کو سلا نا کوئی آسان کام تو نہیں تھا، وہ کچن میں چلی آئی، زینت کاؤنٹر صاف کر رہی تھی۔

”کچھ چاہیے باجی!“

”نہیں کچی، میں دودھ لینے کے لئے آئی ہوں۔“ وہ مسکراتی ہوئی فریج تک آئی، ساس پین میں دودھ ڈال کر گرم کیا اور دو گلاسوں میں ڈال کر بیڈ روم میں لے آئی، سامنے دیکھ کر وہ اندر آئی ٹھک گئی، میکانل بیڈ پر نیم دراز تھا۔

”السلام علیکم! کب آئے آپ؟“ ٹرے سائیڈ پر رکھ دی تھی، وہ سیدھا ہو بیٹھا۔

”وعلیکم السلام! ابھی ابھی آیا ہوں۔“

”کھانا لاؤں؟“

”نہیں صرف چائے۔“ وہ اثبات میں سر ہلا کر پھر سے کچن میں آگئی دو کپ چائے تیار کی

مکمل ناول



انہماک سے دیکھ رہا تھا، فارین کو ہنسی آگئی۔

”تو کارٹون دیکھے جا رہے ہیں؟“

”نہیں ماما میں اور پاپا دیکھ رہے ہیں۔“

شائین نے فخر سے بتایا۔

”سچ ہے بیٹا، ضرور دیکھو۔“ وہ بھی پاس بیٹھ گئی۔

”پتا ہے میکال، میری پھوپھو آنے والی ہیں امریکہ سے، بہت سالوں بعد آ رہی ہیں، وہ جیسے ہی آئیں گی ہم لوگ فوراً ان سے ملنے چلیں گے۔“ اس نے صرف گردن ہلاتی تھی، فارین نے مایوسی سے اسے دیکھا تھا۔

”اپنی طرف سے کتنی ہی چونکا دینے والی خبر کیوں نہ سنا دوں، یہاں تاثرات بھی رہیں گے۔“ وہ اسے دیکھتی رہی، اسے دیکھنا بھی تو کتنا خوشگوار عمل تھا، مگر شرت اور بلیک پینٹ میں لمبوس انتہائی خوبصورت مرد جسے ایک دفعہ دیکھ لینے کے بعد نگاہ کو پلٹنا بھی جیسے کسی کے بس میں نہیں رہتا تھا، اتنا گراؤ، تباہی، جیسے فارز، سنہرے بال، نیلی آنکھیں، نیچے، قدرے اوپر کواٹھی ہوئی ناک، تھوڑی میں خم، چوند قد اور انتہائی سارٹ جسم، وہ اتنا حسین مرد اس کا شوہر تھا اس کا اپنا تھا، یہ احساس ہی کتنا خوبصورت تھا، وہ اسے دیکھنے میں منہمک تھی کہ میکال کی نظر اس پر پڑی، اس نے پہلے ہنسی سیکڑیں پھر اچکائیں، نظروں میں حیرت بھی تھی، وہ ہلکا سا کھٹکارا، وہ بڑبڑاتی پھر سیدھی ہوتے ہوئے ڈھٹائی سے ہنس پڑی تھی، میکال کے لبوں پر ایک لٹلے کے لئے مسکراہٹ جھلکی تھی، دوسرے ہی لمحوں میں وہ سنجیدہ ہو گیا تھا۔

”میں سوچ رہی تھی کہ اب شائین کا ایڈیشن کرو دینا چاہیے، تین سال کی ہونے والی ہے۔“

”ہوں تو کس اسکول میں۔“ میکال نے گود میں موجود شائین کو پکڑ لیا۔

”یہ تو دیکھنا پڑے گا، آپ ساتھ چلتے تو آسانی ہو جاتی۔“

”دیکھو کس دن فرصت ملتی ہے تو، بلکہ اگر کل ہی کوئی کام نہ ہو تو کل ہی چل کر دیکھ لیتے ہیں۔“

”اچھی بات ہے، تا آپ کی کوئی اور مصروفیت تو نہیں ہٹا کر آئے گی۔“

”May be۔“ گول مول جواب، وہ جملہ کر رہ گئی تھی۔

☆☆☆

فارین کے پاپا ہاشم رحیم ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں بہت اچھے عہدے پر فائز تھے، ان کے چار بیٹے تھے، ماہرین، معظّم، فارین اور معظّم، ہاشم کی دو بیٹیاں تھیں، شمسہ آہ اور رمشہ شمسہ آہ تو ان کے برابر والے گھر میں رہتی تھیں، ان کے تین بیٹے تھے اور ایک بیٹی، بڑا بیٹا محرم تقریباً سولہ سال پہلے ان کی چھوٹی بہن رمشہ کے پاس امریکہ گیا تھا مزید تعلیم کے لئے اور اب جرجن ڈاکٹر بن چکا تھا، رمشہ کی بیٹی مالکہ سے شادی کے بعد دو بیٹوں کا باپ بھی بن چکا تھا، اس سے چھوٹا میثم، معظّم کا ہم عمر تھا اور وہ انجینئر بن رہا تھا، اس سے چھوٹا ہشام ایڈس ویلی سے گریجویٹ کر رہا تھا، ہشام اور میثم کے درمیان میں ان کی اکلوتی بہن زینہ تھی جو معظّم کی منگیت تھی اور فارین سے ایک سال بڑی تھی مگر دونوں ایک ہی کلاس میں تھیں، دونوں ایم اے پر یو ایس میں تھیں، معظّم ان سے سینئر تھا، وہ دونوں اسی کے ساتھ یونیورسٹی آئی جاتی تھیں، راستے بھر معظّم اور زینہ کی ٹوک جھونک چلتی رہتی، وہ برائے جواب دیتی تھی، وہ ہانک دیتا۔

”ایسی شخصیت کی میرے متھے ماری ہے، ہر وقت نیچے تیز کیے رکھتی ہے۔“

اور زینہ پیچھے سے باقاعدہ اپنے لمبے ناخن

اس کی گردن میں چھو دیتی۔

”صرف تیز نہیں۔“ بہت تیز اور بردت استعمال کئے جانے والے پنچے۔

”سی۔“ وہ گردن مسلتا۔

”میں پھوپھو سے کہہ کر تمہارے یہ خونی ناخن کنوا کر چھوڑوں گا، تم دیکھنا۔“

”ہونہ بزدل انسان، پھوپھو سے کہہ کر، خود تو کچھ کر نہیں سکتے تو میری ماما کا ہمارا لوگے۔“

”یہ تو دقت آنے پر ہی تمہیں پتا چلے گا کہ میں کیا کر سکتا ہوں۔“ فارین کی موجودگی میں اس کی دھمکی ڈھکے چھپے نظروں میں ہوتی تھی مگر اس کی آنکھوں کے تاثرات زینہ کو ٹھیک ٹھاک کنفیوژ کر چکے تھے، فارین کو اپنے تاثرات چھپانے کے لئے کبھی بیک میں بلاؤ چھپانے یا گھڑکی سے باہر دیکھنے کی ضرورت پڑتی تھی، پھر فارین کو فلو اور بخار نے جڑ لیا تو زینہ سیزجیوں سے گر کر بستر نشین ہو گئی، دونوں ہفتہ بھر کے بعد جب یونیورسٹی آئیں تو نئے پروفیسر سر میکال محمد کے چرچے سن کر زیر ناز ہو گئیں۔

”یاد رکھنا تو سہی، کتنے ہیڈم ہیں سر میکال،

Absolute beauty, Foreign look, Smashing and charismatic personality we never seen before this kind of beauty

”یا اللہ! انہیں لگا وہ پاگل ہی ہو جائے گی، انہیں دیکھنے کا اشتیاق تو خود بخود پیدا ہو گیا تھا، تاؤتیکہ وہ کلاس میں آگئے اور ان دونوں کو لگا کہ اب تک سنی گئیں ساری ہی تعریفیں اس کی خوبصورتی کو بیان کرنے کا حق انہیں کر یا نہیں،

ارین تو لگتا تھا سانس بیٹا بھی بھول چکی تھی، وہ پنا پھر شروع کر چکا تھا اور فارین یقین سے کہہ

پنا پھر شروع کر چکا تھا اور فارین یقین سے کہہ

پنا پھر شروع کر چکا تھا اور فارین یقین سے کہہ

پنا پھر شروع کر چکا تھا اور فارین یقین سے کہہ

پنا پھر شروع کر چکا تھا اور فارین یقین سے کہہ

پنا پھر شروع کر چکا تھا اور فارین یقین سے کہہ

پنا پھر شروع کر چکا تھا اور فارین یقین سے کہہ

پنا پھر شروع کر چکا تھا اور فارین یقین سے کہہ

پنا پھر شروع کر چکا تھا اور فارین یقین سے کہہ

سکتی تھی، کہ کلاس میں موجود کسی بھی لڑکی کو اٹھا کر لیکچر کے متعلق کوئی سوال پوچھا جاتا تو وہ ایک لفظ بھی جواب میں نہیں بتا سکتی تھی، سب یونہی سرزدہ تھیں۔

”تو بے باب ایسا مرد بھی نہیں ہونا چاہیے۔“

اس کی کلاس ختم ہوتے ہی زینہ نے جھرجھری لی تھی، واپسی میں گاڑی میں بیٹھتے ہی وہ شروع ہو گئی۔

”ہائے گاڑی مومی، میں نے پہلے سر میکال کو دیکھ لیا ہوتا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ تم جیسے بے سرے سے منگنی کر دلاؤ گی۔“

”چلو تو تم نے بھی دیکھ لیا انہیں، ساری یونیورسٹی کی لڑکیوں کو سا گل کر کے رکھ دیا ہے، سر میکال نے۔“ اس کے منٹس کو تو معظّم نے کوئی اہمیت ہی نہیں دی تھی۔

”انہوں نے پاگل کیا ہے یا لڑکیاں خود ہی ہو گئی ہیں؟“

”یہ تو لڑکیاں ہی بتا سکتی ہیں۔“ وہ معنی خیز انداز میں اسے دیکھتے ہوئے مسکرایا تھا۔

”ہونہ۔“ زینہ نے سر جھٹکا۔

”میرے حواسوں پر تو ایک بھوت سوار ہے، وہی کافی ہے، البتہ۔“ اس نے آنکھوں سے فارین کو دیکھا اور دانستہ بات ادھوری چھوڑ دی، فارین نے کہا جانے والی نظروں سے اسے دیکھا۔

”ہاں کیا البتہ؟“

”وہ تم نے کوئی کھٹ نہیں کیا ان پر۔“ اس نے گھبراہٹ کی ایکٹنگ کی۔

”اچھے ہیں۔“ مختصر جواب دے کر زینہ کو چپ ہو جانے کا اشارہ کیا تھا، وہ ہنس پڑی تھی۔

☆☆☆

فارین کو اپنی کیفیت سمجھ نہیں آ رہی تھی، وہ تو

فارین کو اپنی کیفیت سمجھ نہیں آ رہی تھی، وہ تو

فارین کو اپنی کیفیت سمجھ نہیں آ رہی تھی، وہ تو

فارین کو اپنی کیفیت سمجھ نہیں آ رہی تھی، وہ تو

اس کے حواسوں پر سوار ہوتا چلا جا رہا تھا، جب تک وہ کلاس میں ہوتا، فارین کو اس کے علاوہ اور کچھ بھی دکھائی دینا بند ہو جاتا، گھر آ کر بھی وہ اسی کے متعلق سوچتی رہتی، ہر کسی نے اسے نوکا تھا کہ وہ کیوں اتنی کم سن ہو گئی ہے، زنبیا نے تو اپنی منہ پھٹ طبیعت کے باعث بر ملا اس سے کہا کہ وہ سر میکال کی محبت میں جتنا ہو گئی ہے، وہ اسے جھٹلا بھی نہ پائی، جس جذبے کو وہ خود بھی پوری طرح نہیں سمجھ پاری تھی، اسے اس کی کیا وضاحت دیتی، دن بہ دن وہ اس کی اسیر ہو رہی تھی، اس دن وہ دونوں اپنی دیگر فریڈز کے ساتھ کارڈور سے گزر رہی تھیں کہ میکال آتا دیکھائی دیا، سب اس سے سلام میں پہلی کی کوشش میں لگ گئیں، فارین کم سن، بنا کچھ بولے وہ مسراناڑ کھڑی تھی، میکال ایک اچھٹی نظر اس پر ڈال کر آگے بڑھ گیا تھا۔

ہجرت ہو رہی ہے

اس دن یونیورسٹی میں فنکشن تھا، فارین سچ کلر کی مٹی لکر کڑھائی والی کرتی اور آنف وہ اسٹ سگریٹ پیٹ میں بہت پیاری لگ رہی تھی اور بہ نسبت پچھلے دنوں کے خاصی چمک رہی تھی، وہ سب ہال میں آ بیٹھے تھے کہ اسٹ پر میکال نمودار ہوا، وہ کپڑے لٹک کر رہا تھا۔

”ہیت تیرے کی یار۔“ زنبیا ماتھے پر ہاتھ مار کر رہ گئی تھی، اسے پتا تھا کہ فارین جو اتنی دیر سے فارل لی ہو کر رہی ہے، اب پھر اپنے حواسوں میں نہیں رہے گی اور وہی ہوا تھا وہ ایک بار پھر اسے دیکھتے ہوئے ٹرانس میں چل گئی تھی، اسے خود بتائیں چلتا تھا کہ وہ اسے دیکھتے ہوئے پلکیں کیسے جھپکتی ہے، سانس کیسے لیتی ہے، اگر یہ اس کے اختیار کی چیزیں ہوتیں تو وہ نجانے کب کی پھرانی ہوئی آنکھوں کے ساتھ، سانس لینا

بھول کر مر چکی ہوتی، فنکشن ختم ہوتے ہی وہ اسٹج کے پیچھے چلا گیا تو فارین کے حواس بھی لوٹ آئے تھے، وہ زنبیا سے بہانہ بنا کر ہال سے باہر آ گئی تھی، زنبیا ویسے بھی اپنے گروپ کے ساتھ کپڑے میں مصروف تھی، اس نے بیک اسٹج جا کر معلوم کیا، سر میکال جا چکے تھے، ایک دوسرے اسٹوڈنٹ نے بتایا کہ وہ پارکنگ کی طرف گئے ہیں، وہ تیزی سے تقریباً دوڑتی ہوئی وہاں آئی تھی۔

”ایکسیکوزی سرا“ اس نے پھولی ہوئی سانس کے ساتھ اسے آواز دے کر روکا تھا، وہ جو اپنی گاڑی کا دروازہ کھول رہا تھا، پلٹ کر اسے دیکھا تو حیران رہ گیا۔

”جی آپ؟“ اس نے اپنی طلسمی آنکھیں فارین پر جمائیں تو وہ وہیں متجمد ہو گئی، کیا کہنے یہاں تک آئی سب بھول گیا، اسے خاموش پا کر میکال نے کلائی کھما کر رسٹ وایج میں ٹائم دیکھا، اس کی نظروں کا زاویہ بدلتے ہی فارین کو ہوش آ گیا۔

”سروہ میں آپ کی کپڑے کی تعریف کرنا چاہ رہی تھی۔“ بخشک وہ جملہ مکمل کر پائی تھی کیونکہ وہ ایک بار پھر اسے دیکھ رہا تھا، اس کی آنکھوں میں آنکھیں تھیں۔

”میکالس۔“ اس نے خفیف سا سر ہلایا اور بات ختم سمجھ کر گاڑی میں بیٹھنے کے ارادے سے دروازہ پورا کھولا کہ وہ اس کا ارادہ بھانپ کر پھر سے غائب ہو گئی۔

”وہ سر.....؟“ میکال نے بایاں ابرو تان کر اسے دیکھا۔

”کچھ اور بھی کہنا ہے آپ نے؟“ فارین نے اثبات میں سر ہلایا، وہ گہری سانس لیتا سیدھا ہو گیا۔

”جی کیسے؟“ وہ مسلسل گھبراہٹ کا شکار ہونے کے باوجود یہ جانتی تھی کہ وہ اس طرح کھڑا کتنی کوفت کا شکار ہو رہا ہو گا، اس لئے اس بار اس نے اپنی نظر گاڑی کے اوپر موجود میکال کے ہاتھ پر جما کر اپنی بات کہی تھی۔

”میں آپ سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔“ اور جسے ہر سوسنا چھا گیا تھا، کتنی ہی دیر پوئی گزر گئی تو اس نے ڈرتے ڈرتے نگاہیں اٹھائیں، وہ کار کی چھپ پر کبھی ٹکائے بڑے پرسکون انداز میں اسے ہی دیکھ رہا تھا، نہ حیرت نہ پریشانی، نہ اس کے اچانک پر پوزل پر کسی قسم کا رد عمل، یوں جیسے فارین نے کہا ہو۔

”میں آگس کریم کھانا چاہتی ہوں۔“ نگاہیں چار ہوتے ہی اس نے گاڑی کی طرف اشارہ کیا۔

”یہاں اندر بیٹھیں دو منٹس کے لئے، مجھے بھی آپ سے کچھ کہنا ہے۔“ خود اندر بیٹھ کر اس نے فرنٹ سائیڈ والا در کھولا فارین اندر بیٹھ گئی، دروازہ اس نے کھلا ہی چھوڑ دیا تھا، اس کے اتنے قریب بیٹھ کر تو فارین کو اپنے حواس معطل ہوتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے، اس کے لمبوس سے اٹھتی بھینتی مہک اس کے اعصاب پر چھا رہی تھی، وہ اپنی پوری شعوری کوشش سے خود کو اس کی طرف دیکھنے سے روک رہی تھی۔

”اچھا ہوا آپ نے یہ بات کہہ دی تو مجھے بھی موقع ملا کہ میں بتا سکوں کہ میرے لئے کم از کم یہ کوئی چونکا دینے والی بات نہیں ہے، کیونکہ آپ کی جو کنڈیشن کلاس روم میں ہوتی ہے وہ مجھ سمیت ساری کلاس کے علم میں ہے اور ابھی میں یہی توقع کر رہا تھا کہ آپ ایسا ہی کچھ کہنے والی ہیں، دنیا میں کئی لوگ ہیں جن کی شکل و صورت دوسروں کی بہ نسبت کچھ زیادہ اچھی ہوتی ہے تو کیا

انہیں دیکھ کر آپ جیسی لڑکیوں کی یہ کیفیت ہو جاتی ہے، نہیں؟ تو ابھی وقت ہے آپ خود کو کنٹرول کریں اور اپنا تمنا شانہ لگوائیں اور رہی شادی کی بات تو آئی ایم سوسری، میرانی اگال شادی کا کوئی ارادہ نہیں ہے، آپ بھی اپنی اسٹڈیز پر consider کریں اور اسے اندر maturity پیدا کریں۔“ اس کا لہجہ تو قمیص مگر الفاظ بہت سخت تھے۔

”Insulting Embaracing“ اس نے یک قلم جنبش سے اس کی محبت، اس کے پروپوزل کو ٹھکرا دیا تھا، مارے صدمے کے وہ لب بستہ بیٹھی رہ گئی تھی، کچھ دیر بعد بدلت ہوئی تھی۔

”نی اگال نہ سہی مگر کبھی تو آپ شادی کریں گے نا، تو جب بھی آپ شادی کے لئے سوچیں تو مجھے یاد رکھئے گا، میں آپ کا انتظار کروں گی۔“

”نہیں، میں آپ کو کوئی امید نہیں دلانا چاہتا اور شاید میں یہاں سے ریٹائر کر دوں کیونکہ مجھے ایک اور بہت اچھی چاب کی آفر ہوئی ہے۔“ اس نے دونوں بات کی تھی۔

”نہیں سرا پلیز نہیں، میں آپ کے بغیر.....“

”کچھ نہیں ہو گا میرے بغیر، یہ واقعی جذبات ہیں، جب میں یہاں سے چلا جاؤں گا تو آپ بھی سب بھول کر نائل ہو جا جائیں گی، اب مجھے اجازت دیں، میں آل ریڈی لیٹ ہو چکا ہوں۔“

فارین اپنی لارزٹی ٹانگوں پر قابو پاتی گاڑی سے باہر آ گئی، اس کے باہر نکلتے ہی اس نے دروازہ بند کیا اور زن سے گاڑی لے اڑا، وہ وہیں کھڑی رہ گئی تھی، شرمندگی، احساسِ ذلت، اپنی بات کی بے توقیری، اپنی ذات کی نفی، ان



کے بلڈ ٹیسٹ کروا کر بیماری تشخیص کر لی اور اس کا صحیح علاج کیا، زنبیا نے شرارت سے آنکھیں سمٹھائیں۔

”جی ہاں آپ کو پتا ہے ڈاکٹر کا نام کیا ہے۔“ وہ سسپنس بھرا وقفہ دینے کے لئے رکی، فارین کی خوشخوار نظروں سے سہم کر پیچھے ہوئی۔

”وہ میں سمجھی ماما ڈاکٹر کا نام بھول گئی ہیں۔“ اس کے منہ نے پر فارین نے ہنسی چھپانے کو منہ پھیر لیا تھا، کچھ ہی دن بعد وہ ان کے گھر موجود تھا، سبز عابدہ انصاری (فارین اور زنبیا کی انگلش کی ٹیچر) اور ان کے شوہر نہال انصاری اس بار اس کے ساتھ تھے، وہ لوگ باقاعدہ میکانیکل کارکن تھے، میکانیکل ان کا بھانجا تھا، اس کے والدین کی روڈ ایکسیڈنٹ میں ڈھکے ہو جانے کے بعد انہوں نے ہی اسے پالا تھا اور وہی اس کے گارجین تھے، انہوں نے بتایا کہ وہ اسی سال لاہور سے کراچی شفٹ ہوئے ہیں۔

”آپ ہمارے متعلق لاہور سے مکمل پتا کروالیں، انشاء اللہ اچھی رپورٹ ہی ملے گی۔“ نہال انصاری نے بہت اعتماد سے کہا تھا، پھر بھی ہاشم صاحب نے تمام ضروری معلومات تو کروائی ہی تھیں، جن کے مطابق تو سب ٹھیک تھا، میکانیکل کی پرسنل اس کا پلس پوائنٹ تھی اور جب شائستہ نے فارین سے پوچھا تو اس کے چہرے پر پھلتے رنگوں نے ہی انہیں جواب دے دیا تھا، زنبیا نے تو اسے جھپٹ جھپٹ کر اس کا ناک میں دم کر دیا تھا، ہاشم نے اس کی نامکمل بڑھائی کے لئے اپنی تشویش ظاہر کی تھی، جو کہ مکمل کروانے کا خود میکانیکل نے وعدہ کیا تھا اور اپنا وعدہ نبھایا بھی تھا۔

☆☆☆

جب فارین کا ایم اے مکمل ہوا تو شائین کی

خوشخبری بھی سننے کو مل گئی تھی، میکانیکل نے یونیورسٹی سے ریڑائن کر کے اپنا بزنس اشارٹ کر لیا تھا، اس سے یہ ہوا کہ اس کی مصروفیت بہت بڑھ گئی تھی، نہال انصاری اور عابدہ انصاری واپس لاہور شفٹ ہو گئے تھے، بقول ان کے ان کا کراچی میں دل نہیں لگا تھا، فارین بہت خوش تھی، ہر طرح سے، اس نے میکانیکل سے محبت کی اور اسے پالیا، ان دونوں کی ایک بہت پیاری بیٹی تھی شائین، جس سے بلاشبہ میکانیکل بہت محبت کرتا تھا، فارین کی جان تو تھی ہی، فارین کو اور کیا چاہیے تھا، وہ بہت خوش تھی، بہت خوش۔

☆☆☆

”پچھو آگئی ہیں پاپا کے ہاں، میں تو آپ کے انتظار میں رکی ہوئی ہوں کہ آپ آئیں تو ہم ملنے چلیں۔“

میکانیکل جیسے ہی آیا، فارین نے پر جوش ہو کر اسے بتایا تھا۔

”تو تم چلی جاتیں، میرا جانا کوئی ضروری تو نہیں۔“ وہ ہزاری سے ٹائی کھینچتا ہوا بولا تھا، فارین کا سارا جوش جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔

”اچھا تو نہیں لگتا۔“

”پلیز۔“ اس نے ہاتھ اٹھا کر اسے روکا۔

”تم چلی جاؤ اگر تمہیں جانا ہے تو۔“ وہ تیزی سے ڈریسنگ روم میں چلا گیا۔

”ماما، پاپا آگئے نا، اب نا تو گھر چلیں نا۔“ شائین نے اس کا بازو ہلایا۔

”نہیں پاپا نہیں جا رہے، میں اور آپ چلتے ہیں۔“

”نہیں، پاپا بھی چلیں گے، ہا، ہا، ہا۔“ وہ ڈریسنگ روم کے دروازے کو ہاتھ مارنے لگی۔

”جسٹ کمنگ ڈارلنگ۔“ بیٹی کو جواب دے کر وہ فوراً ہی باہر آگیا، شائین کو اٹھا کر چومتا

ہوا بیڈ کی جانب بڑھا۔

”نہیں نہیں۔“ اس کا ارادہ جان کر وہ چلی۔

”نا تو گھر چلیں۔“

”ڈارلنگ، پاپا بہت تھک گئے ہیں نا۔“

”نہیں نہیں۔“ وہ سرنگی میں ہلا کر منہ سے بھی احتجاج کر رہی تھی، میکانیکل نے فارین کو دیکھا جو پچھلی پگلوں اور اترے ہوئے چہرے کے ساتھ تنگن پہن رہی تھی، اس نے گہری سانس لی۔

”اوکے چلو، چلتے ہیں۔“ فارین نے فوراً مڑ کر اس کی طرف دیکھا، خوشی نے، اس کے سارے وجود کو جھٹک دیا تھا، وہ بے بسی سے مسکرایا۔

”I can't deny her“ وہ کھلکھلائی۔

”چلیں کوئی تو ہے جو آپ سے اپنی منوا سکتا ہے۔“ میکانیکل نے گہری نگاہ سے اسے دیکھا، کچھ چٹائی ہوئی نگاہ وہ ہنستی ہوئی باہر کی جانب بڑھ گئی تھی۔

☆☆☆

جب وہ بابا کے ہاں پہنچے تو وہاں چہل پہل ہی اور تھی، لاڈلج میں پچھو اور ان کی فیملی، بڑی پچھو کی فیملی اور ہاشم کی سیاری فیملی موجود تھی، فارین تو پچھو سے لپٹ گئی تھی، ہاشم نے مسکرا کر میکانیکل کو آگے کیا۔

”نہ میرا چھوٹا داماد میکانیکل، جس سے آج آپ کی پہلی ملاقات ہے۔“ رمشہ نے مسکراتے ہوئے میکانیکل کی طرف دیکھا اور چونک گئیں۔

”نہ تو میرا میکانیکل ہے، یہ تو میرا بیٹا ہے، میرا میکانیکل، یہ تمہیں کہاں سے ملا ہاشم، تم نے اسے ڈھونڈ بھی لیا اور مجھے بتایا تک نہیں کہ یہ یہاں تمہارے پاس تھا اور میں۔“ ان کی آواز کانپ

گئی، وہ حیران پریشان میکانیکل کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لے کر بے تحاشا جو منے لگیں، ہاشم تو کیا سب ہکا بکا رہ گئے تھے، دہلیاں انہیں منہ کرنے کے لئے آگے بڑھے۔

”رمشہ!“

”یہ دیکھو ڈینی، یہ ہمارا میکانیکل، ہمارا بیٹا، بالکل ویسا، جیسا بچپن میں تھا، بالکل آپ کے جیسا، یہ دیکھیں۔“ اب وہ خود بھی کانپ رہی تھیں، آنسو برابر آنکھوں سے گر رہے تھے، انہوں نے میکانیکل کا چہرہ ان کی طرف موڑا۔

”پلیز رمشہ تم اس نو جوان کو بھی پریشان کر رہی ہو۔“ وہ محل سے انہیں سمجھانے کی کوشش کرنے لگے ساتھ ہی میکانیکل سے بھی معذرت کی۔

”بیٹا یہ اس وقت اپنے تواسوں میں نہیں ہیں۔“ اور میکانیکل کیا جواب دیتا وہ تو خود حواس باختہ ہو گیا تھا۔

”آپ کے پیرنس۔۔۔۔۔؟“

”اس کے پیرنس کی تو ڈھکھ ہو چکی ہے۔“ ہاشم نے ہی جواب دیا تھا۔

”اوہ۔“ دانیال کی آواز نکست خوردہ تھی، انہیں بھی شاید امید بندھ گئی تھی، رمشہ نے ان کی بے یقین نظروں کو دیکھا۔

”آپ نے تو دیکھا ہے میکانیکل کی گردن پر مالک کی طرح سرخ پتی کا نشان تھا، میں وہ نشان دیکھ لیتی ہوں۔“ انہوں نے اس کی ٹی شرٹ کھینچ کر ٹھوڑی سی نیچے کی تو اس کی گردن پر واضح نشان موجود تھا، وہ بچان انگیزی سے چیخ پڑیں۔

”یہ دیکھو، یہ نشان، یہ ہمارا میکانیکل ہے ڈینی، یہ ہمارا بیٹا ہے، تم بتاؤ تمہارے پیرنس کے کیا نام تھے تمہیں ان کے نام تو یاد ہوں گے نا۔“ اب وہ ڈائریکٹ اس سے مخاطب ہوئی تھیں، اس

کی نظریں مسلسل رمشہ پر جمی ہوئی تھیں، بہت دھیمے سے اس نے کہا۔  
”رمشہ دانیال۔“

”دیکھا اسے یاد ہے، تمہیں یاد ہے تمہارے ماما پاپا کیسے تھے؟“ وہ اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھے بہت آس سے پوچھ رہی تھیں، میکال کی آنکھوں سے دو آنسو ٹوٹ کر گرے اور اس کے گریبان میں جذب ہو گئے۔  
”بالکل آپ دونوں جیسے۔“ سرکشی نما آواز میں کہتے ہی وہ اس بار خود ان سے لپٹ گیا تھا، رمشہ اپنی آواز میں رونے لگی تھیں، سارے ماحول پر سناٹا طاری ہو گیا تھا، کوئی بھی بولنے کے قابل نہیں رہا تھا، پھر دانیال ہی آگے بڑھے تھے اور اس سکوت کو توڑا تھا۔

”رمشہ پلیز کام ڈاؤن اور مجھے بھی تو ملنے دو میرے بیٹے سے۔“ انہوں نے رمشہ اور میکال دونوں کی پشت تھپتھپائی تھی، میکال خود آگے بڑھ کر ان کے گلے لگ گیا تھا، مگر م نے روتی ہوئی مائلکہ کو آگے کیا۔

”تم بھی مل لو اپنے بھائی سے۔“ وہ پیچھے سے آکر میکال کی پشت سے ہی لپٹ گئی تھی، دانیال نے مسکرا کر اسے آگے کیا، بہت لمبا جذباتی سین تھا جس نے سب کو رلا دیا تھا، سب نے فرد افراد انہیں مبارکباد دی تھی، رمشہ ایک پل کے لئے میکال کو خود سے الگ کرنے پر تیار نہیں تھیں۔

”میرا بچہ، میری جان، یہاں چار سال سے تم میرے انہوں میں تھے اور میں وہاں تمہاری یادوں میں کم، تمہارا دکھ سینے میں لئے بیٹھی رہی، مجھے بھنک بھی پڑ جاتی تو میں کب کی آگئی ہوتی۔“ انہوں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر چوما تھا۔  
”بجائے شکر ادا کرنے کے اس میں بھی

تاسف کا پہلو ڈھونڈ لیا۔“ دانیال شرارت سے مسکرائے۔

”شکرتو ادا کروں گی انشاء اللہ، جتنا شکر ادا کروں گی کم ہے۔“  
”تمہیں مائلکہ یاد تھی میکال؟“ دانیال نے پوچھا۔

”مائلکہ نہیں ملی Millce۔“ میکال اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔  
”اوہ یس ملی ام اسے ملی ہی تو کہتے ہیں۔“ وہ اچھل پڑے۔

”اور کیا کیا یاد تھا تمہیں؟“  
”بس، آپ ماما اور ملی، وہ بھی اب دھندلے لنتوش کے ساتھ۔“  
”پھر بھی کچھ تو یاد ہو گا نا، سات آٹھ سال کے تھے اس وقت۔“

”آؤ ہوں۔“ اس نے ملی میں سر ہلایا۔  
”بہت کم، جیسے مجھے یہ یاد ہے کہ میں آپ لوگوں کے ساتھ جہاں رہتا تھا، جس اسکول میں جاتا تھا، وہاں سب فارز تھے۔“

”تمہیں تو یاد ہونا چاہیے تھا کہ ہم امریکہ میں رہتے تھے اور اب بھی امریکہ میں ہی رہتے ہیں۔“  
”نہیں، مجھے یہ بھلا دیا گیا تھا۔“ اس نے جیسے خود کلامی کی تھی، دانیال بے طرح چوٹے تھے۔

”کیا مطلب بھلا دیا گیا تھا؟“ وہ چونک کر سیدھا ہوا۔

”نہیں میں یہ کہہ رہا تھا کہ میں بھول گیا تھا، ویسے بھی امریکہ کی 52 ریاستوں میں، میں آپ کو کہاں ڈھونڈتا۔“ دانیال بڑی دیر سے بغور دیکھتے رہے، میکال ہکا سا مسکرایا۔  
”خُش نہ کریں پاپا، مجھے کچ یاد نہیں تھا

کچھ بھی۔“

”مجھے شک نہیں یقین ہے میرے بچے ورنہ میں تمہیں خود گود میں بیٹھا کر اپنے گھر کا ایڈریس، اپنے فون نمبر، اپنے شہر، اپنی ریاست کا نام یاد کروا دیتا تھا، ہم نے تمہیں بہت پیار سے اور بہت الگ طریقے سر پرورش کیا تھا، ہم چاہتے تھے کہ ہمارا بچہ جنرل ناچ میں اپنے اسکول کے سب بچوں سے آگے ہو، اسے سب بتا ہو اور وہ سب تو کہنا یاد رکھتا، گھر کا پتہ ہی بھول گیا۔“ ان کے لہجے میں انفرادی رچی ہوئی تھی۔

”اب تو مجھے لگتا تھا آپ لوگ مجھے بھول چکے ہوں گے، آپ کے اور نجانے کتنے بچے ہوں گے اور ان میں آپ کو میں یاد بھی نہیں آتا ہوں گا۔“ دانیال نے اس کے کندھے سے تھام کر اس کا رخ اپنی طرف موڑا۔

”ہم تمہیں بھول گئے ہوں گے میکال، تم نے ایسا سوچا بھی کیسے، یہ خیال بھی تمہارے ذہن میں کیسے آیا؟ اپنی ماں کی تڑپ دیکھی ہے تم نے، جس نے ایک نظر میں تمہیں پہچان لیا، یہ کسی اور قابل رہ گئی تھی، چھ ماہ تک تو یہ ہاسپٹل نڈر ہی ہے، ملی کے لئے مجھے گورنس رکھنی پڑی، کتنے سال، نجانے کتنے سال لگے اس اس ڈنٹی، شعوری حالت میں آتے آتے، کتنی مشکلوں سے میں نے اسے دوبارہ جاب کے لئے راضی کیا کہ اس کا دل میں بھل جائے اور دماغ بھی، ہم نے آج تک بڑے بڑے ہاسپٹلوں کی آفرز کو قبول نہیں کیا، مگر تہدیل نہیں کیا شہر اور ریاست بدلنا تو دور کی بات کہ ہمارا بچہ گھر لوٹے تو اسے ہر چیز اپنی منتظر نظر آئے اور تم کہہ رہے ہو کہ ہم تمہیں بھول گئے ہوں گے۔“ ان کی آواز میں کمی اتر آئی، شدت جذبات سے ان کے آنسو نکل آئے، میکال نے انہیں اپنے ساتھ لپٹا لیا۔

”پاپا آئی ایم سوری، مگر میں اب واقعی مایوس ہوتا جا رہا تھا۔“

”او کے او کے پلیز پاپا تھوڑی سی خوشی تو منا لیں جب سے بھائی ملے ہیں، بہت رو رہی رہے ہیں۔“ مائلکہ کی بات پر دانیال روتی آنکھوں سمیت ہنس پڑے تھے، مائلکہ نے اپنے بچوں کی میکال سے ملوایا تو میکال کو بھی شائین کا خیال آیا۔  
”شائین یہاں آؤ، اپنی گرینی اور گریڈ پا سے ملو۔“ شائین اس صورتحال سے سہی ہوئی فارین کے پاس کھڑی تھی، میکال کے بلانے پر فارین اسے قریب لے آئی۔

”اوہ کیوٹ۔“ سب سے پہلے مائلکہ نے اسے اٹھا کر پیار کیا، پھر رمشہ اور دانیال نے، دانیال اسے گود میں بٹھا کر چھوٹی چھوٹی باتیں کرنے لگے، یہ تو شکر تھا کہ وہ دونوں شائین سے انگلیں بولنے رہتے تھے تو وہ سمجھ بھی رہی تھی ورنہ دانیال کی موجودگی میں تو سب کو انگلیں میں بات کرنی پڑتی تھی تاکہ وہ بھی شرکت گفتگو رہیں، مائلکہ اور دانیال کو بہت کم اردو کے الفاظ سمجھ آتے تھے، مائلکہ بے چاری تو پاکستان ہی شاید دوسری بار آئی تھی، اس کے لئے تو سب کچھ بہت نیا اور اجنبی سا تھا۔

☆☆☆

دن تھلی کی طرح اڑ رہے تھے وہ لوگ ایک ماہ کے لئے آئے تھے اور وقت یوں گزر رہا تھا کہ ایک ماہ کا پتا بھی نہیں چلا۔

”اوہ ماما آپ تو مت جائیں، ابھی تو میں آپ کی presence کو ٹھیک سے لیل بھی نہیں کر پایا۔“ میکال نے شکوہ کیا تو رمشہ کے اس کا سراپے سینے سے لگا لیا۔

”میری جان! ہاسپٹل کا مسئلہ نہ ہوتا تو میں جاتی ہی نہ، بس اب جا کر ریزائن کر دوں پھر



ہمیشہ کے لئے تمہارے پاس ہی آ جاؤں گی۔“  
”مجھے اکیلا چھوڑ کر۔“ دانیال نے منہ لٹکایا۔

”تو آپ بھی آ جائیں نا یہاں میرے پاس۔“ میکال نے مسکرا کر آخر کی، وہ بھی ہنسنے لگی۔

”تمہارے لئے تو نہیں، اپنی سسر کے لئے ضرور آؤں گا۔“ سب ہنس پڑے تھے۔

ہاشم نے ان کے لئے الوداعی ڈنکا بجایا تھا۔ کیا تھا ہوٹل میں، ڈنکا شروع ہونے سے کچھ دیر قبل ڈنکا کو اس کے ایک سالہ بیٹے شہر نے تنک کرنا شروع کر دیا، (تقریباً ڈھائی سال پہلے اس کی اور محکم کی شادی ہو چکی تھی)۔

”مجھے دو، میں اسے لالہ میں لے جاتی ہوں۔“ رمشہ نے ہاتھ بڑھائے۔

”اوہ خالہ، آپ کو زحمت ہوگی۔“  
”دیکھی زحمت، ادھر دو مجھے۔“ وہ اسے لئے

شہلی ہوئیں لالہ میں آئیں، پشت سے آتی سرکشی لڑائی آواز نے انہیں متوجہ کیا۔

”دیکھو میکال میں کچھ نہیں جانتی، آج رات جہیں میرے روم میں موجود ہونا چاہیے،

آج کے لئے میں کچھ نہیں سنوں گی۔“  
”میں نے کہا ہے نا میں پوری کوشش کروں

گا اور میں کوئی بہانہ نہیں بنا رہا، میرے مام اور ڈیڈ یہاں آئے ہوئے۔“

”میں کچھ نہیں جانتی تمہیں آج رات ہر صورت میرے ساتھ ہونا ہے۔“ تنکمانہ لہجہ،

فریج لب و لہجہ میں بولی جانے والی انگلیش اور میکال کا دبا دبا سا احتجاج۔

”اوکے میں پوری کوشش کروں گا، ابھی یہاں میری ساری فیملی موجود ہے، کوئی بھی یہاں

آ سکتا ہے، کسی کی بھی نظر پڑ سکتی ہے، میری پوزیشن بہت آکڑ ہے۔“ وہ تو پھر اسی مٹی تھیں، میکال اور کوئی غیر ملکی لڑکی، ہوٹل میں اپنے ساتھ

رات گزارنے کا حکم دینے والی، اس پر کتنی حادی تھی، کس رشتے سے، کس حیثیت سے، ان کے دربار میں چھڑے چل رہے تھے، وہ جانتی ہی کیا

تھیں میکال کے بارے میں وہ بے شک ان کی اولاد تھا، مگر ان کے ہاتھوں پرورش تو نہیں ہو پائی

تھی، ان کے زیر تربیت تو نہیں تھا نا اور یقیناً میکال کی ان کی طرف سے پشت بھی تھی وہ انہیں

دیکھ نہیں پایا تھا، بہت مشکل سے خود پر قابو پا کر وہ ال میں آئیں وہاں کھانا سرد ہو رہا تھا، انہوں

نے میکال کو دیکھا، وہ کمر سے نچوٹ نکلتا تھا بلکہ اپنی عادت کے مطابق بول کم اور سن زیادہ رہا تھا۔

”کچھ بات ہے رمشہ، تم اتنی خاموش کیوں ہو؟“ دانیال کو ان کا کھوپا کھویا انداز بہت محسوس

ہوا تھا، وہ منہ جھکیں۔  
”نہیں کچھ نہیں۔“

”کیا ہوا مام؟“ میکال فوراً متوجہ ہوا تھا، رمشہ نے بغور اسے دیکھا، وہی نارمل سے

تاثرات والا خوبصورت چہرہ، انہوں نے نفی منہ سر ہلا کر مسکرانے کی کوشش کی تھی، کھانا کھاتے تو

میکال اٹھ گیا تھا۔  
”مجھے ایک ضروری کام ہے، دیر بھی ہو سکتی

ہے۔“ سب سے معذرت چاہتے ہوئے آخر میں فارین سے مخاطب ہوا تھا اس نے اثبات میں ر

ہلا دیا، رمشہ نے گہری نگاہوں سے اسے دیکھا تھا۔

”میں آج میکال کی طرف رہوں گی۔“ دانیال کو بتا کر وہ فارین کے ساتھ چلی آئیں

فارین کے لئے میکال کا دیر سے آنا غالباً معمول حصہ تھا، اس لئے وہ آرام سے سونے چلی گئی ا

رمشہ وہ تو شاید برز پر جا بیٹھی تھیں کہ اس کی پیش نے انہیں نیند سے کوسوں دور کر دیا تھا تقریباً چار

بجے کا عمل تھا جب میکال کی گاڑی اندر آئی تھی، وہ تیز قدم اٹھاتا اندر آ رہا تھا، کہ لاؤنج میں

داخل ہوتے ہی ٹھنک گیا، رمشہ سامنے ہی کھڑی تھیں، سرد اور سفاک تاثرات کے ساتھ۔

”کہاں سے آرہے ہو اس وقت؟“  
”میں نے بتایا تو تھا کہ ضروری کام ہے۔“

”کون سا ضروری کام؟ اس لڑکی سے ملنا جو ہوٹل کی لابی میں کھڑی جہیں اپنے کمرے میں

بلا رہی تھی؟“ انہوں نے لہجہ بدلے بغیر سوال بدل ڈالا تھا اور میکال کا رنگ لکھے کی طرح سفید

پڑ گیا تھا۔  
”اسی کے ساتھ تھے نا تم، مجھے صرف یہ

پوچھنا ہے کہ اس سے تمہارا کوئی شرعی تعلق بھی ہے یا نہیں۔“ ان کا لہجہ بہت سخت مگر آواز بہت

دھمکی۔  
”نکرتا مت، میں وہیں کھڑی تھی، جب تم

اسے اپنے آنے کا یقین دلارہے تھے، مجھے صرف یہ بتاؤ اس سے تمہارا کیا تعلق ہے؟“ ان کے پے

در پے سوالات نے اس کے حواس ہی کم کر دیئے تھے، اس سے کوئی جواب بن نہیں پارہا تھا۔

”شادی کی ہوئی ہے اس سے؟“ اب اپنے سوال کی نوعیت بدلی تھی۔

”نونا مادہ تو صرف۔“ ایک زنانے دار تھیں نے اسے جملہ مکمل ہی نہیں کرنے دیا تھا، ان کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔

”میں صرف یہی کیلئے کرنا چاہتی تھی ورنہ تو وہ جس طرح تمہیں بلارہی تھی اور تمہارا وہ چوروں

والا انداز ہی بتاتی کے لئے کافی تھا کہ یہ تعلق رات کی سیاہی جیسا ہی کالا ہے شادی کی ان

لڑکیوں کو ضرورت بھی نہیں ہوتی یہ تو ان شریف

زادیوں سے کی جاتی ہے جو تنہا کمرے میں سوئی رہیں اور شوہر ہوٹلوں میں دوسری عورتوں کے

ساتھ چھوڑے اڑاتے رہیں، امریکہ میں تو یہ سب کام ہے جو ہم دن رات دیکھتے رہتے ہیں

لیکن یہاں پاکستان میں، وہ بھی اتنا کھلم کھلا اور کرنے والا بھی کون میرا پنا بیٹا، جس کے ملنے کی

میں دن رات دعائیں مانگتی رہی، وہ بیٹا ایسا گمراہ میں تصور بھی کرتی تو بھی تمہارے ملنے کی تنہا نہ

کرتی، میں تو شاید تمہاری وجہ سے اپنے بھائی کو بھی منہ دکھانے کے لائق نہیں رہ جاؤں گی، میری

معصوم بیٹی، جسے تم نے ایسا بے وقوف بنایا ہوا ہے کہ وہ کسی شک میں بھی مبتلا نہیں ہوتی، جب

کبھی اس کا بھرم ٹوٹا، نہ تم کہیں کے رہو گے نہ میں۔“ ان کا لہجہ بگڑ گیا، کتنے ہی آنسو پگھل

کے بند تو ذکر بہہ لگتے تھے۔  
”ماما پلیز۔“ وہ تڑپ کر آگے بڑھا، ہاتھ

آگے بڑھائے کہ ان کے آنسو پونچھ لے کہ انہوں نے سختی سے اس کے ہاتھوں کو پیچھے جھٹکا

تھا۔  
”مت چھو نا مجھے ان ہاتھوں سے۔“ غصے

سے ان کی آواز تیز ہو گئی تھی، ابھی اندر سے نورین کی آواز آئی تھی، غالباً وہ خود باہر آ رہی تھی، انہوں

نے جلدی جلدی اپنا چہرہ صاف کیا تھا۔  
”پچھو آپ..... اوہ آپ آگئے، تو یہاں

کیوں کھڑے ہیں، کیا ہوا ہے؟“  
”بس یوکی۔“ انہوں نے مسکرانے کی

کوشش کی۔  
”میں اسی کے انتظار میں جاگ رہی تھی، آیا

تو میرے پاس ہی بیٹھ گیا، باتوں میں وقت کا اندازہ ہی نہیں ہوا۔“ رمشہ نے اسے مطمئن

کرنے کے لئے جھوٹ تو بول دیا، مگر اندر سے جیسے شرم سے سر ہی نکلیں، میکال اس دوران رہے

قدموں اپنے بیڈروم میں چلا گیا تھا۔  
”جاؤ، تم بھی سو جاؤ، میں بھی تھک گئی  
ہوں، اب سوؤں گی۔“ فارین اثبات میں سر  
ہلاتی واپس چلی گئی، وہ بھی اپنے لئے مختص کمرے  
میں آ گئیں۔

”یا اللہ، کیا گناہ کیا تھا میں نے کہ ایسی  
سزائیں تو نے میرے لئے منتخب کر رکھی ہیں، پہلے  
بیٹا چمن گیا، اب ملاو ایسا بدکردار۔“ وہ ہلک ہلک  
کر رہی پڑیں، نبجانے کب روتے روتے آنکھ لگ  
گئی، صبح بارہ بجے وہ بیدار ہوئیں نہادو کر فریش  
ہو کر آئیں تو دانیال آئے بیٹھے تھے۔

”لگتا ہے ساری رات ماں بیٹا گپ شب  
کرتے رہے ہیں جواب اٹھا جا رہا ہے۔“ وہ  
مسکرائے تو وہ بھی ہلکا سا مسکرائیں۔

”بیٹے کی محبت نے تو لگتا ہے میری طرف  
سے بچانہ کر دیا ہے۔“

”ایسا کچھ نہیں ہے۔“ فارین ان کے لئے  
ناشتہ لے آئی۔

میکال بھی دپیں موجود تھا، شامین دانیال کی  
گود میں سوار تھی، رمشہ نے صرف چائے لی تھی۔

”پچھو کچھ تو لیں نا۔“

”نہیں بیٹا بالکل دل نہیں چاہ رہا۔“ انہوں  
نے شامین کو دانیال سے لے کر اس کا گال چوما  
اور گود میں بٹھایا، میکال کو مسلسل نظر انداز کئے۔

”شمسہ آیا اور ہاشم دونوں تمہیں بلا رہے  
ہیں، میں جہیں لینے کے لئے ہی آیا ہوں۔“

”ہاں چلیں۔“ وہ فوراً اٹھ گئیں، دانیال نے  
بہت ہی حیرت سے انہیں دیکھا۔

”میں تو سمجھا تھا کہ یہاں سے جانے پر  
راضی ہی نہیں ہوگی اور تم فوراً ہی اٹھ گئیں۔“ وہ  
بغیر کوئی جواب دیئے آگے بڑھ گئیں، دانیال نے  
اپنے امریکی اسٹائل میں کندھے اچکائے اور

ڈرائیونگ سیٹ پر آ بیٹھے، اب کچھ دنوں میں تو  
انہیں عادت ہوئی تھی رانٹ ہینڈ ڈرائیونگی۔

”اوکے میک، مائے سن، آنا شام کو، پھر۔“  
”نہیں رہنے دیں اسے، اس کی اپنی کائی

معروفیات ہیں ان میں ہی کائی معروف رہتا  
ہے، اسے ڈسٹرب مت کریں۔“ رمشہ کے لیے  
زہر آؤ آیا تھا، دانیال نے چونک کر پہلے انہیں پھر  
میکال کو دیکھا جو کم صم سا گاڑی کے پاس کھڑا  
تھا۔

”کیا بات ہے میک سے کوئی ناراضگی ہو گئی  
ہے؟“

”آپ گاڑی چلائیں۔“ وہ کھڑکی سے  
دوسری طرف دیکھنے لگیں، دانیال کچھ کہنا چاہتے  
تھے کہ فارین کو دیکھ کر خاموش ہو گئے وہ اور  
شامین بھی آ کر میکال کے ساتھ کھڑی ہو گئیں  
تھیں، انہیں الوداع کہنے کے لئے۔

”اوکے میک، مائے بوائے پھرتے ہیں گڈ  
بائے۔“ وہ چلے گئے مگر میکال وہیں پھرایا سا کھڑا  
رہ گیا تھا۔

”ہا، پاپا چلیں نا اندر، ٹی وی دیکھیں۔“  
شامین نے اس کا ہاتھ ہلایا، وہ چونکا۔

”ہوں، ہاں چلو۔“ وہ ٹی وی دیکھنے لگے  
اور فارین اپنے کاموں میں مصروف ہو گئی۔

☆☆☆

دوسرے دن ان کی فلائٹ تھی، دانیال صبح  
سے میکال کی طرف آئے ہوئے تھے، مالکہ بھی  
ان کے ساتھ ہی آئی تھی، مگر پھر لڑنے کے بعد کرم آ  
کر اسے لے گیا تھا، دانیال نے تنہائی میں بارہا  
میکال سے پوچھا کہ آخر اس کے اور رمشہ کے  
درمیان کیا بات ہوئی تھی، اس نے جواب میں  
خاموشی کو اپنائے رکھا، کہا تو بس اتنا۔  
”پاپا آپ یہیں آ جائیں ہمیشہ کے لئے،

مجھے آپ کی بہت ضرورت ہے۔“  
”کوئی بات ہے میک، کہیں کچھ غلط ہے  
تمہارے ساتھ؟“ انہیں تشویش ہوئی تھی۔

”آپ آ جائیں پھر۔۔۔۔۔“ وہ بات ادھوری  
چھوڑ کر چپ ہو گیا۔

”تمہاری مام کیوں تم سے ناراض ہیں؟“  
”وہ ایک ایسی بات پر ناراض ہو گئی ہیں،  
جس پر میرا کوئی اختیار نہیں ہے۔“ ایسا عجیب  
جواب سن کر تو وہ ایک دم سیدھے ہو بیٹھے۔

”میک یہاں دیکھو میری طرف، صاف  
صاف مجھے بتاؤ کیا بات ہے جو مجھ سے چھپائی جا  
رہی ہے، اسی کیا چیز ہے جو تمہارے اختیار کی ہی  
نہیں ہے اور تمہاری مام تم سے ناراض ہو گئیں،  
حالانکہ اسے تم سے کوئی چھپوئی مولی وجہ تو ناراض  
کر ہی نہیں سکتی، کیا بات ہے مجھے بتاؤ پلزز؟“ وہ  
سر جھکا کر جوتے کی نو سے کارپٹ مسلنے لگا،  
دانیال اسے کچھ دیر یونہی دیکھتے رہے، پھر گہری  
سانس لی۔

”تو تم نہیں بتا رہے، ٹھیک ہے آئندہ پر  
رکتے ہیں، انشاء اللہ۔“

☆☆☆

جاتے ہوئے ڈیپارچر لاؤنج میں رمشہ کی  
نظر ایک طرف کھڑے میکال پر پڑی، وہ اترے  
ہوئے چہرے کے ساتھ ایک ٹک انہیں ہی دیکھ  
رہا تھا، ان کے دل کو کچھ ہوا وہ بے اختیار اس کی  
طرف بڑھیں اور اس کا چہرہ دیووں ہاتھوں میں  
تھام کر چومتے ہوئے سرگوشی کی تھی۔

”مجھے میرے بھائی کے آگے رسوا مت کرنا  
میرے بچے، اپنے قدم یہیں روک لو، اسے اپنی  
ماں کی التجا سمجھ لو۔“ اور پلٹ کر تیزی سے باہر کی  
طرف چل دی تھیں، اگرچہ اس نے ایک بار بھی  
اپنی حرکت کے لئے ان سے کوئی معافی نہیں مانگی

تھی، پر وہ ماں تھیں، اتنے عرصے سے بچھڑے  
بیٹے سے ملنے کے بعد اسے اس کیفیت میں دیکھ  
کر ان کا دل پھل سا گیا تھا۔

☆☆☆

فارین خود حیران کہ میکال کا زیادہ وقت گھر  
میں ہی گزرنے لگا تھا، باہر جانا تو نہ ہونے کے  
برابر رہ گیا تھا، شام کو جب اس کا بپ پر رمشہ پچھو  
سے بات کرتے تو وہ ضرور پوچھتیں، ”میکال باہر  
زیادہ تو نہیں جاتا نا؟“

”نہیں پچھو، وہ تو بالکل ہی گھر کے ہو گئے  
ہیں آج کل۔“ وہ ہنستی۔

وہ بہت سنجیدہ اور کھویا کھویا سا رہنے لگ گیا  
تھا، فارین کا بہت دل چاہتا کہ وہ اس سے پوچھے  
کہ کیا مسئلہ ہے جس نے اسے یوں پریشان کر  
رکھا ہے مگر اسے اپنا وہ وعدہ یاد تھا جو میکال نے  
شادی کے پہلے دن اس سے لیا تھا کہ وہ اس کے  
معاملات میں ہرگز مداخلت نہیں کرے گی، سو وہ  
نہ چاہتے ہوئے بھی خاموش رہتی تھی، اس کا بیل  
فون بجنار ہتا وہ ریسو نہیں کرتا تھا، پی ٹی سی ایل  
پر آنے والی کالز بھی ایک آدھہ ریسو کر کے اپنی  
طبیعت کی خرابی کا کہہ کر معذرت کر لیتا، اس  
رات فارین کی آنکھ گھاس گرنے سے کھلی تھی جو  
میکال کا ہاتھ لگنے سے گرا تھا، وہ کونے میں جا کر  
دھیمے لہجے میں کہہ رہا تھا۔

”مجھے سب پتا ہے میں کہیں نہیں بھاگ  
رہا، میری طبیعت واقعی ٹھیک نہیں تھی۔“ اس کے  
لہجے میں کئی فک رہی تھی، رات کے سنانے میں  
اس کی دھیمی آواز میں کی جانے والی بات بھی  
فارین نے کان لگا کر سن لی تھی، یہ اور بات کہ وہ  
سر بہر بھی سمجھ نہیں آیا تھا کیونکہ اسے جاگتا دیکھ کر  
میکال فون بند کر کے بیڈ پر آ گیا تھا۔

☆☆☆

سات بج گئے تھے اور میکال ابھی تک نہیں آیا تھا، عموماً اس سے کہیں پہلے وہ آ جاتا تھا، دوبارہ چلا جائے تو وہ دوسری بات تھی، شامین تنگ کر رہی تھی۔

”پاپا کو فون کریں، وہ کیوں نہیں آئے۔“ اتنے میں یارن کی آواز آئی، شامین اچھلتی ہوئی باہر بھاگی تھی، فارین بھی مسکراتی ہوئی پیچھے آئی تھی، سامنے سے میکال آ رہا تھا، اس نے جھک کر شامین کو اٹھایا اور اسے چوم کر انگلی سے اپنے بائیں جانب اشارہ کیا اور کچھ کہا تو شامین جھک کر نیچے دیکھنے لگی اور فارین تو پہلے ہی حیران پریشان اس چھ سات سال کے بچے کو دیکھ رہی تھی، جو میکال کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا آ رہا تھا، کسی بچے کا میکال کے ساتھ آنا شاید اتنا حیران کن نہ ہوتا جتنا اس بچے کا میکال سے مشابہ ہونا تھا، وہ تو چھوٹا سا میکال لگ رہا تھا، فارین کا دل بیٹھنے لگا۔

”کون ہے یہ؟“  
”اندر چلو، بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔“ وہ پر سکون تھا۔  
”کچھ گھبرا یا ہوا سا لگ رہا تھا، فارین ایک صوفے پر بیٹھی تو میکال بھی شامین کو گود میں لئے بیٹھ گیا، وہ بچہ بھی اس کے ساتھ ہی بیٹھ گیا تھا۔  
”یہ میرا بیٹا ہے، میری پہلی بیوی کی اولاد، اس کے نام شموئیل ہے۔“ اس نے تو بہت نرمی سے بتایا تھا مگر وہ کرنٹ کھا کر پیچھے ہٹی تھی۔  
”بیٹا، پہلی بیوی کی اولاد؟ تو دل میں اٹھنے والا خدشہ ہے سبب نہیں تھا۔“ اس کا دل اتھاہ گہرائی میں کہیں ڈوبنے لگا تھا، وہ بغور اس کے رنگ بدلتے چہرے کو دیکھ رہا تھا اور اسے لگنے والے جذباتی دھچکے کو بخوبی سمجھ رہا تھا۔  
”آپ نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا؟“

”کیا نہیں بتایا تھا؟“ اس نے بڑے سکون سے پوچھا۔  
”اپنی پہلی شادی اور بچے کے بارے میں؟“

”جب ایک بات ختم ہو چکی تھی تو اس کا ذکر کرنے کی بھی کیا ضرورت تھی؟ اور میں نے تو تمہیں بھی شادی کے لئے منع کر دیا تھا مگر تم اس وقت ہر حال میں مجھ سے شادی کے لئے تیار تھیں، مجھے یقین ہے کہ اگر میں اپنی پہلی شادی کا بتا دیتا تو تم تب بھی منع نہ کرتیں، اپنی دوسری بات اگر ختم ہو گئی ہے تو مزید بحث کی تو میرے خیال میں ضرورت تو نہیں ہے، یہ میرا بیٹا ہے، میری ذمہ داری، تم اگر اس کی دیکھ بھال کر سکتی ہو تو اچھی بات ہے ورنہ میں خود موجود ہوں۔“ وہ کھڑا ہو گیا تھا۔  
”آؤ شموئیل میں آپ کو آپ کا کمرہ دکھا دوں۔“

وہ دونوں بچوں کے ساتھ کوریڈور کی طرف چلا گیا اور وہیں بیٹھی رہ گئی تھی، اس نے دو منٹ میں اسے اس کی اوقات بتا دی تھی، اس شادی میں اسے، اس کی یکطرفہ پسند کا طعنہ بھی مل گیا تھا، وہ سچ کہہ رہا تھا وہ اس وقت اس کی محبت میں اتنی مجبور ہو چکی تھی کہ اس کی پہلی شادی پر بھی کوئی اعتراض نہ کرتی تو اب اتنا دور کیوں، دل میں اتنی ٹیسس انھیں کیوں کہ وہ کسی اور کا شوہر بھی رہ چکا ہے، کسی اور کے بھی اتنا ہی خریب، کسی اور کے بچے کا بھی باپ بلکہ وہ شاید آج تک اسی عورت کی محبت میں گرفتار ہے کہ اس سے اتنا لیا دیا رہا ہے، اس کی یادیں اسے خوش ہونے ہی نہیں دیتیں، اتنا دکھ، اتنی اذیت، وہ وہیں ہاتھوں میں منہ چھپا کر رو پڑی تھی۔

☆☆☆

”میں شموئیل کے ایڈمشن کے لئے جا رہا ہوں، تم چلو کیساتھ؟“

”مجہ وہ تیار ہو کر اس کے پاس آیا، وہ گم صم شامین کو گود میں لئے اس کے ہاتھوں میں اٹھایاں پھیر رہی تھی، اس کے سوال پر اس نے صرف نظریں اٹھا کر اسے دیکھا اور بغیر جواب دیے دوسری طرف دیکھنے لگی، وہ شامین کو پیار کر کے چلا گیا، وہ اپنی سوچوں سے خبردار نہ ہوئی تھی وہ گئی تھی، جب شامین کے ایڈمشن کے لئے کہا تو ٹائم ہی نہیں ملا تھا اسے اور اس صاحبزادے کے لئے فوراً چل پڑا تھا۔

شام کو مٹی اور زنبیا آٹھیں تھیں، میکال، شموئیل کو کپڑے، جو تے دلائے گیا ہوا تھا، شامین ننھے شہزادے کے ساتھ کھیلنے لگی اور وہ لوگ آپس میں مصروف ہو گئیں۔

”خالہ نے تو ریزن کر دیا ہے، ڈینی انکل کو کچھ ٹائم لگ رہا ہے، انشاء اللہ وہ بھی جلد ہی آ جائیں گے، تمہارے اس سونے گھر میں کیسی رونق ہو جائے گی۔“ زنبیا چٹکی، فارین کے ہونٹوں پر ایک پھینکی سی مسکراہٹ پھیلی تھی۔

”کیا بات ہے؟“ وہ فارین، تم کیوں ابھی ہوئی لگ رہی ہو؟“ مٹی نے اس کی کیفیت سے کچھ اخذ کرتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں مٹی، کچھ نہیں۔“ اسی بل میکال کی گاڑی کی آواز آئی اور کچھ ہی دیر میں وہ لاؤنج میں تھا، شموئیل بھی ظاہر ہے ساتھ تھا، مٹی اور زنبیا جو مسکراتی ہوئیں انھیں چل گئیں، کچھ دیر تو اسی پوزیشن میں کھڑی رہ گئی تھیں۔

”یہ کون ہے، کس کا بچہ ہے یہ؟“ زنبیا کی آواز میں خوف تھا، میکال نے ایک نظر فارین کو دیکھا پھر ان دونوں کو۔  
”یہ میرا بیٹا ہے شموئیل۔“

”بیٹا۔“ مٹی نے بے یقینی سے پہلے شموئیل پھر میکال کو دیکھا۔

”اس کی ماں کہاں ہے؟“  
”ہماری تو بہت عرصہ پہلے علیحدگی ہو چکی تھی۔“

”تو یہ اب تک کہاں تھا؟ تم نے پہلے یہ سب کیوں نہیں بتایا؟“ ان کی آواز میں برہمی چھلک رہی تھی۔

”جب ہماری Diverse ہوئی تو مجھے اس کے پریکٹس ہونے کا پتا نہیں تھا، نہ اس نے اس کی پیدائش کی کوئی اطلاع دی، اب جب دوسری شادی کی تو اسے میرے حوالے کر دیا۔“

اس نے پہلی شادی کے متعلق سوال گول کر دیا تھا، سب کو خاموش دیکھ کر وہ شموئیل کو ساتھ لے کر اندر چلا گیا تھا۔

”یہ کب اس بچے کو لے کر آیا ہے، تم نے ہمیں یہ سب کیوں نہیں بتایا؟“ مٹی فارین پر الٹ پڑیں۔

”کیا بتاتی مٹی۔“ وہ شکست خوردگی سے بولی تھی۔

”اور لائے تو کل شام کو ہی ہیں۔“  
”میں رخصت آیا سے بات کروں گی، یہ دھوکا دیا ہے ان کے بیٹے نے ہمیں.....“ مٹی کا قصہ اب آسمان کو چھونے لگا تھا۔

”مامی پلیز، اس سارے قصے میں خالہ کا کوئی قصور نہیں ہے انہیں تو خود میکال بھائی اب جا کر ملے ہیں، یہ جو کچھ بھی کیا ہے میکال بھائی نے کیا ہے تو بات بھی انہی سے ہونی چاہیے۔“ زنبیا نے گل سے سمجھایا تھا۔

”کیا بات کریں اس سے، کیسی ڈھٹائی سے جواب دے کر چلا گیا ذرا شرم نہیں آئی اسے کہ کس طرح میری بیٹی کے سر پر سون کی اولاد لانا

کر بٹھا دی۔“ وہ بات کرتے کرتے رو پڑیں۔  
 ”مامی پلیز، حوصلہ کریں، فارین کو دیکھیں  
 کتنی ہمت سے کھڑی ہے، چلیں ہم گھر چلتے ہیں،  
 ماموں سے، ماما سے سب سے بات کرتے ہیں،  
 وہ لوگ خود بات کر لیں گے، میکال بھائی سے اور  
 فارین تم بھی مضبوطی سے حالات کو فیس کرو، اور  
 برابری کی سطح پر میکال بھائی سے بات کرو، ان کی  
 بہن بھی ہمارے بھائی سے بیاہی ہوئی ہے، وہ  
 جیسا تمہارے ساتھ کریں گے بدلے میں وہی  
 کچھ پائیں گے۔“ زنبیا نے اونچی آواز میں جو  
 دم کی دی گئی وہ اندر بیٹھے میکال نے بخوبی سنی تھی  
 اور پہلے سے اس کے چہنچہ ہوئے ہونٹ اور زیادہ  
 بھیج گئے تھے۔

☆☆☆

رات کو سچ بچا بابا، معظم اور اکرم (ننیا  
 کے والد) آئے تھے، کتنی ہی دیر ان کی میکال  
 سے بات چیت چلتی رہی وہ شریک نہیں ہوئی،  
 جب وہ جانے لگے تو پاپان اس کے سر پر ہاتھ  
 پھیرا، ان کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا البتہ معظم نے  
 اسے اپنے ساتھ لگا کر اس کا سر جو ماتھا۔  
 ”تم میری بہت پیاری اور مہربان بہن ہو،  
 اللہ تمہیں استقامت دے۔“ انکل نے بھی  
 مسکرنے کی کوشش کی تھی۔

”کوئی اتنا بڑا شو نہیں ہے یہ، بیٹا دل بڑا  
 رکھو۔“ رمشہ اور دانیال کو بھی اطلاع مل چکی تھی،  
 انہوں نے بھی فارین سے بات کی تھی۔  
 ”مگر اس کی ماں بھی ساتھ ہوتی تو  
 صورتحال مشکل ہو سکتی تھی مگر اب تم اطمینان رکھو،  
 یہ بچہ تمہاری زندگی ڈسرب نہیں کر سکتا۔“ رات کو  
 رمشہ نے میکال کو الگ سے نون کر کے پوچھا  
 تھا۔

”تم نے اس کی ماں سے شادی تو کی تھی

؟ یہ بچہ تمہارا جائز بچہ ہے؟“ ان کے لہجے کی  
 کاٹ نے اس کے دل کا چیر دیا تھا۔  
 ”ہائے گاڈ، ماما، یہ میرا جائز بچہ ہے۔“  
 ”اللہ کرے ہو۔“ انہوں نے نون بند کر دیا  
 اور وہ کتنی ہی دیر پتھر بنا بیٹھا رہا تھا۔

☆☆☆

شامین، شموئیل کے ساتھ بہت خوش رہتی  
 تھی، وہ بھی اب جبکہ چھوڑ کر اس کے ساتھ  
 خوب کھیلتا، فارین اس سے مخاطب نہیں ہوتی  
 تھی، لیکن اس کے کھانے پینے اور کپڑوں وغیرہ کا  
 خیال رکھتی تھی، میکال کے ساتھ بھی اس کے  
 تعلقات میں ایک سرد مہری سی آگئی تھی، اس کے  
 بھی سارے کام وہ خاموشی سے کر دیتی تھی پر  
 مخاطب بہت کم ہوتی، اس وقت اس نے نوڈل بنا  
 کر ان دونوں کو دیئے اور خود اپنے بیڈ روم میں  
 جانے لگے، کہ کال بیل کی آواز پر تیزی سے  
 دروازے پر آئی تھی، باہر کوڈیٹر کا نمائندہ کھڑا تھا،  
 جس نے اسے ایک بھاری لفافہ دیا، فارین نے  
 الٹ پلٹ کر دیکھا، صرف اس کا نام اور گھر کا  
 ایڈریس تھا، بھیجنے والے کا کوئی نام و پتا نہیں تھا،  
 اس نے اندر آکر لفافہ کھولا تو اندر ایک اور لفافہ  
 موجود تھا، اور اس کے اوپر ایک کاغذ تھا، فارین  
 نے اسے کھینچا۔

”ڈیئر فارین، اس لفافے میں میکال کی  
 بہت خوبصورت تصاویر اور ویڈیوز ہیں جو یقیناً  
 تمہیں سربراہ کر دیں گی۔“ انگلش میں اسے  
 یوں مخاطب کرنے والا کون تھا، اس نے حیرت  
 سے کاغذ کو الٹا پلٹا تھا، یہ کس نے اتنی بے تکلفی  
 سے لکھا تھا اور میکال کی تصویریں؟ اس نے  
 لفافے کے اندر موجود دوسرے لفافے کو نکالا اور  
 کھولا۔

تصویریں تعداد میں بہت زیادہ تھیں،

لفافے کلرڈن، یہی بتا رہا تھا، اس نے ایک  
 تصویر باہر کھینچی اور اس پر نظر پڑتے ہی اسے  
 کرنٹ لگا تھا، میکال کسی عورت کے ساتھ انتہائی  
 قابل اعتراض حالت میں تھا، اس نے کانپتے  
 ہاتھوں سے تصویر سائیڈ پر رکھی اور دوسری تصویر  
 نکالی، ایک اور لڑکی کے ساتھ ایک اور غلط پوز،  
 تیسری تصویر، تیسری لڑکی ایک کے بعد ایک  
 تصویر، ایک کے بعد ایک نیا چہرہ، تھوڑی سی  
 تبدیلی کے ساتھ تقریباً ایک جیسے مناظر، وہ کانپتی  
 ناگلوں کے ساتھ کھینچا تے ہاتھوں سے گرتی  
 تصویروں کے ساتھ بیڈ پر گر گئی تھی، اس کا سر  
 چکر رہا تھا دل نہ دھڑن تھی اتنی تیز ہو گئی تھی کہ  
 کانوں میں اس کی دھمک محسوس ہو رہی تھی، اس  
 میں دوسری ڈیز بھی تھیں اور ان میں کیا ہو گا یہ  
 تصویروں کی وجہ سے بخوبی پتا چل رہا تھا، دیکھنے  
 کی کیا ضرورت تھی، اس کا دماغ ماؤف ہو رہا تھا،  
 میاں بیوی کے رشتے میں سوائے ان کی اپنی  
 اولاد کے کسی تیسرے کی کوئی گنجائش نہیں نکلتی اور  
 ان دونوں کے رشتے میں یہ سننے سے نئے لخلق،  
 اتنے خوفناک انداز میں سامنے آتے ہی چلے جا  
 رہے تھے، محبت ہی تو تھی اس نے میکال سے،  
 ایسی خود غرض محبت کے اسے پانے کے علاوہ کچھ  
 بھائی نہیں دیا تھا، اب اس محبت کا خراج ادا  
 کرنے کا وقت آ گیا تھا۔

جس شخص کو اس نے بس سجدہ نہیں کیا تھا  
 درنہ تو ہر طرح سے اس کی فرمانبرداری کی تھی اور  
 اس شخص کی زندگی میں وہ کس مقام پر تھی، اتنی  
 عورتوں کے ساتھ منسلک رہنے والے کی زندگی  
 میں اس کی کوئی اہمیت رہی بھی نہیں سکتی تھی، وہ ہر  
 طرح سے اس کی وفادار تھی اور وہ اتنا گندہ، اتنا  
 غلیظ، اسے میکال سے کھن آ رہی تھی، یا نفرت  
 محسوس ہو رہی تھی، وہ فرق کرنے سے قاصر تھی،

بس اندر بہت ٹوٹ پھوٹ ہو رہی تھی جو اسے  
 بہت تکلیف دے رہی تھی، کافی دیر بعد وہ ہمت  
 کر کے اٹھی، تصویریں سمیٹ کر لفافے میں  
 ڈالیں، بس دو تین تصویریں اپنے ہینڈ بیگ میں  
 رکھ لیں اور لفافہ سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا، شامین کو تیار  
 کیا اور می کی طرف آگئی، اکثر وہ ان کی طرف  
 رہتے آیا کرتی تھی جب میکال کو ایک دو دن کے  
 لئے کہیں جانا ہوتا تو، وہ لوگ بھی عادی تھے اور  
 شامین بھی، سو وہ آرام سے ایک دن رہ لی، بغیر  
 کسی سے تذکرہ کئے، مگر کب تک؟ سب سے  
 پہلے اس نے زنبیا کو اعتماد میں لیا تھا۔

☆☆☆

بات چھوٹی نہیں تھی کہ چھپائی جاتی سوریٹ  
 اور دانیال تک بھی پہنچ چکی تھی کہ فارین ناراض ہو  
 کر نیکے آئی ہے اور واپس جانے کو تیار نہیں ہے،  
 انہوں نے بارش کی باری الگ الگ فارین کو  
 سمجھانے کی کوشش کی تھی لیکن اس نے صرف اتنا  
 کہا تھا کہ ”مجھو میری برداشت ختم ہو چکی ہے،  
 میں نے جو کچھ دیکھا ہے، وہ بیان کے قابل نہیں  
 ہے، آپ آئیں گی تو میں آپ کو ثبوت بھی دکھا  
 دوں گی۔“ وہ سن رہی تھیں، تو فارین کو بالآخر پتا  
 چل گیا تھا، جس کا خوف انہیں چین نہیں لینے  
 دے رہا تھا، وہ خدشہ سچ ثابت ہو گیا تھا۔

اگلے ہی ہفتے وہ دونوں پاکستان آ چکے تھے  
 اور سیدھے میکال کی طرف آئے تھے، لاکھ اس  
 سے ناراض سہی مگر اس کی حالت دیکھ کر رمشہ کو  
 بھی جھکا لگا تھا، وہ بہت کمزور اور سر جھایا ہوا تھا،  
 آنکھوں کے گرد حلقے اس کی بے خوابی کے گواہ  
 تھے، بڑھی ہوئی شیوار دھاتی رنگت بھی ماند پڑی  
 ہوئی تھی، شموئیل کو دیکھ کر دانیال بے اختیار ہو  
 گئے۔

”اوہ، اوہ یہ تو بنا بنایا میک ہے، اتنا سا ہی

”اب ہم تہہ گھڑ گیا تھا۔“ انہوں نے اسے اپنے ساتھ لپٹا لیا۔  
 ”میں تمہارا گریڈ پا ہوں اور یہ تمہاری گریڈ۔“ انہوں نے اسے رمش کی طرف کیا تو انہوں نے ساتھ لگا کر اس کی پیشانی چوم لی تھی۔  
 ”ہاں یہ بالکل میکال ہے بنا بنایا۔“  
 ”کچھ ہی دیر بعد مقسم آیا تھا وہاں۔“  
 ”یہ آپ نے دیا ہے آپ کے لئے۔“ رمش نے حیرت سے لفافے کو دیکھا اور کھول کر چیک کیا اور اندر موجود تصویر نکال کر سامنے کی۔  
 ”یہ کیا غلط ہے۔“ وہ چیخ اٹھیں، دانیال نے گھبرا کر ان کے ہاتھ سے تصویر لے لی۔  
 ”اوہ۔“ انہوں نے اسے الٹ دیا۔  
 ”میں نے غلط کہا تھا کہ یہ میرا بیٹا ہے، بالکل غلط کہا تھا، یہ میرا بیٹا نہیں ہو سکتا، یہ اتنا گرا ہوا انسان میری اولاد ہو ہی نہیں سکتا۔“ وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئیں۔  
 ”ہوش کرو رمش، ملازم اکٹھے ہو جائیں گے۔“  
 ”ہو جائیں مجھے کوئی پروا نہیں، مقسم مجھے یہاں سے لے چلو، میں یہاں ایک منٹ بھی مزید نہیں رکھ سکتی، میں اس کی شکل نہیں دیکھنا چاہتی۔“  
 ”رمش پلیز، آرام سے۔“  
 ”پلیز ڈینی، مجھے جانے دیں ورنہ میری کوئی نس پھٹ جائے گی۔“ وہ تیزی سے مقسم کے ساتھ باہر چلی گئیں، دانیال جو اٹھ کر کھڑے ہو چکے تھے، دوبارہ بیٹھ گئے، ان کا انداز ہارا ہوا تھا، میکال یوں صوفے پر سر جھکائے بیٹھا تھا جیسے جو ہوا اس کا اسے پہلے ہی اندازہ تھا یا اسے اس کی پروا ہی نہیں تھی، اس کے چہرے کے تاثرات میں بھی کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔

”یہ سب کیا ہے میک، تم ہر بات کے جواب میں خاموش کیوں ہو جاتے ہو، کیوں نہیں بتاتے کہ تمہارے ساتھ کیا پر اہم ہے، پچھلی بار تم نے کہا تھا کہ میں یہاں آ جاؤں تو تم مجھے سب بتا دو گے، تو اب مجھے کھل کر وہ سب بتاؤ، جس نے تمہارے ہونٹوں پر یہ مہر لگا دی ہے کہ تم اپنی صفائی میں بھی کچھ نہیں کہتے، چاہے تمہاری بیوی تمہیں چھوڑ کر چلی جائے، چاہے تمہاری ماں تمہیں برا بھلا کہہ دے، تم آگے سے کوئی وضاحت کیوں نہیں دیتے، مجھے بتاؤ آخر کیوں؟“  
 ”وہ سب صحیح کہہ رہی تھیں تو کیا وضاحت دیتا۔“ بہت دہمی آواز میں اس نے کہا تھا، وہ خاموش ہو گئے، پھر اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے پاس جا بیٹھے۔  
 ”مجھے اتنا تو اندازہ ہے کہ تم بہت پریشان ہو، یہ جو کچھ بھی ہے۔“ انہوں نے تصویروں کی طرف اشارہ کیا۔  
 ”اس میں تمہاری خوشی شامل نہیں ہے اور مجھے یقین ہے میرا بیٹا ایسا ہو بھی نہیں سکتا، مجھے صرف یہ بتاؤ تم یہ کرنے کے لئے مجبور کیسے ہوئے؟“  
 ”وہ بہت دیر چپ رہا پھر ایک لمبی سانس لے کر نہیں دیکھا۔“  
 ”پاپا ماں باپ اپنے بچوں کی اگر صحیح حفاظت نہیں کر سکتے تو انہیں ساتھ لے جاتے کیوں ہیں، انہیں اغوا کیوں ہونے دیتے ہیں، پھر یہ تو اٹھا لے جانے والوں کی مرضی ہے نا وہ جیسے چاہیں ان بچوں کی پرورش کریں، جو چاہیں ان بچوں سے کروائیں۔“  
 ”میں مانتا ہوں، ہم سے کوتاہی ہوئی کہ تم ہم سے چوک گئے، لیکن اب تدارک کی یہی

صورت ہے کہ تم مجھے سب بتاؤ۔“  
 ”چھ سال کی عمر میں جب مجھے اغوا کر کے جہاں لے جایا گیا تھا وہ ایک ادارہ تھا، بہت بڑا، جہاں بہت سے لڑکے اور لڑکیاں تھے جن کی باقاعدہ تربیت ہوتی تھی، کوئی اغوا شدہ تھے تو کوئی گمشدہ اور کوئی اپنی مرضی سے گھر کو چھوڑ کر آنے والے، وہاں شادی کر کے سب کچھ سمیٹ کر دفن چکر ہو جاتا یا امیر مردوں اور امیر عورتوں کے ساتھ نام گزارا سب شامل ہے، میں بد قسمتی سے، وہاں موجود سب لڑکوں سے زیادہ ڈیمانڈنگ تھا، یونیورسٹی میں چاب کا مقصد ہی لڑکیوں کو اپنی طرف متوجہ کرنا ہوتا تھا، فارین سے پہلے بھی میری متعدد شادیاں کروائی گئیں، صرف ایک رات گزارنی ہوتی تھی اور سب سمیٹ کر غائب، شومیل کی ماں بھی انہی میں سے ایک تھی مجھے تو اس کی صورت نام کچھ بھی یاد نہیں تھا، جب وہ مجھے ڈھونڈ کر مجھ تک پہنچی اور شومیل کو میرے حوالے کرنے کے بعد مجھ پر تھوک دیا تھا، اس نے کہا کہ اگر یوں مجھے طلاق دینی تھی تو مجھے برباد کیوں کیا، میں چپ کر کے اس کی گالیاز سنتا رہا، جتنا بھی کیا، وہ اسی لئے تو سب کرواتے تھے، کہ بلیک میلنگ اسٹف تیار ہو سکے، جس سے لڑکی والوں کے منہ بند کروائے جا سکیں اس ضمن میں بھی بہت احتیاط کی جاتی تھی کہ.....“ وہ جھجک گیا، دانیال نے اس کا کندھا تھپتھپایا۔  
 ”کہ بچوں کی صورت نشانیاں پیچھے نہ رہ جائیں مگر یہ شومیل بتا نہیں کیسے؟ شاید قدرت کا یہ بھی ایک طمانچہ ہے میرے منہ پر، ایکی، فرانس کے، سفارتکار کی بیٹی ہے، وہ جب بھی پاکستان آتی ہے مجھے ہی پائز کرتی ہے، ہاس کے منہ مانگے داموں پر جب ہاسٹم انکس نے آپ کو نفیر ویل ڈنر

دیا تھا تو مانا نے مجھے اس سے بات کرتے دیکھ لیا اور جب میں گھر آیا تو وہ میرے انتظار میں جاگ رہی تھیں، انہیں جتنا بھی پتا چلا وہ اسی پر بہت ناراض ہو گئیں۔“  
 ”تم نے فارین سے ایسی باقاعدہ شادی کیسے کر لی؟“ دانیال کا وجود زلزلے کی زد میں تھا، اس کے ہونٹوں پر پہلی بار مسکراہٹ آئی تھی۔  
 ”وہ مجھ سے محبت کرنے لگ گئی تھی، بہت زیادہ، مجھے تو ان دینی مجنوں کی عادت تھی، اس کی بچی، معصوم اور بے ریا محبت میرے لئے ایک انوکھا تجربہ تھی، وہ ساری کلاس سے بے گانہ ہو کر، بے خود ہو کر مجھے دیکھتی تو لاکھ نظر چرانے کے باوجود مجھے ایسا لگتا جیسے میرے آلودہ دل میں نئے نئے جذبے بیدار ہونے لگے ہیں، میں اسے جھٹلانے کے لئے اس سے بہت بے نیازی برتا، انجان ہا رہتا لیکن میرے اندر بہت تہذیبیاں آ رہی تھیں، اس نے مجھے خود شادی کے لئے کہا تھا ورنہ میں بھی اس کے ساتھ شادی کا سوچتا بھی نہیں، میں نے اسے انکار کر دیا لیکن وہ بیمار پڑ گئی ان دنوں میرا ایک کوئیگ بیمار تھا، میں اس کی عیادت کے لئے ہسپتال گیا، باہر آیا تو وہ بھی ساتھ والی لیبارٹری سے کھل رہی تھی، اتنی بیمار، اتنی کمزور کہ میرے دل کو کچھ ہونے لگا، میں نے اسی وقت اس سے شادی کا فیصلہ کر لیا اور مضبوطی سے اس پر ڈٹا رہا، کتنی مشکلات ہوئیں مجھے اس سے شادی کی اجازت لینے کے لئے، وہ صرف مجھے پتا ہے، انہوں نے مجھے شرائط پر اجازت دی تھی اور ان شرائط میں سے سب سے اہم شرط ہی یہی تھی کہ میں اپنی سابقہ روٹین برقرار رکھوں گا، میں ان کی ساری شرائط مان کر ہی چل رہا تھا، فارین نے نہ تو مجھ پر کبھی شک کیا تھا، نہ کوئی روک ٹوک اور نہ ہی بلاوجہ کے سوالات؟ اس نے

کبھی مجھے کسی چیز کے لئے تنگ نہیں کیا تھا، مگر ماما کو تھوڑا سا بھی پتا چلا تو وہ بہت ناراض ہو گئیں، ان کی خاطر میں زندگی میں پہلی بار ان سے بھانے بنانے لگا، کبھی اپنی بیماری کا بھانہ تو کبھی فارین یا شامین کی بیماری کا بھانہ، لیکن وہ بگڑنے لگے، مجبوراً مجھے وہ سب پھر سے کرنا پڑا، پھر شوئیل آگیا اور میرے لئے ایک اور عذاب تیار ہو گیا، اب وہ چاہتے ہیں کہ میں شوئیل انہیں دے دوں، انہیں میری جوانی میں ہی میرا تبادلہ مل گیا ہے، وہ اسے ہرگز چھوڑنے کے لئے تیار نہیں ہیں لیکن میں کبھی بھی اس معصوم کو ان کے حوالے نہیں کروں گا، ایک مدت ہوئی میں میل پراسٹیٹ (Male Prostitute) بنا ہوا ہوں، کسی طور اس گندے دھندے سے، اس کھینچے سے گل نہیں پار ہوا تو اپنے اس بچے کو جسے میں نے ایک باپ کی طرح بالا ہی نہیں، میں اسے ان لوگوں کو دے دوں، جو میری طرح اسے بھی ایک کھلونے کی طرح برتیں، اس کی زندگی سے کھیلیں وہ ایسی زندگی جیتے جس میں اس کی اپنی کوئی مرضی ہی نہ ہو، صرف کٹھ پتلی کی طرح وہ ان کے اشاروں پر ناچے نہیں، میں ایسا کبھی نہیں ہونے دوں گا، کبھی بھی نہیں، کم از کم میری زندگی میں تو یہ ممکن نہیں۔

”تو کیا تمہاری زندگی کو بھی خطرہ ہے؟“

دانیال کے سوال پر اس کے ہونٹوں پر پھٹکی سی مسکراہٹ پھیلی تھی۔

”مجھے تو کیا، کسی کو بھی بغاوت کی، فرار ہونے کی یا کسی بھی طرح تنظیم کو چھوڑنے کی اجازت نہیں ہے ورنہ اسے مار ڈالا جاتا ہے، کیونکہ کسی بھی صورت میں ان کے راز لیک آؤٹ ہو سکتے ہیں۔“ دانیال نے بغور اسے دیکھا۔

”تو یہ سب جو تم مجھے بتا رہے ہو تو.....“

”میری زندگی کی اب کوئی گارنٹی نہیں رہ گئی، اب تو وہ میرے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑے ہوئے ہیں، آپ بس مجھ سے وعدہ کریں کہ شوئیل کو کہیں دور لے جائیں گے، وہ کسی بھی طرح ان کے ہتھے نہ چڑھے۔“

”اور شامین، اسے نہیں اٹھا سکتے وہ؟“

”نہیں۔“ وہ تڑپ کر سیدھا ہوا۔

”اللہ نہ کرے، اللہ نے کرے پایا، آپ مجھ سے وعدہ کریں، آپ میرے دونوں بچوں کو کبھی ان کے ہاتھ نہیں لگنے دیں گے، پلیز پایا۔“

دانیال نے اسے اپنے ساتھ لپٹا لیا، ان کا دل دکھ سے بھٹ رہا تھا، ان کا بیٹا، اس وقت سب کی نفرتوں کا شکار کتنا تنہا، کتنا دکھی تھا، سب کے ہوتے ہوئے بھی کتنا اکیلا تھا۔

”مجھ سے جو ہو سکا میں کروں گا، میں تمہیں یوں تو نہیں چھوڑوں گا جس تم مجھے ایک ایک بات بتاؤ، ہاشم نے بتایا تھا، کہ تمہارے پرد پوزل کے لئے ایک پہل آیا تھا، وہ پھر بھی نظر نہیں آیا، وہ لوگ کون تھے؟“

”نہال انصاری اور ان کی سسر، وہ ہماری تنظیم کے ہی لوگ تھے، ایسے لوگ ہر شہر میں موجود ہیں، جو ہماری کوریج کرتے ہیں۔“

”اب یہ سب فارین کو مجھوانے کا کیا مقصد تھا؟“

”مجھے بلیک میل کرنے کے لئے، وہ سمجھتے تھے کہ میں ایسے فکسٹ مان کر شوئیل کو ان کے حوالے کر دوں گا مگر اب نہیں، اب میں اس کھیل سے تھک گیا ہوں، اب تو اچھا ہی ہے کہ وہ تنگ آ کر مجھے ماری ڈالیں۔“

”میک۔“ دانیال نے تڑپ کر اسے ٹوکنا چاہا مگر وہ آج سب کچھ دینا چاہتا تھا۔

”میں نے اسی لئے ایک بار بھی کسی کے سامنے اپنی صفائی پیش نہیں کی، فارین کا مجھ سے الگ ہونا ہی بہتر ہے، چار سال کا مختصر ساتھ رہا ہے ہم دونوں کا، اس میں سے بھی کتنا عرصہ میں اس کے ساتھ رہا ہوں، کوئی اچھا سا کھیل گیا تو وہ سب بھول جائے گی، وہ مجھ سے ناراض ہے، مجھ سے نفرت کر رہی ہے، یہی ٹھیک ہے، یہی اس کے حق میں بہتر ہے، اگر وہ خوشی خوشی شامین کو دے دے تو آپ لے لیجئے گا اور اگر نہ.....“

”صرف شامین کو لے لوں یا اسے بھی جو آنے والا ہے؟“

”آنے والا ہے، کون آنے والا ہے؟“

اس نے حیرت و ناہنجی سے انہیں دیکھا اور اس سارے عرصے میں پہلی بار ایک بے ساختہ مسکراہٹ ان کے ہونٹوں پر پھیلی تھی۔

”فارین Expect کر رہی ہے۔“ وہ ہکا بکا انہیں دیکھتا رہ گیا تھا، یہ تو اس کے وہم و گمان سے بھی پرے کی بات تھی، ایک ایسی سانس لے کر اس نے آنکھیں بند کر لیں، ہر طرف سے جکڑتی ان پیاری پیاری زنجیروں نے اسے نہ بھاگنے کے قابل چھوڑا تھا نہ مرنے کے۔

”تمہیں خوشی نہیں ہوئی؟“

”نہیں، اس سے فارین کی مشکلات بڑھیں گی، یہ نہیں ہونا چاہیے تھا۔“

”تو یہ سب پہلے سوچتے، اتنا ہی اس کی فلاح کا خیال تھا تو اس سے شادی ہی نہ کرتے، وہ جتنی بھی دکھی، دوتی یا بیمار، ہالڈ فرسٹیبل جاتی، اب اس طرح تو اس کا سمجھنا بہت مشکل ہے۔“

”ہاں ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ، میں مانتا ہوں، مجھ سے یہ بہت بڑی غلطی ہو گئی ہے کہ اس سے شادی کر لی، مجھے اس سے شادی نہیں کرنی چاہیے تھی، اس طرح زندگی میرے لئے بہت

مشکل ہو گئی ہے، بہت اذیت ناک، کاش میں اس تعلق کو وہیں ختم کر دیتا، آج میرے لئے یہ جو مشکلات ہر طرف سے اٹھتی چلی آرہی ہیں، ان سے میں خود ہی نمٹ لیتا، اب تو سب ہی میرے ساتھ اٹھنا پڑا ہو گئے ہیں۔“ اس نے پریشانی سے اپنی پیشانی مسلی۔

”اور اگر فارین سے شادی نہ کرتے تو ہمیں کیسے ملتے؟“ اس بار وہ بہت دکھ سے مسکرایا تھا۔

”اس ملنے کا بھی کیا فائدہ، میں تو آپ لوگوں کے لئے ہر جگہ شرمندگی کا یہی باعث بنا ہوا ہوں۔“

”مجھے تو خیر کسی قسم کی کوئی شرمندگی نہیں ہے، ہر انسان سے غلطیاں ہوتی ہیں، یہاں تو تم بہت مجبور تھے، اب آؤ براہ راست موضوع پر، تمہیں اس تنظیم کے پاس کا نام پتا ہے، وہ کون ہے، کہاں رہتا ہے؟“

”وہ زیادہ تر امریکہ میں رہتا ہے، بمشکل سال میں دو بار پاکستان آتا ہے، اس کا نمبر تو پاکستانی ہے اور یہیں رہتا ہے، مختلف شہروں میں ان کے مختلف عہدے دار ہیں۔“

”ہوں یعنی بیگ باس امریکی ہے، نام کیا ہے اس کا؟“

”ڈیوڈ جیمز۔“ میکال نے بتایا۔

”کیا؟“ وہ بے ساختہ چلائے۔

”کیا نام لیا تم نے، دوبارہ بولو۔“

”ڈیوڈ جیمز۔“ اس نے حیرت سے انہیں دیکھا۔

”وہ تو میرا کزن ہے، وہ تو تمہیں اچھی طرح جانتا تھا اس نے یہ کیوں کیا؟“

”میکال تو خود اتنا حیران تھا کہ کچھ بول ہی نہیں پایا۔

”تم دیکھو میں اس کے ساتھ کیا کرتا ہوں، میں تمہیں دی گئی ایک ایک اذیت کا حساب لوں گا۔“ وہ شدید اشتعال کی لپیٹ میں تھے، میکال نے پانی گلاس میں ڈال کر انہیں دیا، وہ پی کر ان کا غصہ بھی قدرے کم ہوا تو انہوں نے اسے حکم دیا۔

”تم انھو اور ابھی میرے ساتھ چل کر اپنی ماں اور فارین سے معذرت کرو، وہ لوگ بھی شکاذ ہیں، حقیقت پتا چلی تو ضرور ٹھنڈے دل سے غور کریں گے۔“

”نہیں پاپا، معذرت کیسی، کیا کہوں میں، وہ ویڈیوز، وہ تصویریں سب جھوٹ ہیں؟“

”نہیں تم یہ مت کہو لیکن آئندہ کے لئے تو اچھی امید دلا سکتے ہو، کیا تمہیں وہ دونوں یاد بھی نہیں آئیں؟“ جواب میں اس نے اتنی زحی نگاہوں سے انہیں دیکھا کہ وہ خود سے بھی شرمندہ ہو گئے۔

”میک میرے بیٹے تم نے کیوں اپنے آپ کو اتنی مشکل میں ڈال رکھا ہے میرے ساتھ چلو تو سہی۔“

”نہیں آپ پاپا، وہ آپ کا انتقام کر رہے ہوں گے، میرا نہیں۔“ وہ اپنے بیڈروم میں چلا گیا، دانیال بہت بھاری قدموں سے وہاں سے آئے تھے۔

☆ ☆ ☆

”تم کیسی ماں ہو رمشہ، جس بیٹے سے ملنے کے لئے اتنے عرصے سے تڑپ رہی تھیں، اسے پانے کے بعد ساری تڑپ ساری محبت ختم ہو گئی، اب صرف نفرت اور غصہ رہ گیا اس کے لئے، وہ تو پہلے ہی زخم زخم ہے، تم نے ماں بن کر ڈاکٹر بن کر اس کے زخموں پر برہم رکھنے کے بجائے اسے اپنے الفاظ سے وہ نشتر چھوئے کہ وہ لہو بہو ہو گیا،

تم اس کے دکھ سینے کے بجائے اسے مزید دکھی کرتی رہیں، تم نے اسے پالائیں، اس کی تربیت نہیں کی تو اس طرح بے عزت بھی کرنے کا کیا حق تھا تمہیں، اتنی مشکلات سے گزرنے کے باوجود وہ ہمیں نہیں بھولا، ہمارے نام لکھ لکھ کر یاد رکھتا رہا اور تم سے تو وہ اتنی محبت کرتا ہے کہ ہم دونوں سامنے ہوں تو وہ تمہاری طرف ہی دیکھتا رہتا ہے، تمہاری خوشی کے لئے اس نے اپنے مصائب بوجھ لئے، اس بیٹے کو تم طنز سے چھلکی کرتی رہیں، تم نے اس سے ایسا برتاؤ کیا کہ آئندہ کے لئے اسے تم سے کوئی امید ہی نہیں رہی، وہ فارین جو اس کی محبت میں سب کچھ گزرنے کے لئے تیار تھی وہ اسے ایک دم یوں چھوڑ آئی کہ نہ وضاحت نہ صفائی کی موقع دیا یہ کس قسم کی محبتیں ہیں، جو ایک دم سے یوں بدگمان ہو جاتی ہیں، تم کم از کم اس سے رک کر آرام سے بھی تو پوچھ سکتی تھیں کہ وہ اتنی برائی میں کیوں ملوث ہوا اور جھٹکارے کی کیا صورت ہے، اب جب کہ وہ اسے کرکس میں ہے کہ اس کی جان بھی داؤ پر لگی ہوئی ہے تو.....“

”ڈینی پلیز۔“ وہ ان کی بات کاٹ کر بری طرح رو پڑیں، بیٹے کی زندگی کی جو کہانی دانیال نے سنائی تھی، وہ دکھ اور شرمندگی سے ٹوٹ کر رہ گئی تھیں، اس کی زندگی بھی خطرے میں تھی، یہ خوف تو سانس بھی ٹھیک سے نہیں لینے دے رہا تھا۔

”اس وقت جب وہ اپنی اور اپنی آنے والی نسل کی بقاء کی جنگ لڑ رہا ہے تو ہماری محبت اور اعتماد کا بندھن اس کے ساتھ ہونا چاہیے، اس کی پشت مضبوط ہو گئی تو وہ دشمن کے سامنے بہادری سے سینہ سپر ہو گا۔“

”آپ مجھے اس کے پاس لے چلیں

پلیز۔“ رمشہ کو پتا تھا دانیال کتنے ہی غصے میں کیوں نہ ہوں، ان کے ساتھ زیادہ دیر ناراض نہیں رہ سکتے، وہ کچھ دیر انہیں دیکھتے رہے جو روز اول کی طرح ہی آج بھی بہت عزیز تھی، یوں روٹی، جھلکی ان کو کمزور کر گئی۔

”او کے لیکن اب تمہاری طرف سے کوئی غلط بات نہیں ہوئی چاہیے۔“ ساتھ ہی تنبیہ بھی کی تھی، رمشہ نے اثبات میں سر ہلایا، وہ انہیں ساتھ لے کر میکال کے ہاں چلے آئے، وہ اپنے بیڈروم میں تھا، ٹیبل سوچکا تھا اور وہ نچانے کن خیالات سے نبرد آزما تھا کہ ان کے آنے کی اطلاع پر تیزی سے لاؤنج میں آیا، رمشہ کو دیکھ کر وہ ٹھک ٹھکا، وہ خود ہی اٹھ کر اس کے پاس چلی آئیں۔

”میں نے؟“ بہن بہت کچھ غلط کہہ دیا، جس کے لئے میں تم سے معذرت کرنا چاہتی ہوں۔“ اس نے انہیں رد کرنا چاہا مگر وہ کہتی رہیں۔

”جب میں سچائی سے آگاہ ہی نہیں تھی تو مجھے یہ سب کہنے کا کیا حق تھا۔“ انہوں نے اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں قلم لیا۔

”میں نے کیوں اتنی بکواس کی، کیوں تمہیں اتنے زخم لگائے، میرا بچہ تو پہلے ہی دوسروں کے لئے کھلونا بنا ہوا تھا، میں نے کیوں اسے توڑنے کی کوشش کی۔“ انہوں نے اس کے رخسار چوم لئے، میکال نے انہیں اپنے سینے سے لگالیا۔

”پلیز بابا، آپ نے کچھ بھی غلط نہیں کیا، آپ پریشان نہیں ہوں، آپ مجھے کچھ بھی کہہ سکتیں ہیں۔“ ان کے آنسوؤں سے اس کا گریبان تر ہو رہا تھا۔

”ماما پلیز ایسے مت کریں۔“ ان کی متورم آنکھیں وہ پہلے ہی دیکھ چکا تھا، دل کو دھچکا سا لگا تھا۔

”مجھے بہت تکلیف ہو رہی ہے آپ کو یوں دیکھ کر۔“ وہ اور زیادہ رونے لگیں، بہت مشکل سے میکال نے انہیں چپ کر دیا تھا، پھر انہیں ساتھ لئے صوفے پر آ بیٹھا۔

”یہ پانی پیئیں۔“ اس نے گلاس ان کے لبوں سے لگایا، دانیال خاموشی سے انہیں دیکھ رہے تھے۔

”آج کا دن جتنی باتیں اس سے کرنی ہیں کر لو، پھر کل میں اسے کہیں اور شفٹ کر دوں گا۔“ رمشہ نے چوک کر انہیں دیکھا۔

”کہاں لے جائیں گے اسے؟“ ”ہے ایک محفوظ پوائنٹ میرے ذہن میں، یہاں ہر جگہ اس کے لئے خطرہ ہے، مجھے کچھ ضروری کام ہیں، میں چلتا ہوں۔“

”اور ٹیبل، وہ کہاں جائے گا؟“ ”ہمارے ساتھ اور کہاں جائے گا۔“ ”وہ..... وہاں.....؟“ وہ ہچکچاہٹیں، وہ سمجھ گئے۔

”تو ہم الگ رہائش کا انتظام کر لیں گے، اب دوسروں کے لئے میں اپنے بچے کو نہیں چھوڑ سکتا۔“ ان کے لہجے سے کئی فک رہی تھی۔

”اور ہو سکتا ہے مجھے کچھ دنوں میں امریکہ جانا پڑے، مائیکل اور ہنری کو انوار کو کرنا پڑے؟“ ”ورنہ ڈیوڈ پر ہاتھ ڈالنا آسان کام نہیں ہے۔“ رمشہ نے اثبات میں سر ہلایا تھا، دانیال کے بھائی مائیکل پولیس کمشنر تھے اور ہنری ججسٹس Justice تھے، ان کے والد ری ہلکین پارڈ کے ایک سینئر عہدیدار رہے تھے، ابھی کچھ نو عرصہ پہلے ان کا انتقال ہوا تھا، دانیال کی بگڑے ہوئے بڑے بڑے لوگوں تک تھی، باقی کی ان کے دونوں بھائی پوری کر دیتے، دانیال اور ڈیوڈ صرف کرن تھے بلکہ ایک ہی گلاس میں پڑتے



تھے، دانیال بہت ذہین تھے، بے حد اور ڈیوڈ ان کے مقابلے میں کم ذہانت کا مالک تھا، دانیال جو پہلے ڈسٹریکٹ تھے، بہت خوبصورت شخصیت کے مالک بھی، دونوں جب کالج پہنچے تو ڈینی کی مختلط طبیعتی خوبصورتی لڑکیوں کو ان کی طرف دیوانہ وار کھینچتی تھی، وہ بھی ہنس کر سب سے ملنے مگر اسیر ہوئے تو کس کے، ایک مسلمان پاکستانی لڑکی پر، جو میڈیکل کرنے کے لئے امریکہ آئی تو ڈسٹریکٹ اس پر دل ہار بیٹھے، اندر سے تو شاید وہ ان کی خوبصورتی سے متاثر ہوئی بھی ہو تو بھی اوپر سے بے نیاز بنی رہتی تھی، وہ ہاشور لڑکی تھی، جانتی تھی کہ ان کے "میزان" صرف معاشرہ ہی نہیں، مذہب بھی حائل ہے سو وہ اپنے آپ میں ہی رہتی تھی، روز کا سامنا، ڈسٹریکٹ کی محبت بھری نظریں، اس کی ظاہر اور درپردہ ہر طرح سے مدد کرنا، اندر سے کہیں وہ نرم پر رہی تھی، ہر چند کہ پڑنا نہیں چاہتی تھی، تعلیم ملنے ہوتے ہی اسے جاب کی آفر ہوئی تو اس نے ٹھکرنا کفرانِ نعمت سمجھا اور بعد میں پتا چلا کہ ڈسٹریکٹ بھی اسی ہاسٹل میں ہیں اور پھر انہوں نے اسے پردہ پوش کر ڈالا، رمشہ نے انکار کر دیا، اسے انکار کرنا ہی تھا مگر ڈسٹریکٹ نے یہ کہہ کر اسے حیران کر دیا کہ وہ مسلمان ہونا چاہتا ہے، بڑے سخت مراحل تھے وہ جن سے گزرنا پڑا تھا، ڈسٹریکٹ کو اپنے گھر میں سخت مذاحمت کا سامنا کرنا پڑا، ڈیوڈ تو ان پر اُلٹ پڑا۔

”تمہارا مانگ خراب ہو گیا ہے ڈینی، تم ایک دن سخت پیچھے ڈو، ایسا سچا مذہب چھوڑ کر تم بے راہ رہو جانتے ہو۔“

”پلیز ڈیو، میں بہتر سمجھتا ہوں کہ میں کیا کر رہا ہوں۔“

جائے۔“ رمشہ کے والدین سے انہوں نے فون پر بات کی تھی اور رمشہ کے چاچو، جن کے پاس وہ رہ رہی تھی، نے فون پر اپنے بڑے بھائی سے ڈسٹریکٹ کی بہت تعریف کی تو رمشہ کے اماں اور بابا امریکہ آ گئے، ڈسٹریکٹ سے مل کر وہ سچ سچ بہت خوش ہوئے تھے، انہوں نے روائتی والدین کے برعکس کھلے دل و دماغ سے اس فیصلے کو قبول کیا تھا۔

ڈسٹریکٹ کا قبول اسلام اور ان کا نکاح ان کے سامنے ہی ہوا تھا، ایک سال بعد میکال پیدا ہوا تھا، وہ بھوڈ ڈسٹریکٹ کا ہم شکل، بہت خوبصورت بچہ، رمشہ کی تو جان تھا وہ اس کے لئے اس نے جاب چھوڑ دی تھی، وہ اسے خود پالنا چاہتی تھی تین سال بعد مائیکہ پیدا ہوئی تھی، چار سال کی عمر میں میکال کو اسکول داخل کر دیا اور مائیکہ کو ڈے کیئر سینٹر میں چھوڑ کر رمشہ نے جاب دوبارہ جوائن کر لی، کیونکہ اسے بہت اصرار سے واپس بلایا جا رہا تھا، ڈیوڈ نے ڈاکٹر بننے کے بعد ہاسٹل میں جاب کے بجائے سول سروس جوائن کر لی تھی، ساتھ ہی سیاست میں حصہ لینا شروع کر دیا، مضبوط پارٹی سے تعلق کے سبب اسے سہولیات بھی پسند ملنے لگیں، ان دنوں وہ پاکستان میں موجود امریکن سفارتخانے میں اپنے چند ساتھیوں سمیت موجود تھا، انہی دنوں ڈسٹریکٹ اور رمشہ بھی پاکستان آئے ہوئے تھے، امریکن سفیر، ڈسٹریکٹ کے والد کے اچھے دوستوں میں تھے، انہوں نے امریکہ کے یوم آزادی پر ہونے والی تقریب میں ڈسٹریکٹ کو بھی بلایا تھا اور یہیں ڈیوڈ کے شیطانی ذہن میں ایک منصوبہ پرورش پا گیا تھا، اس کا ارادہ تو دونوں بچوں کو ہی اٹھانے کا تھا مگر ساتھ صرف میکال آسکا تھا، اس نے یہ تنظیم پچھلے کچھ سالوں سے انڈیا پاکستان اور بنگلہ دیش میں قائم

کی تھی اور رزلٹ بہت اچھا آیا تھا، وہ کب سے ان ملکوں میں آ جا رہا تھا، ڈسٹریکٹ جیسے مصروف آدمی کے فرائضوں کو بھی اس کی خفیہ سرگرمیوں کی خبر نہیں تھی، میکال کو اپنے پاس لانے کے بعد اس نے اسے اپنی خصوصی نظر میں رکھا تھا، وہ بہت روتا، بڑپتا تھا، ماں باپ کے پاس جانے کے لئے بیقرار، وہ جیسے جیسے روتا، ڈیوڈ کے اندر سکون اترتا جاتا، یوں لگتا جیسے ڈسٹریکٹ رو رہا ہو، پھر رفتہ رفتہ اسے یقین ہوتا گیا کہ وہ اب کہیں نہیں جا پائے گا تو وہ خاموش ہوتا چلا گیا، اس نے گھر پر نیوٹرلگوا کر اس کی تیاری کردائی اور انگریزیم دلوا کر اسے اگلی کلاس میں کروا دیا۔

کچھ عرصے بعد اسے باقاعدہ اسکول میں داخل کر دیا گیا، بڑا ہونے پر ڈیوڈ نے اسے وہ بنادیا جو ڈسٹریکٹ کے لئے ایک تازیانہ تھا، جس نے خود اتنی صاف ستھری زندگی گزار دی، اس کا بیٹا ہر برائی میں ملوث تھا، حالانکہ دیگر لڑکے لڑکیوں کے مقابلے میں اسے میکال نے ہی سب سے زیادہ تنگ کیا تھا، جب بھی اس کی شادی کردائی جاتی، وہ کتنے کتنے دن کے لئے کم ہو جایا کرتا تھا، ایک بار تو اس نے ایک لڑکی کو چھو انک نہیں، ڈیوڈ نے اسے سخت سزا دینے کا حکم دیا، اسے علم تھا کہ ایک بار اسے یوں چھوڑ دیا تو وہ ہمیشہ یہی کرے گا، سو اسے کوڑا مارا۔ چیلنج کیا تھا، جب ڈیوڈ اس سے ملنے کے لئے آیا تو وہ داندھے منہ کا ڈوچ پر لیٹا ہوا تھا، اس کی پشت پر لمبے لمبے زخم تھے، وہ اب کئی دن تک سیدھا نہیں لیٹ سکتا تھا۔

”اوہ لولی بوائے، کیا بات ہے؟ کیا لڑکی پسند نہیں آئی تھی؟“ اس نے جواب دینے کی بجائے منہ پھیر لیا تھا، ڈیوڈ کے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔

”اب تمہارے دماغ میں یہ بات اچھی

طرح فیڈ ہو گئی ہوگی کہ آئندہ کوئی سی ڈی خالی نہ آئے، ہم اتنے اخراجات کے بعد بھی اس طرح لڑکیاں چھوڑنے لگے تو خود تو کما جئے، اب جلد از جلد ٹھیک ہو جاؤ، ایک بڑی ہستی تمہارے ساتھ کچھ وقت گزارنا چاہتی ہے۔“ وہ پھر بھی نہیں بولا تھا، مگر آئندہ کے لئے سمجھ گیا تھا کہ وہ ان کے کہے پر عمل کیے بغیر نہیں چل سکتا، پھر یونیورسٹی کی جاب کے دوران اس نے از خود اپنی شادی کے لئے اجازت لی، اپنی ایک اسٹوڈنٹ سے شادی کی اجازت، پہلی بار ڈیوڈ نے اس کی آنکھوں میں وہ انوکھی چمک دیکھی، کوئی اور ہی جذبہ تھا ان میں، وہ بہت زبردست انسان تھا اسے شادی کی اجازت دی تو مشکل سے مگر دی اپنی شرائط پر، یہ اور بات کہ وہ اکثر بہت ڈسٹرب نظر آتا تھا، پر یہ ڈیوڈ کا سرور نہیں تھا، پھر ایک لڑکی اس کا بچہ لئے چلی آئی، بنا بتایا میکال، بابا، ڈیوڈ نے بلند قبضہ لگایا ورنہ کچھ عرصہ پہلے جب اسے پتہ چلا کہ میکال کو اس کے والدین مل گئے ہیں اور یہ کہ وہ فارین کے رشتے دار ہیں یہ ایک ڈیزاسٹر تھا، حقیقی تباہی، کیونکہ ڈیوڈ ڈسٹریکٹ کو اور اس کی اپروچ کو اچھی طرح جانتا تھا پر یہ بچہ اس نے تو ڈیوڈ کے سینے میں خنڈ ڈال دی تھی۔

”یہ تو تمہاری فونو کاپی ہے صرف ٹریننگ رہیٹ کرنی پڑے گی۔“

”بھئی نہیں، میں اسے یہاں نہیں رہنے دوں گا۔“ میکال نے سختی سے انکار کیا تھا۔

”اوہ تو تمہاری مسز رکھ لے گی اسے؟“ اس نے طنز پر پوچھا۔

”ہاں اگر وہ مجھ سے محبت کرتی ہے تو۔“

اس کے اظہار پر ڈیوڈ کی مسکراہٹ کشادہ ہوئی تھی۔

”چلو تمہوڑا امتحان لینے ہیں اس کی محبت



کا۔“ میکال کے چہرے کا رنگ تبدیل ہو گیا مگر حسب عادت وہ خاموش رہا تھا، پھر واقعی وہ اسے رکھنے میں کامیاب رہا تھا، ڈیوڈ اسے آرام سے کہاں رہنے دے سکتا تھا، اس نے اسے مجبور کرنا شروع کر دیا کہ وہ شوئیل کو اس کے حوالے کر دے، اس کی سختی سے کئے گئے انکار پر اس نے فارین کو میکال کی تصویریں اور ویڈیوز بھیج دی تھیں اور اس بار نتیجہ حسب توقع نکلا، فارین گھر چھوڑ کر چلی گئی، نوٹے اور بارے ہوئے میکال کو دیکھ کر ڈیوڈ نے تہنید لگا دی تھا۔

”اب کہاں گئی اس کی محبت، اب کہاں گیا وہ محبت و قربان کا دعویٰ۔“ میکال کیا جواب دیتا، اسے خود یقین نہیں آ رہا تھا کہ فارین اسے چھوڑ گئی ہے، جو اس سے اتنی محبت کرتی تھی کہ اندر کہیں اسے یہ یقین تھا کہ وہ اسے ہرگز نہیں چھوڑے گی چاہے اسے میکال سے متعلق ساری حقیقت پتا چل جائے، مگر یہ مان تو بری طرح ٹوٹ گیا تھا اور شاید وہ خود بھی ٹوٹ چھوٹ گیا تھا، پہلے تو وہ جینے کی امنگ تھی بھی تو اس لئے کہ ماں باپ سے ملنے کی خواہش بہت زوردار تھی، پھر فارین اور شامین نے زندگی سے لگاؤ پیدا کیا پھر ماں باپ بھی مل گئے، تو کچھ عرصے کے لئے وہ اس مکروہ زندگی کو بھول کر خوش رہنے لگا تھا کہ اسے بڑے بڑے طریقے سے باور کروایا گیا کہ وہ اپنی مرضی سے زندگی نہیں بسر سکتا اس کے لئے بھی ان کی رضامندی ضروری ہے، اس نے دکھ سے جلتی سانس سینے سے خارج کی تھی۔

”میکال میکال۔“ رمشہ اسے پکار رہی تھیں، وہ چونک کر حال میں واپس آیا۔  
”کہاں کھوئے ہوئے تھے؟“  
”یونہی بس، وہ ماں، شامین تو ٹھیک تھی نا؟“  
اس نے بہت آہستگی سے جھجکتے ہوئے پوچھا تھا،

رمشہ کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آئی تھی۔  
”ہاں بہت یاد کر رہی تھی جہیں اور شوئیل کو بھی۔“ کچھ دیر کے لئے خاموشی چھا گئی۔  
”فارین کا نہیں پوچھو گے؟“ ان کے

اچانک سوال پر وہ جو انہیں ہی دیکھ رہا تھا ایک دم نظریں چرا کر دوسری طرف دیکھنے لگا۔  
”اس سے ناراض ہو تم؟ اسے اگر دیکھ لو تو

ساری ناراضی ختم ہو جائے گی، کھاتی بچتی وہ نہیں، سوتی وہ نہیں، اپنی کمزور اور بیمار سی، اوپر سے پریکسی، اس کی تو حالت ہی خراب ہے، ہاسم اور شائستہ بہت پریشان ہیں، بہت زیادہ ہمارے سامنے کچھ نہیں کہا، بس شائستہ نے یہ ریکوسٹ کی کہ میری تو سختی نہیں ہے آپ اسے زبردستی کھانے کے لئے کہیں۔“

”تو کہا آپ نے؟“ اس کے بے ساختہ پوچھنے پر ایک بے اختیار مسکراہٹ نے ان کے پورے چہرے کو روشن کر دیا تھا۔

”ہاں، کھانا کھلایا تھا میں نے، سب ٹھیک ہو جائے گا، انشاء اللہ، شامین کی دفعہ بھی اس کی یہی کنڈیشن تھی۔“ وہ آہستہ سے بولا۔

”ہاں، ہو جاتا ہے ایسا، میں نے اسے دوا نہیں بھی دی ہیں، اصل میں تو وہ میٹلی ڈسٹرب ہے خیر وہ تم سے بہت محبت کرتی ہے بلاشبہ اور جب اسے حقیقت پتا چلی گی تو یقیناً وہ اپنا دل بھی صاف کر لے گی، بہت مشکل ہے کسی بھی عورت کے لئے یہ سب برداشت کرنا مگر محبت سب کو دلائی ہے، پھر یہ جو ننھے ننھے بھول اس آگن میں کھل رہے ہیں، وہ اللہ کی تم سے محبت کا اظہار ہیں۔“

”شاید۔“ وہ مبہم سے لہجے میں کہہ کر چپ ہو گیا۔  
”یہ تمہارے اور فارین کے لئے بھی ایک

پل کا کردار ادا کریں گے، اللہ تعالیٰ کو بھی تم دونوں کا ساتھ منظور ہے جو پہلے شامین اور اب یہ جو آنے والا ہے، یہ بھی تم دونوں کو الگ نہیں ہونے دیں گے۔“

”وہ یہ سب بھول پائے گی؟ کیا یہ ممکن ہے؟“ اس کی آواز بہت دھیمی تھی۔

”ہاں کیونکہ اسے یہ یقین آ جانا چاہیے کہ اس میں جہاری مرضی کہیں نہیں تھی، یہ سب زبردستی کے سودے تھے اور فارین سے تمہارا تعلق جہاری دلی خواہش پر جڑا ہے اور یہ یقین اسے تم دلاؤ گے۔“ انہوں نے اسے حکمیہ انداز میں گائیڈ لائن دی تھی، انتہہ کیا تھا کہ بس اس سے آگے فارین سے اور کچھ نہیں کہنا۔

”سچ بھی تو یہی ہے نا ماں۔“ اس نے سر صونے کی بیک پر رکھ کر آنکھیں موند لیں، رمشہ نے محبت سے اس کا سر سہلایا۔

”تو یقین رکھو کہ حق کی ہو گی انشاء اللہ۔“

☆☆☆

دانیال نے تو سچ سچ طوفان مچا دیا تھا، انہوں نے میکال کو اپنے پاکستانی دوست بریگیڈئیر اکرام اللہ غوری، جن سے ان کی دوستی یوں ہوئی کہ بریگیڈئیر صاحب امریکہ ان کے پاس بغرض علاج جاتے تھے، ہوتے ہوتے دونوں میں دوستی ہو گئی انہوں نے ان سے وعدہ لیا تھا کہ ان کا بیٹا پوری حفاظت میں رکھا جائے گا اور بریگیڈئیر غوری نے انہیں بے فکر ہونے کی ہدایت کی اور میکال دسواچھ لے گئے تھے، خود دانیال امریکہ چلے گئے، ان کے بھائی ان کے والد کے دوست، سب لوگ جنہیں پہلے تو ڈیوڈ کی ان سرگرمیوں کا یقین ہی نہیں آ رہا تھا، اپنی اپنی Resources استعمال کر کے کئی مشکل سے

ڈیوڈ پر ہاتھ ڈالنے میں کامیاب ہوئے تھے، وہی جانتے تھے پھر میکال کی نشاندہی پر پاکستان میں موجود سارے سیٹ اپ پر ہاتھ ڈالا گیا تھا، دانیال اس سے ملنے کے لئے جیل گئے تھے۔

”نکتنے دن تم مجھے اندر رکھ پاؤ گے؟“ وہ انہیں دیکھ کر پھنکا رہا تھا۔

”ہمیشہ کے لئے، اب بے فکر ہو جاؤ کہ تم یہاں سے نکلو گے، تم مجھے صرف یہ بتاؤ، تم نے میرے بیٹے کو کیوں اغوا کیا تھا؟“

”اوہ، ابھی تک یہی سوچ رہے ہو تم، اپنے بیٹے کا اعلیٰ کردار دیکھ کر بھی تم نہیں سمجھ پائے، کہ میں نے اسے کیا بنا دیا تھا، تم تو ایک نیک مسلمان ہو نا، تمہارا بیٹا بھی دیکھ لو مسلمان ہی ہے، میں چاہتا تو اسے کرجن بنا سکتا تھا لیکن مسلمان ہو کر اس نے جو کارنامے کئے ہیں، ان کا مزہ الفاظ میں بیان نہیں کیا جاسکتا، کیسا لگا تمہیں اپنا میکال۔“ اس کے استہزاء سے لہجے پر انہوں نے بڑی مشکل سے خود کو کنٹرول کیا تھا۔

”بہت اچھا، میری تو اولاد ہے اگر وہ سچ سچ اپنی مرضی سے بھی بگڑا ہوتا تب بھی میرا فرض تھا کہ اسے صراطِ مستقیم کی طرف لانا، تم نے تو زبردستی اسے گمراہی کی طرف بھیجا، اس کی تو کہیں مرضی نہیں تھی مگر تم اسے بھی چھوڑو، مجھے یہ بتاؤ تم نے میکال کے ساتھ یہ سب کیوں کیا؟“

”تم نے پہلے بھی یہ پوچھا ہے، اور میرے جواب سے تمہیں اندازہ ہو جانا چاہیے تھا، کہ صرف تم سے انتقام لینے کے لئے تم نے مسلم بن کھارے لئے ایک عذاب کھڑا کر دیا تھا ہمارا خاندان ہش خاندان تھا، عام کرجن خاندان نہیں تھا، ہم دوسروں کو کیا تبلیغ کرتے جب ہمارا اپنا ایک فرد ہمارے سچے مذہب کو چھوڑ کر ایک دوسرے مذہب کو اپنالے، تو ہماری کریڈیٹ

کیسے اور کتنی متاثر ہوئی ہوگی تم اندازہ کر سکتے ہو۔“

”یہ صرف تمہاری ذہنیت ہے ورنہ میرے باپ اور بھائیوں نے تو کہیں اتنے سخت اعتراض نہیں کئے اور میں مسلم ہو کر بہت خوش ہوں مجھے کبھی کہیں کوئی پچھتاوا نہیں ہوا جنہیں اتنی تکلیف کیوں ہوگی۔“

”کیونکہ میں ایک سچا عیسائی ہوں۔“  
”تو تم اپنے مذہب پر قائم رہو اور دوسروں کو ان کے مذہبی معاملات میں آزاد چھوڑ دو، تم کون ہوتے ہو کسی کو کسی کے کئے کی سزا دینے والے۔“ دانیال کا لہجہ بھی تلخ ہو گیا۔

”اب کچھ بھی کہتے رہو، اپنے دل میں ٹھنڈ ڈالتے رہو، وہاں پاکستان میں تمہیں قدم قدم پر میکال کی جاننے والیاں مل جائیں گی، اس کی پوی بھی اس طرح اس کے ساتھ نہیں رہ پائے گی، پھر دیکھتا ہوں تم کیسے ان معاملات کو سدھارو گے، کیا کر دے گے، اس کے لئے؟“  
دانیال کو سچ کچ خون کے ٹھونٹ پینے پڑے تھے۔

☆☆☆

دانیال واپس آئے تو ان کے ساتھ میکال بھی تھا، وہ ہاشم اور شائستہ سے بات کر چکے تھے صرف فارین سے بات کرنا پائی تھا انہوں نے تنہائی میں اسے ٹوب سے باندھ لیا، اس کی دی اور میکال کے اس کے ساتھ ہر طرح سے وفادار رہنے کا یقین دلایا تھا، اتنے عرصے میں رمش بھی اس کی برین واشنگ کرتی رہیں تھیں سو اس کا رویہ نارمل تھا، رات کے کھانے کے بعد دانیال اور رمش میکال فارین، شموئیل اور شامین کے ساتھ، میکال کے گھر یا دوسرے معنوں میں اپنے گھر آ گئے تھے، رات کو سب کے سو جانے کے بعد میکال فارین کے پاس بیٹھا۔

”کیسی ہو؟“ فارین نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا، ویسا ہی خوبصورت بے داغ چہرہ، خنجر لگا ہوں سے اسے دیکھتا۔  
”ٹھیک ہوں۔“  
”ابھی بھی ناراض ہو؟“  
”نہیں۔“ خنجر جواب، وہ ہلکا سا مسکرایا۔  
”محبت کرتی تھیں تو اعتبار بھی تو کرتیں نا، سب دکھ لینے کے بعد مجھ سے تو کچھ پوچھیں تم نے تو یہ بھی نہیں پوچھا کہ اگر میں اتنا برا تھا اتنی عورتیں مجھے میسر تھیں تو میں نے تم سے شادی کیوں کی؟“

”وہ تو میں نے کہا تھا نا آپ سے، پہلے تو آپ نے منع کر دیا تھا۔“  
”ہوں تو یہ گلہ ابھی تک ہے تمہارے دل میں، اچھا چلو یہ تو سوچو کہ پھر کیوں کی، تمہاری محبت میں نا، میں تو خود تمہارا اسیر ہو گیا تھا یقین مانو جب وہ بلیک میلنگ اسٹف تیار کر کے مجھے دھکیلا جا رہا تھا، مجھے کوئی ڈر نہیں لگا، مجھے تم پر اتنا یقین تھا، کہ تم مجھے نہیں چھوڑ سکتیں، تمہاری محبت ان تمام باتوں سے ماورا ہے، میں باہر رہتا، تمہارا کسی قسم کا خیال بھی نہیں رکھتا تھا، مگر تمہارے لبوں پر کبھی کوئی شکوہ نہیں آیا تو میرے اندر کہیں نہ کہیں احساس ضرور موجود تھا کہ تمہیں میرے متعلق چاہے کچھ بتایا جائے، یا کچھ دکھایا جائے لیکن تم تو یوں مجھے چھوڑ آئیں تو کہ میرے اندر سے ساری امیدیں بھی ختم ہو گئیں، میں جوان کے آگے ڈٹ کر کھڑا ہو چکا تھا، ایک دم کمزور پڑنے لگا، یہ تو پاپا آگئے تو انہوں نے سب معاملات اپنے ہاتھ میں لے گئے ورنہ وہ مجھے کب کا مار کر شموئیل کو اپنے قبضے میں لے چکے ہوتے۔“ فارین نے دہل کر اسے دیکھا، وہ ہلکا سا مسکرایا۔

”تمہارا کیا خیال ہے وہ مجھے چھوڑ دیتے،

میں نے ان سے بغاوت کی تھی، اس کی کم سے کم سزا بھی موت ہے، اپنی دے اب ان کا سارا سیٹ اپ ختم ہو چکا ہے، لیکن تمہارے دل میں ہو سکتا ہے میرے لئے ابھی تک کوئی دوسرے ہوں تو پلیز اپنا دل صاف کر لو، میں نے پہلے بھی کبھی خوشی سے وہ سب نہیں کیا تھا اب تو ہر وقت اللہ تعالیٰ سے معافی کا طلبگار رہتا ہوں کہ وہ مجھے میرے سارے گناہوں کے لئے معاف کر دے، دانستہ نادانستہ مجھ سے جو غلطیاں ہوئیں سب کے لئے معافی مانگتا رہتا ہوں، پہلے میں نماز بھی نہیں پڑھتا تھا کہ میں تو اتنا آلودہ، اتنا گناہ گار ہوں تو میں کیسے اس کی بارگاہ میں کھڑا ہو سکتا ہوں لیکن اب میں باقاعدگی سے نماز پڑھتا ہوں، میرا جسم کتنا ہی ناپاک رہا ہو لیکن میری دعا ہے کہ میری روح ایک پاکیزہ روح کہلائے، پاکیزہ روحوں کے ساتھ رہی جائے۔“

چاہتا ہوں میں میرے اس عمر کے انجام پر ایک ایسی زندگی جو اس طرح مشکل نہ ہو فارین نے حیرت سے اسے دیکھا، میکال اور شعر، وہ ہنس پڑا۔

”سب سیکھ لیا تمہاری فرقت میں، تمہیں کیا لگتا ہے محبت صرف تم ہی کر سکتی ہو، ماما سے پوچھنا میرا حال بخون کو پیچھے چھوڑ دیا تھا۔“  
”بتایا تھا پھپھو نے۔“ وہ آہستہ سے بولی تھی۔

”تب بھی تم نہیں آئیں؟“ میکال نے افسوس سے کہا۔

”تب آپ یہاں تھے ہی نہیں۔“ وہ اتنی معصومیت سے بولی کہ میکال کو ہنسی آ گئی۔  
”تم نے مجھے یوں نہیں بتایا۔“  
”کیا، کیا نہیں بتایا؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”بھئی مجھے تو بتایا گیا تھا کہ کوئی خوشخبری ہے؟“ اس کے ہونٹوں پر پھیلی شریر مسکراہٹ دیکھ کر فارین جھینپ گئی تھی۔

”پتا ہی وہاں جا کر لگا تھا تو کیسے بتاتی۔“  
”پاپا نے شکرانے کے لئے عمرے کا پروگرام بنایا ہے، اب تم تو نہیں جا سکتیں، میں اور پاپا ہی جائیں گے، پھر انشاء اللہ حج کے لئے تم اور میں دونوں اچھائی کریں گے ٹھیک ہے۔“ فارین نے خوشگوار حیرت سے اسے دیکھا تھا وہ حج کچ کتنا بدل گیا تھا۔

”مجھ سے ایک وعدہ کرو فارین، تم شموئیل کا بھی اسی طرح خیال رکھو گی جیسے اپنے دونوں بچوں کا، وہ ایک مظلوم بچہ ہے، وہ میرے کسی عشق کا نتیجہ نہیں ہے کہ تم اس سے کوئی جیسی محسوس کرو، میں تمہارے وسیع ظرف سے یہ ایک جھوٹی سی توقع رکھتا ہوں۔“ فارین نے جواب میں کچھ کہنے کی بجائے میکال کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا تھا، میکال نے مسکرا کر اسے اپنے ساتھ لگا لیا، آزمائش کے دن ختم ہوئے تو ہر سو کھلے اور سکون کی ہوا جلنے لگی تھی، اب زندگی بہت آسان تھی، اس نے شکر سے پہلے اوپر دیکھا اور پھر فارین کو اور سکون کا سانس لیتا مسکرا دیا۔

☆☆☆

پینتیسویں قسط کا خلاصہ

نیل بر جہاندار سے گلائی سے ملاقات کا ذکر کرتی ہے تو وہ چونک کر سوچتا ہے کہ یہ بھولی سری کہانی کا کردار نیل بر سے کہا آکر آیا۔  
ساہوکار خان مورے سے ملنے آتا ہے تو عروذ کو بے حد برا لگتا ہے وہ عشیہ سے الجھ پڑتی ہے، ادھر ولید نشرہ سے انتقام لینے کے لئے عروذ کو اپنی بھولی محبت کے جال میں پھنسا لیتا ہے۔

صندیر خان کا خاص بندہ اسے بتاتا ہے کہ جہاندار اصل میں کون ہے، صندیر خان سب جان کر سنانے میں رہ جاتے ہیں۔

اس کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ شاہوں کی حویلی کا کوئی کم شدہ کردار یوں سامنے آ جائے گا، کردار بھی وہ جو اپنے دامن میں انتقام اور تباہی لے کر آئے گا۔

امام کے آپریشن کی کامیابی پر پلوٹہ پورے خاندان کو دعوت پر بلاتی ہے، امام جب ڈاکٹر کے کہنے کے مطابق صبح سویرے داک کے لئے آیا تو شانزے سے ٹکراؤ ہو گیا جو اسے یوں داک کرتے دیکھ کر حیران رہ گئی۔

چھتیسویں قسط

آپ آپ آگے پڑھیے



فارم ہاؤس میں ساخانہ کے لئے ایک عجیب انگیز سربراہ تھا۔ اس نے پھولوں کے جھرمٹ میں، عجوبہ جھولے پر بیٹھی اداس آنکھوں والی حمت جیسی ایک لڑکی کو دیکھا اور ٹھنک کر اپنی جگہ پہ ہی ٹنبد ہو گئی تھی۔

اول تو اس نے پھولوں کے پاس بیٹھی لڑکی کو حمت ہی سمجھا تھا، اگر یہ لڑکی شہری لباس نہ پہنے ہوتی تو کسی طور پر بھی حمت سے مختلف نہیں تھی۔

دوبارہ یہ ناک و نقشب، ویسا ہی دل سوز حسن، ویسی ہی چہرے پہ چھائی شکستگی، یہ تو کوئی حمت کا دوسرا روپ تھی، یا پھر حمت کا ہی کوئی اور عکس، یا حمت کی ذات سے نکلا ہوا ایک اور بت، ساخانہ پہ تو سکتہ طاری ہو گیا تھا، وہ تو دوسرے ہی لمحے حمت کے بیاٹھے تھی۔

”یہ لڑکی کون ہے حمت؟“ ساخانہ کے لہجے میں تجسس تھا، وہ کسی بھی صورت اس لڑکی کے بارے میں معلومات جاننے کے لئے یہ بے تاب نظر آ رہی تھی، حمت چونکہ پہلے ہی ذہنی طور پر تیار تھی، اس لئے گھبرائے بنا ہی بولی۔

”لالہ کی مہمان ہے۔“

”مگر یہ تو تمہارے جیسی ہے۔“ ساخانہ نے بے چینی کو دبانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا تھا۔

”تو کیا فرق پڑتا ہے؟ اس دنیا میں کئی انسانوں کی شکلیں آپس میں ملتی ہیں۔“ اس کا انداز لا پرواہ قسم کا تھا، سادہ اور بے نیاز سا۔

”یہ کہاں سے آئی ہے؟“ ایک اور جھپٹتا ہوا سوال۔

”میرا خیال ہے، مریخ سے تو نہیں آئی۔“ حمت نے قہقہے سے ہی جواب دیا تھا۔

”ٹھیک بتاؤ نا، لالہ نے اسے کہاں سے دریافت کیا؟“

”لالہ کے جاننے والوں میں سے ہے، اس سے آگے لالہ نے کچھ نہیں بتایا، تم بھی زیادہ تجسس میں نہ پڑو، یہ نہ ہو، لالہ تمہیں واپس ہی سمجھا دیں۔“ حمت نے سمجھاتے ہوئے ایسے تنبیہ کی تھی، ساخانہ کی قہقہے میں بات سامتی تھی، حمت سے دور اس بوکل کی قید اسے کہاں گوارا تھی، واپس جانے کے خیال پہ ہی وہ بہم لگتی تھی۔

”اور یہ بھی یاد رکھنا، تمہارا یہاں آنا میری مرضی اور خوشی کے لئے تھا، لالہ کی رضا مندی شامل نہیں تھی، اس لئے لالہ کے اعتماد کو تمہیں نہیں کچھنی چاہیے۔“ اس نے دبے لفظوں میں اسے ہاور بھی کروادیا تھا، ساخانہ نے فوراً اثبات میں سر ہلایا۔

”میں کون سا لالہ کے سامنے ایسی کوئی جرأت کروں گی، صرف تم سے بات کر رہی ہوں، لالہ سے اپنا دم نکلو نا ہے کچھ پوچھ کر۔“ ساخانہ نے کالوں کو ہاتھ لگائے تھے، لیکن انسانی فطرت سے مجبور ہو کر اس کا ہاتھ ہولے سے دباتے ہوئے بولی تھی۔

”پر تم سے تو بات کر سکتی ہوں نا، شہری لڑکی تو میرا دماغ گھما ڈالا، اسے یہ لہسا سانبو جو تم نے خود پر لپیٹا ہوا ہے پہنا دوں تو وہ لڑکی بالکل تمہاری کاربن کاپی بن جائے۔“

”ساخانہ!“ حمت نے جیسے زچ ہو کر تنبیہ کی تھی۔

”مجھے اپنے فیصلے پہ پچھتا نا پڑے۔“ وہ صاف لفظوں میں وارننگ دے رہی تھی، ساخانہ نے ہاتھ باندھ کر ادب سے سر جھکا دیا تھا۔

”او میری ماں، ٹھیک ہے، کچھ نہیں پوچھتی، بس اتنا بتا دو، یہ لڑکی یہاں کب تک ہے؟“

ساخانہ کے منصوبہ ماند انداز پر حمت کچھ بولنے کے لئے سوچ ہی رہی تھی، جب پیچھے سے ایک ٹھہرنی ہوئی آواز سنائی دی تھی، وہ دونوں اچھل ہی پڑیں، کوئی تو تھا جو ان کی تنہائی میں ٹھل ہو گیا تھا۔

”یہ تو کوئی نہیں جانتا، میں یہاں کب تک ہوں، شاید تقدیر نے میرے ذریعے کوئی راز کھلو نا ہے، میں ایسے ہی تو بے مقصد ایک مفرد انسان کی قید میں نہیں پڑی، میرا یہاں آنا بے معنی نہیں، میرا یہاں قیام بے مقصد نہیں، شاید اس کے پیچھے کوئی بڑی وجہ ہو۔“ وہ جھوٹے جھوٹے قدم اٹھاتی ان دونوں کے قریب آ چکی تھی، پھر ان دونوں کی حیران صورتوں کو دیکھ کر پچھلے انداز میں مسکرائی۔

”اس دنیا میں بہت سے چہرے ایک جیسے ہوتے ہیں، اتفاقاً بہت سارے لوگوں کے نقوش بھی مل جاتے ہیں، مگر ایسی انسیت، کسی اتفاق سے دلوں میں نمودار نہیں ہوتی، آج سے میں انجی مہمان نہیں، آپ دونوں کی کوئی گم شدہ کلون ہوں، آپ دونوں کا کھویا ہوا کوئی تیسرا حصہ، آج سے ہم فرینڈز ہیں، بولو فرینڈز۔“ اس نے اپنا ٹھل ہاتھ ان کے سامنے پھیلا دیا تھا، جسے ان دونوں نے خوشگوار جبرائلی کے ساتھ تمام لیا۔

کوئے کس قدر خوبصورت بولتی تھی، اس کی دکھائی، غصہ اور عجیب سی بیزاری آج مفقود تھی، شاید اس نے صندیر خان کی قید سے سمجھوتہ کر لیا تھا، جو بھی تھا، آج کے خوبصورت پل میں ان دونوں نے اپنے وجود کے تیسرے حصے کو پالیا تھا، ان تینوں کی ٹھنک آج مکمل تھی۔

☆☆☆

اس انشتی ہوئی شورش سے بہت جلد صندیر خان کو اپنی گرتی ساکھ کا اندازہ ہو گیا تھا، اس کے لئے یہ ساری صورتحال تشویش ناک تھی، وہ شدید ذہنی دباؤ کا شکار سردار بنو کے سامنے آ کر پھٹ پڑا تھا۔

”سالوں پہلے جو آپ نے کانٹے بوئے تھے، ان کی کنٹائی کا وقت آ گیا ہے، کانٹوں کی فصل سے مزید نوکیلے اور خطرناک کانٹے نمودار ہو چکے ہیں، خود تو کسی نا کاردہ پرزے کی طرح گوشہ نشین ہو چکے ہیں آپ، مجھے بتائیں میں کیسے ان بڑے حالات کو قابو کروں؟“ وہ شدید غصے اور ذہنی دباؤ میں تھا۔

جہاندار کا زندہ رہنا ہی اس کے لئے بہت بڑا انکشاف تھا، کچا کہ اس کا واپس ملک کی حویلی میں آ کر اسے آباد کرنا، جہاندار کی واپسی کوئی عام واپسی نہیں تھی، اس کا آنا تباہی تھا، ایک طوفان تھا، تاریخ کا سب سے بڑا انتقام تھا۔

”کیا بات کرتے ہو خانان، ایک سردار ہو کر مشکل وقت سے گھبراتے ہو۔“ سردار بنو نے پریشانی کے عالم میں اس کا غصے سے لال انکارہ چہرہ دیکھا تھا۔

”مشکل وقت سے نہیں، برے وقت سے پریشان ہوں، وہ برا وقت جو آپ کے غلط فیصلوں کی بدولت ہمارے سروں پہ تلوار کی مانند لٹک رہا ہے۔“ وہ غصے سے بیٹھی آواز میں غرایا تھا۔

”کون سا غلط فیصلہ؟“ سردار کا بھی ازلی غصہ اور رجوت عود آئی تھی، اپنے فیصلوں کو غلط قرار دیا جاتا تو معتدل سردار کو کبھی قیمت پہ بھی گوارا نہیں تھا۔

”ودھا اور فرخزاد کے لک کا۔“ وہ شدید غصے سے بولا تھا۔

”خانم کو طلاق دینے کا۔“ اس نے سردار کی پہلی بیوی کا نام لیا تھا، سردار کا رنگ پہلی مرتبہ زردی مائل سفید پڑ گیا تھا۔

”شاہوں کی حویلی برباد کرنے کا فیصلہ۔“ پھر وہ بھینچی آواز میں چینچا تھا۔

”اور اگر خانہ ہی کرنا تھا تو مکمل طور پر کرتے، سانپ کا بچہ کیوں چھوڑ دیا۔“

”تم کس کی بات کر رہے ہو؟“ سردار کا چونکا دماغ تھا، وہ تعجب سے جیسے کالال انگارہ چہرہ دیکھتا رہا۔

”میں جہاندار فرید سے شاہ کی بات کر رہا ہوں، آپ کا معتد خاص، اکلوتا داماد، جہاندار فرید سے شاہ جس نے ہماری ہی چالوں کو ہمارے اوپر الٹ دیا ہے، اب ہماری شرمگ کے اوپر اس کا پاؤں ہے۔“ وہ غصے میں پھنکار رہا تھا، مگر اس غصے میں ہلکی بے بسی بھی تھی، کہ کیسے ان کی زیرک نگاہوں نے دھوکہ کھالیا، کیسے وہ جہاندار کو پہچان نہیں سکے، کیسے ان کے ہاتھوں بیوقوف بن گئے، کیسے اپنے بازو اپنے ہاتھ سے کاٹ کر جہاندار کے حوالے کر دیئے، اسے وہ کہہ کر نیل برکا خیال آ رہا تھا، وہ نیل بر جوکل تک قصہ پارینہ بن چکی تھی، آج پھر اس حویلی کا اہم کردار بن رہی تھی۔

”جہاندار؟“ سردار کے حواس اڑ گئے تھے۔

”جہاندار شاہوں کی حویلی کا آخری چراغ، یہ کیسے لوٹ آیا؟“

”اس کی واپسی اتفاقاً نہیں، وہ پوری مصنوعہ سازی سے آیا ہے، اب انتظار کیجئے اس کی طرف سے پہلے وار کا۔“ صندیر خان نے زہر خند لہجے میں کہا تھا۔

”بہت سمجھا تھا آپ کو، یہ بندہ پراسرار ہے، اس کے معاملے میں لا پرواہی نہ برتیں۔“

اب وہ سارا طلبہ سردار سے ڈال رہا تھا، سردار کی ازلی رجوت اور غصہ اٹھ آیا۔

”نیل کو دشمنوں کے چنگل میں تم نے دھکیلا ہے، اگر تمہیں جہاندار پہ شک تھا تو تم نے نیل بر کی زندگی سے کیوں کھیل کھیلایا؟“ سردار کے رعشہ زدہ ہاتھ کا پھٹنے لگے تھے۔

”کم از کم اس وقت جہاندار سے بہتر کوئی اور آپشن تھا آپ کے پاس؟“ پہلی مرتبہ وہ کچھ مدہم پڑا تھا۔

”اب اس صورت حال سے کیسے نمٹنا ہے، کیا ایک دوسرے کو الزام دینے سے بہتر یہ نہیں، کوئی ایگا لائحہ عمل سوچو۔“ سردار نے پریشانی کے عالم میں اپنے کپڑی زدہ بالوں میں انگلیاں پھیری تھیں، گوکہ اسٹیٹ اور سیاست سے بالکل الگ ہو چکا تھا، مگر یہ ایسی پریشانی تھی جس نے اس کی راتوں کی نیند اڑا کر رکھ دی تھی۔

نیل بر کا دشمنوں کی حویلی میں ہونا ہی ان کے لئے بہت بڑا طمانچہ تھا، سرداروں کی غیرت پہ تازیانہ تھا، وہ خون بہا میں نہیں گئی تھی، بلکہ اسے پوری مصنوعہ سازی سے ہتھیایا گیا تھا، اس لئے

سرداروں کا غصہ سوانیز سے پہ تھا۔

کوئی دن دیہائے ان کے ساتھ ہاتھ کر گیا تھا اور جاتے جاتے ان کے ہاتھ کاٹ بھی گیا تھا۔

”کچھ سوچو خاناں! یہ معاملہ خون خرابے سے بچا رہے۔“ سردار بہت دیر بعد کچھ بولنے کے قابل ہو سکا تھا، صندیر خان گہرا سانس بھرتا کھڑا ہو گیا۔

”ممکن ہی نہیں کہ یہ معاملہ خون خرابے سے بچا رہے، بہر حال کچھ سوچنا ہوں، چوڑیاں تو پہنی نہیں ہیں۔“

”تو پھر کیا کر دے؟“

”پہلے تو نیل بر کو نکالوں گا وہاں سے، بعد کی بعد میں دیکھیں گے۔“ صندیر خان کا انداز اٹل تھا۔

”اور اس کے بعد کیا وہ خاموش رہے گا؟ شیر بھرا ہوا ہے، اسے ذہانت سے قابو کرو۔“ سردار اب جذباتیت اور غصے میں نہیں، باہوش انداز میں سوچ رہا تھا۔

”نیل بر کا ہمارے دشمنوں کی حویلی میں رہنا، سرداروں کی غیرت پہ تازیانہ ہے، وہ تو مکمل کی بیٹی ہے، ہمارے دشمن کے گھر جانور چلا جائے تو مرٹھنے کا مقام ہے، یہ تو پھر ہماری غیرت ہے۔“

”ہوں۔“ صندیر خان نے ہنکارا بھرا تھا۔

”ہاں خاناں! آپ کو کیا لگتا ہے، وہ خون بہا تو لے گا نہیں، اپنا لوٹا ہوا مال لے گیا جان، اب اندازہ لگا کے بتادیں، وہ قتل کے بدلے میں کتنے قتل کرے گا، اس کے خون ہمارے ذمے ہیں،

شیر شاہ اور فرخزاد شاہ، اس کے دو بھائیوں کا خون آپ کے ہاتھوں پر ہے، بدلے میں وہ کتنی جاتیں لے گا، دو یا چار، اگر دولیں تو میں اور شاہوار اس کی ہاٹ لسٹ پہ ہیں، اس کا پہلا اور اہم نوکس،

اگر وہ سے آگے بڑھا تو آپ کو کبھی نہیں چھوڑے گا اور اگر اس سے بھی آگے بڑھا تو جان لیجئے سردار کبیر بٹ، وہ آپ کے اس تخت جگر کو بھی پارہ پارہ کرے گا، جسے اس کی ماں کے پیٹ میں بھی

آپ نے تسلیم نہیں کیا تھا۔“ صندیر خان کی سنہری ہادی بادی بادی آنکھوں میں معنی خیزی لپک عود رہی تھی، سردار کے رعشہ زدہ ہاتھوں کی کپکپاہٹ بڑھ گئی تھی اور عجیب سا ہراس اس کی گردلی بوڑھی آنکھوں کو دھندلانے لگا تھا۔

اسی پل کسی لومولود کی چیخوں اور رونے کی آواز نے سردار کو ہڑبڑانے پہ مجبور کر دیا تھا، اس کے لبوں سے عالم وحشت میں کچھ بے ربط سا برآمد ہوا تھا۔

”وہ اسے کچھ نہیں کہے گا، اپنی اجڑی بہن کی عمر بھر کی کمائی کو کیسے لوٹے گا؟“

”جیسے آپ نے اس کی عمر بھر کی کمائی کو لوٹا تھا، اس کا گھر برباد کر دیا، حویلی برباد کر دی، اسے جلا وطن کر دیا، اس کی زمینوں پر قبضہ کر لیا، اسے رسوا کر کے بستی سے نکال دیا اس پتھر سے کس رحم

کی امید کرتے ہیں، وہ اجڑی بہن کی عمر بھر کے سرمائے اور کمائی کو نہیں دیکھے گا، وہ آپ کے اکلوتے تخت جگر کو دیکھے گا، جسے آپ تسلیم کریں یا نہ کریں، اس کی رگوں میں آپ کا لہو دوڑ رہا ہے،

وہ آپ کی نسل کا امین ہوگا، پانچ بہنوں کا اکلوتا بھائی اور قانونا آپ کی وراثت کا پہلا حق دار، یہ

حقیقت ہے اس سے نظر کیوں جراتے ہیں؟ وہ آپ کو تکلیف دینے کے لئے کچھ بھی کر سکتا ہے، کچھ بھی، جب وہ سوتیلے بھائیوں کے قتل کا بدلہ لینے کے لئے اپنی جوانی کو داؤ پر لگانے واپس لوٹ آیا ہے تو اس کے نزدیک سوتیلی بہن کا اکلوتا بیٹا کوئی حیثیت نہیں رکھتا، وہ بھی اس صورت میں کہ وہ سردار بنو کا ان چاہا اکلوتا بیٹا ہو۔ اس نے ان چاہے پہ خاص زور دیا تھا اور سردار کو کوئی بھول تو نہیں تھی، انتقام کے چکر میں تو خونی رشتے درندے بن جاتے تھے، بھائی بھائیوں کو مار ڈالتے، بیچھے چچاؤں کا، وہ تو پھر جہاندار کا سوتیلہ بھانجا تھا، وہ اس کے ساتھ سردار بنو کی نفرت میں کیا کچھ کر سکتا تھا؟

”وہ اس کو ہاتھ لگا کر تو دیکھے۔“ غیر اراداً سردار کے منہ سے کچھ غیر متوقع الفاظ نکلے تھے، صندیر خان لہجہ بھر کے لئے ٹھنک گیا تھا اور پھر دوسرے ہی بل استہزائیہ ہنس پڑا۔

”اور ہمیں؟“ اس کا استہزادہ صدمے اور غصے میں ڈھل گیا۔

”ہمارے اندر چاہے کھاشنوف کی ساری گولیاں اتار دے ہم کون سا سردار بنو کی اولاد ہیں، جیتوں اور بیٹوں میں فرق تو ہوتا ہی ہے، جیسے درہا اور نیل بر میں فرق تھا، نیل بر کو اسی جرم کا ارتکاب کرنے کے باوجود بچا لیا گیا اور درہا کو اسی محبت نامی جرم پہ دار پر چڑھا دیا، یہی فرق ہے، اپنی اور برائی اولاد میں۔“ صندیر خان کا تلخ لہجہ آخر میں مدہم پڑ گیا تھا، سردار بنو خفیف سا ہو گیا۔

”تم میری حویلی کا ستون ہو صندیر خان! اس وادی کے سردار ہو، جو تم ہو، وہ کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا، کیا یہ تم ہے کہ تم اس راج پاٹ اور شاہی کے روح رواں ہو اور جو میرے وجود کا ایک حصہ تھا، آج بھی تم شہدہ ہے، پس منظر میں ہے۔“

”چھوڑیں خان بابا! یہ لمبی بحث ہے، حالیہ مسئلے کی طرف آئیں، میں چاہتا ہوں نیل بر کو کسی طریقے سے جہاندار کے چنگل سے نکال لاؤں، اس کے لئے کوئی جامع پلاننگ کی ضرورت ہے، آپ کیا مشورہ دیتے ہیں؟“ صندیر خان نے از خود ہی بات بدلتے ہوئے کہا تھا، سردار نیل بر کے ذکر پہ بے قرار ہو گیا تھا۔

”نیل بر کو واپس لے آؤ خاناں! اپنی زندگی کا چراغ گل ہونے سے پہلے اسے دیکھنا چاہتا ہوں۔“ ان کی آواز میں ایک التجائی، عام حالات میں نیل بر کی واپسی کسی طور ممکن نہ تھی، اب حالات کچھ اور تھے، نیل بر کو کسی بھی بہانے سے واپس لایا جاسکتا تھا۔

”آپ کی زندگی کا چراغ ابھی گل ہونے والا نہیں ہے خاناں! ابھی تو زندگی کی فلم کا ڈراپ سین باقی ہے، ابھی تو انجام باقی ہے۔“ وہ ہلکا سا ان کا شانہ چھپتا کر باہر نکل آیا تھا، اس کا ارادہ لی جاناں کو سلام کرنے کا تھا، مگر اندر آتے غریب خان کو دیکھ کر وہ لہجہ بھر کے لئے ٹھنک گیا تھا۔

☆☆☆

”کہو کیا خبر لائے ہو غریب خان۔“ اس کے رکنے کی وجہ غریب خان تھا، جو بہت گھبرا یا نظر آ رہا تھا، یا شاید کچھ پر جوش تھا، کوئی بری یا اچھی خبر سنانے کے لئے۔

”سردار! وہ عاجزی سے جھک آیا۔

”کہیں تو عرض کروں؟“

”ضرور۔“ اس کا انداز پر سوچ قسم کا تھا۔

”سردار! شاہوار خاناں کے متعلق خبر ہے۔“ غریب خان نے ادب سے جواب دیا تھا۔

”بولو خاناں، کہیں دعوت دلیہ پہ تو نہیں بلا لیا؟“ اچانک صندیر خان کا مزاج خوشگوار ہو گیا تھا۔

”ابھی تو نکاح ہوگا۔“ غریب خان نے بھی سردار کا اچھا موڈ دیکھ کر مسکراتے ہوئے بتایا تھا،

”ہمیں کہاں نواب زادے مدعو کریں گے۔“ اس نے مصنوعی حسرت بھرے لہجے میں کہا تھا۔

”خیر مبارک باد تو ضرور دوں گا، حویلی سے نکلا ہے، دل سے تو نہیں۔“ صندیر خان نے کچھ سوچ کر موبائل نکالا اور ایک نمبر ڈائل کر کے انتظار کرنے لگا، کچھ ہی دیر میں کال رسیو کر لی گئی تھی۔

”خیریت تو ہے، خاکسار کی یاد کیسے آگئی؟“ شاہوار نے کال رسیو کرتے حیرت کا اظہار کیا تھا، صندیر خان کی فون کال واقعی غیر متوقع تھی۔

”تم بھول چکے ہو تو، ہم بھی یاد نہ کریں۔“ صندیر خان نے آہ بھر کے کہا تھا۔

”ہمارے ایسے نصیب کہاں؟“ شاہوار نے گہرا سانس بھرتے ہوئے سنجیدگی سے کہا تھا۔

”تم نئی دنیاؤں کو کچھ کرنے چل پڑے ہو، اپنے بڑوں سے کوئی آخیر و ات ہی لے لو۔“

صندیر خان کا انداز معنی خیز قسم کا تھا۔

”بڑے اپنی بڑائی سے از خود ہی دستبردار ہو چکے ہیں۔“ شاہوار نے طنز پہ کہا تھا۔

”جو تم کر رہے ہو، وہ تو درست ہے، مگر جہاں کر رہے ہو، وہ درست نہیں ہے، سوچا تمہیں آگاہ کر دوں، لی جاناں کی گڈ بک سے تم پہلے ہی نکل چکے ہو، اب تمہارا یہ عمل تابوت میں آخری کیل ثابت ہوگا، ان کی کو اسی کو ٹھکانے کا گناہ کم نہیں تھا، نئی رشتے داری ان کی دشمنوں میں کر رہے ہو، تمہیں یہ بھی پتا تھا، زندگی میں سب سے زیادہ نفرت لی جاناں نے خانم سے کی تھی اور یہ نفرت گزرے وقت کے ساتھ ختم نہیں ہوئی، خانم اور اس کی اولاد آج بھی قابل نفرت ہیں کم از کم زندگی بھر کا فیصلہ تو سوچ سمجھ کر کرتے۔“ صندیر خان جانے کس رو میں تھا، جو ایک دم ہی نرمی سے کہتا چلا گیا، شاید شاہوار سے تعلقات بہتر کرنے کی خواہش تھی، یا پھر جہاندار کے معاملے میں وہ خود کو واقعی گمزدور سمجھ رہا تھا، اسے شاہوار کی کسی برے وقت میں ضرورت محسوس ہوئی تھی، اپنے مطلب کے لئے تو صندیر خان کچھ بھی کر سکتا تھا، پھر یہ تو بھائی ہے صلح کا معاملہ تھا۔

”تم چاہتے کیا ہو؟“ شاہوار نے گہرا سانس بھرتے ہوئے گل سے پوچھا۔

”تجدید تعلق چاہتا ہوں۔“ صندیر خان نے کچھ سوچ کر اپنے دل کی خواہش اس کے گوش گزار کر دی تھی، ابھی وہ جہاندار کے معاملے کی اسے بھنک بھی نہیں پڑنے دینا چاہتا تھا۔

”کس نوعیت کا؟“ اس نے ایک بھول اپکا کر پوچھا تھا۔

”اگر تم چاہتے ہو، میں اپنی خواہش سے قطعاً ہرجاؤں تو یہ ممکن ہی نہیں، میں کسی طور پر بھی پیچھے ہٹنے والا نہیں ہوں۔“

”اگر میں یہ نہ چاہوں تو؟“ صندیر خان اسے ٹریک پہ آتا دیکھ کر پتہ کھلیا ہوا بولا تھا، اسے

جس محل سے ان کو نکالا گیا تھا جس محل کے دروازے ان پر بند کر دیئے گئے تھے، عنقریب اس طلسم کے محل کا وہ دروازہ کھلنے والا تھا، بی جانوں جیسی مغرور اور متکبر عورت کے شاہی راج کا زمانہ ڈھلنے والا تھا۔

☆☆☆

شادی کے ہنگاموں میں تین کنٹھ کے اس مکان میں رونقیں لگادی تھیں۔ ایک ساتھ دو دو خوشیاں اور دو دو فرض کی ادائیگی نے مورے کا موڈ بھی ان دنوں خوشگوار کر رکھا تھا، جب بستی کی لڑکیاں سرشام ڈھولک بجا کر سہاگ کے گیت گاتیں تو مورے کا خوبصورت سفید چہرہ اس پل ستاروں کی طرح روشن ہو جاتا تھا۔

انہی ہنگاموں میں سب سے بڑی خوشخبری ہیام کی منگورہ کے سرکاری ہسپتال میں ٹرانسفر کی خبر تھی اور یہ بالکل غیر متوقع خوشخبری تھی۔

مورے کے پاؤں ہی زمین پر نہ کھتے، صدیوں بعد خواب پورا ہوا تھا، سالوں سے پردیسی ہوا بیٹا لوٹ کر آ رہا تھا، پہلے حصول علم کے لئے اور پھر تلاش معاش نے اسے سالوں سے گھر بدر کر رکھا تھا۔

یہ خوشخبری نشرہ کے دل میں بھی بہت سی امتلیں جگا گئی تھی، ہیام کے قریب رہنے کا احساس ہر احساس پہ بھاری ہونے لگا تھا، دل میں کچھ امیدیں بھی لہروں کی مانند اٹھنے لگی تھیں، ان دنوں گھر میں بہت مصروفیات تھیں۔

ہیام کی بیابنا بنیں بچوں سمیت پہنچ چکی تھیں، گھر میں بھر پور رونق تھی اور اس رونق میں تب اضافہ ہوا تھا جب ایک شب مورے کے بے حد اصرار پر افراسیاب خان ایک دہلی پتلی سوز سے بھری آنکھوں والی لڑکی کو اپنے ساتھ لے آیا تھا۔

نشرہ نے اب تک اتنا اچھا استقبال کسی لڑکی کا نہ دیکھا تھا، جتنا اچھا استقبال اس مہمان لڑکی کا مورے نے کیا، بلکہ پورا گھرانہ نظر آیا تھا اور تو اور انتہائی تک چڑھی عروذہ بھی اپنی کچار سے باہر آنکلی تھی، یوں لگ رہا تھا، مہمان لڑکی کی آمد کوئی انہونا واقعہ بھی، نشرہ بے تحاشا حیران نظر آئی۔

مورے نے مہمان لڑکی کو اپنے سینے سے چٹایا اور بہت دیر تک اس کا سر اور بال چوتی رہیں، نشرہ نے حیرت سے ان دونوں کو بے تحاشا روتے ہوئے دیکھا تھا، یہ ماجرا اس کی سمجھ سے بالاتر تھا، کچھ دیر بعد جب جذباتی سن ختم ہوا اور نشرہ طعام کی شٹ بجت گئی فارغ ہوئی تو عشیہ کو قہوہ بناتے دیکھ کر چوں آدھمکی۔

”آپ کا یہاں کیا کام؟ بولا بھی ہے، آپ باورچی خانے میں نہیں آئیں گی، شادی میں دن ہی کتنے رہ گئے ہیں؟“ اس نے فوراً عشیہ کے ہاتھ سے چھلنی پکڑ لی اور خفا انداز میں عشیہ کو گھر کا تھا۔

”اتنے نخرے نہیں اٹھاؤ، بہت نارک اندام نہیں ہوں میں۔“ وہ پیار سے بولی تھی، نشرہ کا یہی احساس کرنا تو دل کو بہت بھاتا تھا، کبھی کبھی اسے خیال آتا تھا، نشرہ ہیام کی ہر اچھائی اور ہر نیکی کا سب سے بڑا انعام تھی، اتنی معصوم، نیک، شفاف اور خلص۔

امید تھی، وہ شاہوار کے گرد گھیرا تنگ کر ہی لے گا۔

”تو پھر؟“ شاہوار نے حیرانگی سے پوچھا تھا، اس کے لئے صندیر خان کی فون کال ہی غیر متوقع تھی، اور بے اتنی جلیبی سے کھنگو؟ چہ معنی دارد، جانے وہ کیا چاہتا تھا؟

”تجدید تعلق چاہتا ہوں، پرانی رشتیں بھلا دو۔“ صندیر خان نے اپنی بات پھر سے دہرائی تھی، شاہوار متوجہ ہو گیا تھا۔

”کیسے بھول جاؤں؟ گھر بدر ہو جانا؟ جائیداد سے بے دخل کیا جانا؟ ساجی اور معاشی لحاظ سے دھچکے لے کر بھی بھول جانا؟“ وہ ایک دم تلخ ہو گیا تھا۔

”اپنی پسند سے زندگی گزارنے کا فیصلہ میرے گلے کا طوق بنا دیا گیا، سارے اکاؤنٹ میرے فریز کر دیئے، فیکٹری سے بے دخل کر دیا، زمین کی آمدن تو پہلے بھی کہاں ملتی تھی، بابا جان کے سیاسی خرچے ہی ختم نہیں ہوتے تھے، سب سے بڑی بات گھر سے نکال دینا اور تم کہتے ہو، بھول جاؤں؟ بہت آسان ہے نا؟“

”سب کچھ ٹھیک ہو سکتا ہے، اگر تم چاہو تو؟“ صندیر خان نے سابقہ ملائم انداز میں کہا تھا۔

”بی جانوں، سہا خانہ کا رشتہ ٹھکرا جانا معاف کر سکتی ہیں؟ ہوٹل کے دروازے کھل سکتے ہیں مجھ پر؟ بابا جان اپنا فیصلہ بدل سکتے ہیں؟“ وہ ترشی سے بولتا چلا جا رہا تھا، اچانک صندیر خان نے اسے خاموش کر دیا تھا۔

”میں سب کچھ ٹھیک کر لوں گا۔“ صندیر خان کی آواز مدہم مگر مضبوط تھی، وہ اچانک خاموش ہوا تھا اور پھر پھٹ پڑا۔

”پہلے سب خراب کرتے ہو اور پھر سب ٹھیک کر کے سارا کریڈٹ خود لیتے ہو، بہت جی دار ہوتا تم اور میں الو کا پٹھا ہوں، جس میں عقل نام کو نہیں، تم کہو گے تو میں مان لوں گا، مجھے اب کچھ نہیں چاہیے واپسی بھی نہیں، میں اپنے حال میں خوش ہوں، برائے مہربانی مجھے خوش ہی رہنے دیا جائے۔“ شاہوار نے زہر خند لہجے میں بہت کچھ جتاتے ہوئے فون بند کر دیا تھا اور یہ سب اتنا اچانک ہوا تھا کہ صندیر اسے ردک بھی نہیں پایا اور اپ بند فون اس کا منہ چڑا رہا تھا۔

جہاندار کی واپسی، ان کے لئے بہت بڑا خطرہ بھی اور اب انفرادی طور پر اسے مضبوط ہونا تھا، جہاندار کو ان دنوں بھائیوں کی رشتیں کی خبر کسی طور پر بھی پہنچی چاہیے تھی اور وہ جلد از جلد شاہوار سے تعلقات بحال کرنا چاہتا تھا۔

اس کے لئے صندیر خان کو زہر کا گھونٹ بھرنا تھا، اپنی اتنا کا تھا کچلنا تھا، سب سے بڑی بات بی جانوں کی نفرت اور اتنا سے ٹکرا کرنا تھا۔

شاہوار کو واپس لانے کا صرف ایک ہی حل تھا، سردار بٹ کی پہلی بیوی خانم کی انتہائی تک چڑھی بد زبان بنی کو قبول کرنا، ایک مرتبہ پھر سالوں بعد شاہوار کی بیٹیاں ہوٹل میں راج کرنے آ رہی تھیں، وہ خانم ہوتی یا خانم کی بیٹی۔

فریدے شاہ کی بیٹی ہونی یا نواسی، ہوٹل کی تاریخ ایک مرتبہ پھر بدلنے والی تھی، عشیہ کبیر بٹ کی منصوبہ سازی قدرت کی طرف سے عمل میں آنے والی تھی۔

”مہمان تو ہیں نا؟“ اس کا انداز شرارت بھرا تھا، عشیہ کا چہرہ ہلکا گلابی سا ہوا، تاہم اسے اپنے جذبات پہ کنٹرول تھا، نشرہ اس ادا پہ نہال ہو گئی تھی۔

”کوئی بات نہیں، شرمائیں آپ۔“ اس کا انداز گدگدانے والا تھا، وہ اسے مصنوعی انداز میں گھورتی ہوئی مسکرا دی تھی۔

”اچھا۔۔۔۔۔ یہ جتاؤ، تم ملی ہو گلائی سے؟“ عشیہ کو اچانک خیال آیا تو قبوہ بناتی چونک کر پوچھنے لگی تھی، چاول کے لذو ناریل میں ڈپ کرتی نشرہ نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔

”نمک کی سوتیلی مند ہے اور مورے کی جان عزیز۔“

”جان عزیز؟“ نشرہ نے حیرت سے دوہرایا تھا۔

”ہاں، مورے کو گلائی سے اتنی محبت ہے، شاید اتنی ہیام سے بھی نہ ہو، تو اب تم سمجھ سکتی ہو کہ مورے کو گلائی اتنی عزیز ہے۔“ عشیہ کا انداز عیسیٰ لئے ہوئے تھا، نشرہ نے کوئی تبصرہ نہیں کیا اور نہ ہی کوئی سوال کیا تھا، عشیہ خود ہی بتاتی رہی۔

”ڈاکٹر لغاری گلگت کی بہتی کے پہلے ڈاکٹر تھے، بہت قابل، لائق اور ہمدرد، ان کا بہت بول بالا تھا، در در کے علاقوں تک، شاہوں کی حویلی میں آنا جانا ہوا تو ایسے ہی چلتے چلتے ان کو مورے سے محبت ہو گئی تھی اور شاید مورے کو بھی، تب مورے ہو چلے کے سردار سے منسوب تھی، لاکھ چاہنے کے باوجود بھی نانا جان اپنی زبان سے پھر نہ سکے، قصہ مختصر ڈاکٹر لغاری کی ہزار منتوں اور چاہتوں کے باوجود نانا جان اپنا عہد نہ توڑ سکے، مورے کا بیاہ ہو گیا، پھر ڈاکٹر نے بھی ایک بیوہ سے شادی کر لی، جس کے ہاں پہلے سے اولاد تھی، گلائی ان کی اکثر صاحب نے شاید شادی کے لئے خانہ پری ہی کی تھی، ورنہ شادی کی انہیں خواہش تھی نہ ضرورت، گلائی ان کی اکلوتی بیٹی تھی، جسے وہ اپنی جان سے بھی بڑھ کر چاہتے تھے، جب ان کی وفات ہوئی تب ہی یہ قصہ کھلا تھا، ڈاکٹر لغاری کے گھر والوں نے ان کی بیوہ خاتون سے شادی کو تسلیم نہیں کیا تھا اور لاہور میں زبردستی ان کی شادی کرادی تھی،

گلائی ان کی حقیقی اولاد تھی، جسے بیوی کی وفات کے بعد وہ بہتی واپس لائے تو ان کی پہلی بیوی نے اسے قبول ہی نہیں کیا، پھر گلائی ڈاکٹر لغاری کی خواہش پر مورے کی گود میں شکل ہو گئی، اپنی عمر کے ابتدائی سال اس نے مورے کے ساتھ گزارے تھے اور تب ہی مورے نے گلائی کی زبان کلائی

منگنی اسے سوتیلے بھائی جہاندار سے کر دی تھی، ڈاکٹر لغاری کی وفات کے بعد گلائی کو زبردستی گلگت بھجوا دیا گیا، تب میرے خالہ باپ نے گلائی کی سوتیلی ماں کی باتوں میں آکر گلائی سے مورے کی محبت بھی چھین لی، میرے باپ اور مورے کے درمیان وجہ تنازعہ بھی گلائی کا وجود تھا جو بعد ازاں خاندانی رنجشوں، بغزوتوں، عداوتوں کے بعد فرخزاد اور ودھا کے قتل پر تمام شد ہو گیا۔“ عشیہ شاید قصہ تمام کر کے افسردگی ہو گئی تھی، نشرہ کو بھی گلائی پہ بہت ہی ترس آیا، کتنی محروم زندگی تھی، گلائی کی،

ادھوری اور نامکمل سی۔

”تو پھر گلائی کی شادی ہو گئی؟“ نشرہ نے اسے افسردگی کے حصار سے نکالتے ہوئے پوچھا تھا۔

”ارے کہاں؟“ عشیہ کا دکھ سوانیزے پہ پہنچ گیا۔

”سب کچھ تو ختم ہو گیا تھا، افراسیاب کی ماں نے اس رشتے کو تسلیم ہی نہیں کیا، اگر عسکریہ اور عسکریہ کے رشتے طے شدہ نہ ہوتے تو شاید مورے بھی ان لوگوں میں رشتہ داری نہ کرتیں، مگر ہمارے ہاں زبان اور عہد کی پاسداری انسانی زندگی سے بھی زیادہ ہوتی ہے۔“

”مگر کیوں؟“ نشرہ کو اب کہ بہت تجسس ہونے لگا تھا، گلائی میں اس کی دلچسپی بہت بڑھ گئی تھی۔

”وہ مورے کا سوتیلہ شہری بھائی اور اس کی ماں، وہ اس رشتے کے حق میں نہیں تھے، پھر جب مورے کا بھائی یہاں آیا اور اس نے گلائی کو دیکھا تو مان گیا مگر اس کی ماں نے گلائی کے رشتے کو تسلیم ہی نہیں کیا تھا، دونوں کی ماؤں نے مل کر گلائی کو دار پہ چڑھا دیا، مورے ڈاکٹر لغاری سے کیا عہد نبھانہ سکی تھیں، اس رشتے کو ٹوٹنے نے مورے کو آدھا نفسیاتی کر دیا تھا، وہ اپنے بھائی سے بھی متنفر ہو چکی تھیں، جب گلگت کی حویلی دونوں چھوڑ رہے تھے، مورے اور ان کا بھائی، تو دونوں کے بچ کچھ قول و قرار طے پائے تھے۔“

ایک نے کہا تھا۔

”اگر گلائی سے شادی نہیں کی تو مجھے اپنا مرا ہوا منہ بھی نہ دکھانا۔“

تو دوسرے نے جواب دیا تھا۔

”اگر فرخزاد اور شیر شاہ کے قتل کا بدلہ لے لیا تو گلائی کو بھی اپنے نام کرلوں گا ورنہ انہیوں کی اس حویلی کو اپنے ہاتھ سے آگ لگا دوں گا۔“

پھر نہ مڑ کر قول و قرار کرنے والا آیا۔

”نہ فرخزاد کے قتل کا بدلہ لینے والا آیا اور نہ گلائی کی سولی مانگ جانے والا آیا، اس نے اب تک انتقام پورا نہیں کیا، نہ اس نے بدلہ لیا نہ واپسی کا رخ کیا، سو گلائی بھی انتظار کی سولی پہ لٹک رہی ہے، اگر اس نے سردار بنو کے حلق پہ اپنا پاؤں رکھ دیا تو مجھے یقین ہے، وہ فریدے شاہ کا بیٹا اپنا عہد نبھانے ضرور آئے گا، وہ گلائی کو اپنا بنانے ضرور آئے گا۔“ عشیہ کی آنکھوں سے کئی ستارے ٹوٹ کر گر پڑے تھے، نشرہ نے گلائی کے دکھ کو اپنے دل میں بہت شدت کے ساتھ محسوس کیا تھا۔

”گلائی بھر کا سوت کات رہی ہے۔“ اس کی آنکھوں سے تیل رواں بہنے لگا۔

”اور مورے کا دل روز کتنا ہے، روز روز گر کی ہوتی ہے، پھر نائکے ادھر جاتے ہیں، تم سوچتی ہو گی مورے اتنی تلخ کیوں ہیں؟ مورے اسی لئے اتنی تلخ اور زہریلی ہو چکی ہیں، انہیں حالات نے ایسا بنا دیا ہے، مجھے اس بات کا خوف ہے، اگر ان کا بھائی آنے والے سالوں میں واپس نہ لوٹا تو کہیں گلائی کی محبت میں مورے ہیام کو قربان نہ کر دیں۔“ عشیہ کے اگلے الفاظ نے نشرہ کے اندر قیامت برپا کر دی تھی، اس کے پیروں تلے سے زمین کھسک گئی تھی، سر کے اوپر آسمان مل گیا تھا۔

”کیا ایسا ہو سکتا ہے؟“ اس نے لرزیدہ ہونٹوں پہ ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا تھا۔

”تمہارے آنے سے پہلے شاید ہم سب اس عمل کو خوش آئند سمجھ لیتے اور گلائی کے دل کی حنفی پر سے اس کے محبوب کا نام کھریج کر پیام کا نام لکھ دیتے، مگر اب شاید ممکن ہی نہیں، سامنے تم کھڑی ہو، نشرہ! اور تمہارے ساتھ کوئی زیادتی نہیں ہوگی۔“ عشیہ نے ہر اس افسردگی کو اپنے ساتھ لپٹا



لیا تھا۔

”جو میرا بھی ہوا ہی نہیں، اسے مجھ سے دور کرنے کی بات تو نہ کریں۔“ وہ بے ساختہ سسک پڑی تھی۔

”ایسا کچھ نہیں ہو گا نشہ!“ عشیہ کی تسلی نے بھی اس کے دل سے یہ دوسرے نہیں نکالا تھا، کیا خبر یہ دوسرے کوئی وہم نہیں، کوئی ٹھوس حقیقت ہی ہوتا اور کسی کو کیا خبر تھی؟ آنے والے وقت میں کیا ہوتا اور کیا نہ ہوتا؟ ایک بڑا سوالیہ نشان اسے ڈرا رہا تھا۔

☆☆☆

سنور کے پاس سے گزرتے ہوئے ایک دلغریب خوشبو نے اس کے ارد گرد اپنا حصار کھینچ لیا تھا، ہیام کے آگے بڑھتے قدم ایک بل میں ہی رک گئے تھے۔

اس نے دائیں بائیں دیکھ کر تسلی کی گئی، کوئی بھی موجود نہیں تھا، وہ دے قدموں سنور کا ادھ کھلا دروازہ اٹکی آواز میں کھول کر اندر آ گیا تھا، نشہ جو اپنے دھیان میں بیٹنی سے بستر نکال رہی تھی، اس افتاد پر گھبرا اٹھی، کوئی اس کے قریب بہت قریب چکا تھا، کوئی اس کے حواسوں پہ چھا چکا تھا، کوئی اسے اپنے محبت بھرے گرم اور پر جوش حصار میں لے چکا تھا۔

نشہ کا بے قابو ہوتا دل ایک مخصوص لے پہ دھڑکنے لگا، خوف کی جگہ طمانیت کا ایک مہرا احساس آن لپٹا تھا، وہ اس خوشبو بھرے حصار میں مطمئن تھی، ایک ساحرانہ لمحے کی گرفت میں تھی۔

”ہیام۔“ اس کے گداز ہونٹوں سے سریلے سا نغمہ نکلا۔

”ہوں، جان ہیام۔“ وہ اس کی روح پر درگدازیت میں گم ہوتا مخمور لہجے میں بولا تھا۔

”میں ڈر گئی تھی۔“ اس نے معصومیت سے کہا تھا۔

”میرے ہوتے ہوئے؟“ باتوں کے فنکار کی خوشنما آنکھوں میں تعجب ابھرا۔

”ہاں، میں نے سمجھا، جانے کون ہو گا۔“ وہ ایک سرور بھری کیفیت میں اپنے جذبات کا اظہار کر رہی تھی۔

”اتنی کسی کی جرأت نہیں ہے۔“ ہیام نے درہائی سے جتایا تھا، وہ نفرتی لمسی کے سر بکھیرنے لگی تھی اور ہیام جیسے بہتے بھرنوں کے اس شور میں مدہوش ہو گیا تھا، وہ اس کی گرفت میں شدت محسوس کرتے ہوئے پہلی مرتبہ ذرا گھبرائی، ذرا کسمپاسی تھی۔

”ہیام!“ اس نے مدہم انداز میں پکارتے ہوئے اٹکی سی مزاحمت کی تھی۔

”جی جان ہیام۔“ وہ لطیف انداز میں اپنا حق وصول کرتے ہوئے چاہتوں سے لبریز لہجے میں بولا تھا، نشہ کے پورے وجود میں پھیری کی بھر پوری تھی، وہ اب گھبرانے لگی تھی۔

”کوئی آجائے گا۔“

”تو آجائے دو۔“ اسے کون سا پروا تھی۔

”یہ معصہ آسانی سے حل ہو جائے گا۔“

”ہاں، مجھے نکلواؤ گے تم۔“ وہ کسمپاسی تھی۔

”کسی کی جرأت ہے کیا؟ کوئی بھی میری لاش سے گزر کر تم تک آئے گا، اسے خالی ڈالیا لگ

نہیں سمجھنا۔“ اس نے محبت سے نشہ کے چہرے پہ بکھرے بال اپنے ہاتھوں سے سنوارتے ہوئے کہا تھا، اس کی گرم سانسیں نشہ کے حواس کم کر رہی تھیں، وہ اس کے چہرے پہ جھک گیا تھا۔

”ہیام!“ وہ ہڑبواٹی تھی۔

”اب چلے جاؤ۔“ گھبراہٹ اور شرم نے اسے لال انگارہ کر دیا تھا۔

”جاتا ہوں، دیدار یار تو کرنے دو، پھر جانے کب زیارت ہو۔“ وہ اور بھی پھیلتا ہوا آنکھ مار کے مسکرایا تھا۔

”ہاں، میں تو جیسے کوہ قاف جا رہی ہوں نا۔“ نشہ اپنی اتھل سانسوں کو رواں کرتی بمشکل بول سکی تھی، وہ جنونی انداز میں اس کے گال سے اپنے گال رگڑتا کئی ایک مہرے محبت ثبت کرتا اس کی شرم و حیا کو دل سے انجوائے کر رہا تھا۔

”حسن بہت دیکھا ہے، مگر حیا میں ڈوبا نہیں جی چاہتا ہے تمہارے اس پیکر کو دل کے نہاں خانوں میں چمپا کر پرتوں کے اس پار چلا جاؤں نشہ اور پھر بھی واپس نہ آؤں۔“ وہ اس کے گداز وجود کو اپنی گرفت سے آزاد کرتا محبت سے بولا تھا، نشہ کو اس بل جانے کیا ہوا تھا، آنکھیں بے سب ہی برس پڑی تھیں اور جیسے جل تھل ہو گئی، ہیام نے سے ایک مرتبہ پھر اپنے ساتھ لپٹا لیا تھا۔

”میری جان! جہاں اتنا صبر کیا ہے، وہاں کچھ اور صبر کر لو۔“ وہ طمانیت سے اس کے بال اور گل سہلا رہا تھا، نشہ کے آنسو اپنی پوروں اور لبوں سے چن رہا تھا اور وہ تھی کہ اس کی بانہوں میں چپل چپل کر رہی تھی۔

”بس کرو نشہ! میں تمہارے آنسوؤں میں بہہ جاؤں گا، پگھل جاؤں گا۔“ اس نے نشہ کے دونوں ہاتھ اپنے گالوں سے رگڑتے ہوئے چوم لئے تھے۔

”تمہارے آنسو مجھے تکلیف دیتے ہیں، کیا تم چاہتی ہو، میں تکلیف میں رہوں؟“ یہ جذباتی دارکار مگر ثابت ہوا تھا، نشہ نے سوسوں کرتے ہوئے اپنے آنسو پونچھ لئے تھے۔

”یہ امتحان کب ختم ہو گا؟“

”غفرت یہ میری جان۔“ ہیام نے محبت سے اسے تسلی دی تھی، وہ قدرے بہل گئی تھی اور پھر اچانک ہی اسے گزرتے وقت کا احساس ہوا تھا، اس نے ہیام سے کہا۔

”اب جاؤ بھی، کوئی آنہ جائے۔“

”آں ہاں، چلتا ہوں، دل پہ بلڈوزر چلا کر۔“ اس نے غنڈی آہ بھری تھی اور پھر ایک گستاخانہ اشارہ دیتا ہا ہر نکل گیا تھا، جبکہ نشہ بے دم سی ہو کر وہیں بستر کے ڈھیر پہ ڈھیر ہو چکی تھی۔

☆☆☆

ڈھولک کی تھاپ یہ گیتوں کی دھن بج رہی تھی۔

نیچے ہال میں بستی گئی لڑکیوں کا شور تھا، لمبی، قہقہے اور شونخ چنپل لڑکیوں کی شرارتیں، اس بھوت بھنگے میں بھی زندگی کے رنگ نظر آ رہے تھے۔

عروذہ مسلسل تین دن سے غائب تھی، کمرے سے باہر ہی نہیں آتی تھی، جب بھی نظر آتی،

رو یہ بہت حوصلہ افزا تھا، عروذ کو از خود احساس ہوئے لگا تھا، ولید کی اسے چاہتا ہے، وہ محبت سے اس سفر میں تنہا نہیں تھی، یہ احساس ہی اس کے لئے روح افزا تھا، زندگی کو آگے بڑھانے کے لئے اتنا سازا دراز ہی کافی تھا۔

”مگر میں روز گھر سے شادی نہیں کر سکتی۔“

”تو مت کرو، مگر اپنی زندگی کو ختم نہیں کرنا دے، پر اس کرو۔“ ولید نے اتنے پیار سے وعدہ لینے پر اس نے دل میں ابھی لہروں کو دباتے ہوئے پر اس دے دیا تھا۔

جب اس نے معمولی کھٹکے کے خوف سے نون بند کیا تب وہ پردوں کی مانند ہلکی ہو چکی تھی، اس کے اندر باہر پھول کھل رہے تھے اور اس کی جگہ کلیوں کی مہک نے اندر آئی نشرہ کو بھی چونکا دیا تھا۔

کہتے ہیں نا، عشق اور شک چھپائے نہیں چھپتے، تو یہی حال اس خوشبو کا تھا، جس نے نشرہ کو بھی ٹھنکا دیا تھا، تاہم اس نے یہی سمجھا، عروذ کے چہرے پہ کھلے گلاب روز گھر کی نون کال سے ملنے تھے، وہ اس کے ہاتھ میں موبائل بھی دیکھ چکی تھی، عروذ نے اچانک اندر آئی نشرہ کو دیکھ کر نہ جانے کیوں وضاحت دی تھی۔

”روز گھر کو کال کرنی تھی۔“ نغوت سے جواب دیتی وہ باہر نکل گئی تھی، جبکہ نشرہ اس کے عجیب روپے پر کندھے اچکا کاتی بال سلجھانے لگی تھی، کچھ دیر بعد ایک بچے نے جھانک کر اسے پیام کا پیغام دیا تھا۔

”ماموں بولتے ہیں، چار کپ چائے کا پانی چولہے پر رکھ کر میری بات سنیں۔“ اس عجیب پیغام کو سن کر نشرہ کے لبوں پہ مسکان بگھڑی تھی، وہ اسے کچن کے پچھاڑے میں بلا رہا تھا۔

”اوف، یہ پیام بھی نا۔“ وہ جلدی جلدی بال سلجھاتی، شال لپیٹ کر باہر آگئی تھی، سامنے ہی گھیر دار فراک میں بیٹھی اسے گلابی نظر آئی تھی، گلابی فراک کی رنگت اس کی اپنی رنگت کو ہلکا کر رہی تھی، یوں لگتا تھا، جیسے گلابوں میں گندھا ہوا چہرہ ہے وہ اس کے حسن سے خاصی متاثر تھی۔

مورے اور گلابی کو باتوں میں مصروف دیکھ کر وہ سب سے نظر ہجائی کچن کا پچھلا دروازہ کھولتی باہر آگئی تھی۔

اس وقت باہر رات کی رانی کا راج تھا، آسمان پہ اکا دکا ستارے تھے، ہر طرف گہرا سکون اور مہیب خاموشی چھائی تھی، گھر کے اندرونی حصے میں صرف شور تھا، جس شور کی وجہ سے ان کی آوازیں دب رہی تھیں، وہ جیسے ہی باہر نکلے، پیام نے اس کی کلائی جھپٹ کر اپنی طرف تھینک لیا تھا، وہ چیخ دہانی اس کے ساتھ ٹھٹھکی چلی گئی تھی، پچھلی سیڑھیوں کے نیچے موجود چھوٹے سے سنور کا دروازہ کھول کر پیام نے اسے اندر دھکیل کر موبائل کی لائٹ آن کی تھی۔

”اوف پیام، کلائی تو چھوڑ دو۔“ وہ درد سے کسمپاسی تھی۔

”کلائی چھوڑنے کے لئے نہیں پکڑی تھی۔“ وہ نشرہ کو بھیکے حلیے میں دیکھ کر اپنے آپے میں نہیں رہا تھا، اس کے کیلے خوشبودار بالوں کی مہک سے مدہوش ہوتا اسے اپنی گرفت میں لے چکا تھا۔

”یہ بے وقت کا رومانس ایک دن بڑا مہنگا پڑے گا جناب کو۔“ نشرہ گھبرائی گھبرائی سی اسے

موبائل کی تلاش میں ہوتی، البتہ موبائل اس کی پہنچ سے دور تھا، عشیہ اپنا موبائل دیتی نہیں تھی اور اس نے نشرہ کو بھی منع کر رکھا تھا، کہ عروذ کو موبائل نہیں دینا، کچھ اس بات کی وجہ سے عروذ کٹ کھٹی ملی بنی ہوئی تھی، مگر آج عروذ کی قسمت اچھی تھی، جیسے ہی نشرہ اپنا موبائل چار جنگ پہ لگا کر نہانے کے لئے نکلی اس ہی بل عروذ دے قدموں اس کے کمرے میں داخل ہوئی تھی۔

موبائل کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں چمک بڑھ گئی تھی، وہ پتیل کی طرح موبائل پہ جھپٹی تھی اور دوسرے ہی پل اس کے سن میں گھنٹیاں سی بج اُٹھیں، کیونکہ ولید نے کال ریسیو کر لی تھی۔

”تم کہاں تھی؟ میں پریشان ہو گیا تھا۔“ اس نے زمانے بھر کی نرمی لہجے میں سو کر کہا تھا، عروذ کا دل پہلو میں اودھم مچانے لگا، ولید کے لہجے کی گتھیر پانے اس کے اندر لہلہا چا دی تھی، اسے خود پر قابو کرنا محال ہو گیا تھا اور وہ ایک دم ہی سسک پڑی تھی۔

”ارے..... ارے..... تم رو کیوں رہی ہو؟“ ساری کوفت اپنے اندر دباتے ہوئے ولید نے بظاہر بڑی فکر مندی سے پوچھا تھا، جواباً عروذ نے سسکتے ہوئے اسے اپنے اوپر ٹوٹنے والی قیامت کا بتایا تھا، جسے سن کر ولید کو شاک لگا، عروذ کی شادی کا مطلب تھا، اسے اپنے مقصد میں ناکامی تھی، اسی لئے وہ شدید پریشان ہو گیا تھا۔

”اتنی جلدی؟“ وہ بس اتنا ہی کہہ سکا تھا۔

”تو کیا کروں، میری ماں نے ملے کر دی تھی، میری مرضی کے خلاف۔“ وہ اور شدت سے رونے لگی تھی، ولید کوفت سے دوہرا ہو گیا تھا۔

”اچھا..... ابھی چپ تو کرو۔“ اس کے سمجھانے پہ عروذ نے بمشکل ہی رونے کا پریڈ مکمل کیا تھا۔

”تم نے مجھے خاصا پریشان کر دیا ہے۔“ وہ حقیقتاً مشکور تھا، اگر عروذ چلی جاتی تو وہ نشرہ تک کیسے پہنچتا، اسے کچھ تو سوچنا تھا مگر اس سے پہلے ہی عروذ سارا لائحہ عمل سوچے بیٹھی تھی، ولید تو اس کی پلاننگ پہ اشک کراٹھا تھا، اسے کچھ کہنا ہی نہیں پڑا تھا۔

”میں سب ٹھیک کر لوں گی۔“ وہ جیسے اسے تسلی دے رہی تھی۔

”اچھا، مگر کیسے؟“ ولید نے دلچسپی سے پوچھا تھا۔

”میں اپنی شادی رکوا لوں گی۔“ اس کا انداز فیصلہ کن تھا، ولید کو بڑی کھد بد ہوئی تھی، اس کے دعوے نے ولید کو خاصا متعجب کیا، پہاڑی لوگ تو بڑے انا پرست اور غیور ہوتے تھے، وہاں پہ شادیاں رکوانا کوئی معمولی واقعہ تصور نہیں کیا جاتا تھا، تو پھر عروذ نے کیا کرنا تھا؟ اسے واقعی ہی اس قصے میں دلچسپی ہونے لگی تھی۔

”مگر کیسے؟“ وہ پوچھے بنا نہیں رہ سکا تھا۔

”یہ میرا کام ہے، آپ دیکھ لیتا، میں اس شادی سے بہتر میر جانا پسند کروں گی۔“ اس نے عجیب شدت پسندانہ انداز میں کہا تھا، ولید کو ذرا ہی جھرجھری آگئی تھی۔

”لہو، یہ قدم مت اٹھانا پلجیز، خود کو نقصان مت دینا۔“ اس نے واقعی دلی سے اسے جذباتی کوئی بھی قدم اٹھانے سے روکا تھا، عروذ کے اندر باہر جیسے پھواری پڑنے لگی تھی، ولید کا



سوشل میڈیا کے 8 شگفتہ احساس

MEDORA OF LONDON

ان رسکی ملاقاتوں کے ڈراپ سین سے ڈرا رہی تھی۔  
”پٹھان کا بچہ ہوں، ڈرتا نہیں ہوں۔“ بند کمرے میں وہ اپنی بہادری کی بڑی بڑکیں مارتا تھا،  
نشرہ کو ڈھیر ساری آگئی تھی۔

”ارزا مذاق بہت اچھے سے۔“ وہ بھنا کر رہ گیا تھا۔  
”وقت نہیں میرے پاس، ملاقات بلکہ اس ہنگامی ملاقات کا سبب بناؤ، چائے کا پانی چو لے  
پر رکھ کر آئی ہوں۔“ نشرہ نے اسے گزرتے وقت کا احساس دلایا تھا۔  
”یہ لایا تھا تمہارے لئے۔“ اس نے دو بھاری پیکٹ نشرہ کی طرف بوجھائے تھے، جن کے  
اندرونی بلبوسات جھانک رہے تھے، نشرہ منتظر ہوئی اور متذبذب بھی۔  
”مورے نے مجھے ڈریسز بنوائے ہیں۔“

”وہ پھر پہن لینا، یہ میں تمہارے لئے لایا ہوں اور یہ بھی۔“ اس نے ایک مٹلی ڈبیہ سے دو  
نگن نکالے تھے، اسکی موتیوں سے جڑے، اتنے خوبصورت ننگن کہ اندھیرے میں لگا ہوں کو خیرہ  
کر رہے تھے نشرہ کی آنکھیں مبہوت ہو چکی تھیں۔  
”یہ تو بہت مہنگے ہیں۔“ وہ جھجک کر ذرا دھمکی تھی۔

”مگر تم سے زیادہ نہیں۔“ ہیام نے اسے اپنی طرف کھینچ کر خود میں بیچ لیا تھا اور پھر اس کی  
کلائی پکڑ کر ننگن پہنا دیے تھے، نشرہ خواب آگئی کیفیت سے مبہوت سی دیکھتی رہ گئی تھی، کچھ پل  
کے لئے لفظ گم گئے تھے اور خاموشی دونوں کے بیچ ہم کلام رہی تھی۔  
”تم زندگی کا سب سے خوبصورت احساس ہو نشرہ۔“ ہیام نے اس کی پیشانی پہ محبت بھرا  
بوسہ ثبت کیا اور تیزی سے باہر نکل گیا، جبکہ نشرہ کے گرد اپنی خوشبو چھوڑ گیا تھا۔  
”میں تمہارے لئے زندگی کا سب سے خوبصورت احساس ہوں، مگر تم میرے لئے پوری  
زندگی ہو۔“ اس کی نم آنکھوں سے جھگڑتے ننگن پہ ہاتھ پھیرا تھا اور مسکرا دی تھی۔

☆☆☆

ہال میں اچانک ہی مدہم بھنبھناہٹ کے بعد خاموشی چھا گئی تھی۔  
اس وقت بستی کی لڑکیاں اپنے گھروں کو جا چکی تھیں، عروذ اور عشیہ منظر یہ نہیں تھیں، البتہ نشرہ  
ایک عجیب سی تربیت کے ساتھ پھیلاؤ اسمینے میں گمن تھی، اس کی کلائیوں کے ننگن ذرا سی حرکت پہ  
عجیب سی گونج کے ساتھ بج اٹھتے تھے۔

ہیام دن بھر کی بھاگ دوڑ سے تھک چکا تھا، اس کا ارادہ چائے پی کر آرام کرنے کا تھا، اس  
نے نشرہ کی مصروفیت دیکھ کر خود ہی چائے بنانے کا ارادہ کر لیا تھا۔  
جب وہ کچن میں پہنچا تب ہی نشرہ بھی اپنے دھیان میں گمن ہاورچی خانے میں داخل ہوئی  
تھی، ہیام کو چائے بنانا دیکھ کر ٹھنک گئی تھی۔

”ارے، مجھے کہا ہوتا، خود کیوں تکلیف کی؟“  
”تکلیف کیسی؟ ہاسٹل سے لے کر پیچرز فلٹ تک سارے کام میں خود ہی کرتا تھا، تم بیوگی؟“  
دھجک نکالتے ہوئے مصروف انداز میں بولا تھا۔



”دیکھی اور پوچھ پوچھ۔“ وہ اسٹول پہ چڑھ کر بیٹھ گئی تھی، ہیام کی ذرا سی توجہ نے دن بھر کی ساری تھکاوٹ دور کر دی تھی، وہ بے خیالی میں ننگن کلائی میں گھمائی سوچتی رہی، ہیام اسے سوچوں میں گم دیکھ کر چونک گیا تھا۔

”کیا سوچ رہی ہو؟“

”یہی کہ ان نکلز کا کیا جواب دوں گی، اتنے مہنگے نکلن راتوں رات کہاں سے آئے؟“ اس نے اپنی پریشانی کی وجہ بتائی تھی، واقعی وہ اس پل پہی سوچ رہی تھی۔

”ہر بات کا جواب دینا ضروری نہیں ہوتا، اگنور کر دینا۔“ آسان حل پیش تھا، ہیام نے چائے چھان کر پیالیوں میں ڈالی تھی، پھر ایک پیالی اسے تھما کر بولا۔

”یہاں سردی ہے، اپنے کمرے میں چل جاؤ، میں مورے کو چائے دے کر سونے لگا ہوں۔“ ہیام نے پزیر بند کیا اور گندے برتن سمیٹ کر کچن کی لائٹ آف کر دی تھی، نشرہ پہلے ہی کپ اٹھا کر جا چکی تھی، یقیناً وہ بھی تھکی ہوئی تھی اس لئے اتنی نیکی نہ کی تھی۔

ہیام بھی ٹرے اٹھا کر مورے کے کمرے میں آ گیا تھا، ٹرے میں تین پیالیاں تھیں، اسے اندازہ تھا، مورے اور گالٹی جاگ رہی ہوں گی اور اس کا اندازہ درست ہی نکلا، وہ نہ صرف جاگ رہی تھیں بلکہ اندر سے باتوں کی آواز بھی آرہی تھی۔

چونکہ دروازہ تھوڑا سا کھلا ہوا تھا، اس لئے ان دونوں کی آواز باہر تک صاف سنائی دے رہی تھی، ہیام لمحہ بھر کے لئے غیر ارادہ ہی رک گیا تھا، اندر سے گالٹی کی سکوت میں تیر کی ایسی آواز آئی تھی جس نے ہیام کو سر تا پا پتھر کر دیا تھا، اس کے ہاتھ میں ٹرے مل گئی تھی۔

”وہ آگیا ہے، گلگت کی حویلی میں۔“

”کون؟“ مورے کی سرسراہٹ آواز میں تجسس تھا، جیسے کچھ انہوتا سننے کو ملنے والا تھا۔

”وہی..... جہاندار۔“ گالٹی نے آنکھیں موند لی تھیں، جیسے بہت سے مجید چمپا لئے تھے، ہیام ٹھنک کر رک گیا تھا، غم بھر گیا تھا، غم گیا تھا۔

”جہاندار!“ مورے اٹھ کر بیٹھ گئی تھیں اور مورے جیسے سر تا پا پتھر گئی تھیں، یہ ان کے کانوں نے کیا سنا تھا؟ جہاندار آگیا تھا؟ وہ لوٹ آیا تھا، وہ اجڑی حویلی کو آباد کرنے آگیا تھا؟

”وہ بدلہ لینے آگیا ہے؟ اگر وہ بدلہ لے گا تو پھر اپنا عہد بھی نبھا دے گا، میں تمہیں اس کے ساتھ رخصت کر دوں گی۔“ مورے کی کپکپاتی آواز میں آنسوؤں کی آمیزش تھی، ان کے ہاتھ کانپ رہے تھے اور دل؟ خوشی، بے انتہا خوشی کے احساس سے بے قابو ہو رہا تھا۔

”کون سا وعدہ؟ کون سے عہد؟“ گالٹی کی درد میں ڈوبی آواز سنائی دی تھی۔

”جہاندار آگیا ہے، سردار کبیر بٹو کی بیٹی کو بیاہ کر لایا ہے کون سے عہد؟ کہاں کے وعدے۔“ اور ہر چیز جیسے ریت کی مانند اڑنے لگی تھی۔

(باقی اگلے ماہ)

”یہ تو کیا کہہ رہی ہے اماں۔“ ریزمی پر ہنسی کی آنکھیں پر احتیاط سے دال کی بڑی سی دیکھی رکھ کر رشید نے تعجب آمیز نگاہوں سے جنت بی بی کا مسکراتا چہرہ ملاحظہ کیا، جہاں چہرے کی جھریوں میں جھگڑتے خوشیوں کے رنگ انہی بہار دکھا رہے تھے۔

”ناں تو میں پوچھتی ہوں اس میں اتنا حیران ہونے والی کیا گل (بات) ہے۔“  
”پتر یہ تو ہر ماں کا ارمان ہوتا ہے کہ اپنی حیاتی میں اپنے جگر گوشہ کے سر پر سہرا باندھے اور تو، تو پھر میری اکلوتی اولاد ہے۔“ جنت بی بی کے لہجے میں آرزوؤں کی جھلک تھی۔  
”مگر اماں.....“

”تیرے بچو (باپ) کے مرنے کے بعد میں نے تجھے ماں کے ساتھ ساتھ باپ کا بھی پیار دیا لوکاں کے کار (لوگوں کے گھر) پاڈے (برتن) مانجھے جھاڑو پونچھ کیا مگر تجھے پوری نو جماعتیں کرائیں میں تو تجھے پڑھا لکھا کر دڈا (بڑا) آدمی بنانا چاہتی تھی مگر تیرا تو پڑھائی میں دل ہی نہیں لگتا تھا۔“

شیدے کی اگر مگر نے اسے جذباتی کر دیا اور جنت بی بی نے اس کی بات کاٹ کر جذباتیت سے بھرپور تقریر کر ڈالی۔

”اے اماں اب تو میں کیا ڈپوت ہو گیا ہوں، کیا کسی سے تجھے بول، اس بچی آبادی میں ہمارا گھر ان چند گھروں میں سے ایک ہے جہاں برسونی بیس کی سہولت موجود ہے۔“ ریزمی تیار کر کے رشید نے اپنی بوڑھی ماں کا جھریوں زدہ ہاتھ تھام کر بیان جاری کیا۔

”ہائے ماں صدے جاتے چل چھوڑ تو دل پر نہ لے۔“ اس نے نہال ہو کر چٹا چٹ شیدے کی بلانیں لے ڈالیں۔

”اماں! وہ..... وہ تجھ سے ایک بات کرنی تھی کئی دن سے سوچتا ہوں تجھے سب بتا دوں لیکن ناں تیرے سامنے میری زبان پرتا لے لگ جاتے ہیں۔“ رشید سر کھاتے ہوئے قدرے جھجک کر گویا ہوا۔

”ہائے اور رہا ایسی کون سی گل (بات) ہے جسے کہنے کے لئے میرے پتر کو اتنا سوچنا پڑ رہا ہے۔“ شیدے کے چہرے پر تذبذب کے آثار دکھ کر وہ ٹھٹھک گئی۔

”اگر تو آج راتو خالہ کی دمی کے لئے مجھ سے نہ پوچھتی تو میں آج بھی نہ کہہ پاتا۔“ اس نے تمہید باندھی اور ماں کی منہ بولی بہن کا نام لیا۔

”تو بول آخر بات کیا ہے؟ کیوں اتنی پہیلیاں بکھو رہا ہے۔“ جنت بی بی کا تجسس زوروں پر کھینچ گیا۔

”تو ناں راتو خالہ کی دمی سے میرے دیاہ کی آرزو چھوڑ دے ادھر میرا رشتہ نہ چلائیں۔“ بالآخر رشید نے بلی تھیلے سے باہر نکال دی۔

”ہائے میں مر جاؤں یہ تو کیا کہہ رہا ہے۔“ بچے کے صفا چٹا انکار پر جنت بی بی کلیجہ تھام کر رہ گئی۔

”اماں راتو خالہ کی عذر دہری بہن جیسی ہے میں نے اس کے متعلق کبھی ایسا نہیں سوچا۔“ ماں کو صدمے میں گھرا دیکھ کر اس نے گڑبڑا کر بات بنائی۔

”لو جی اب یہ گل اے۔“ جنت بی بی کی جان میں جان آگئی۔

”پتر شادی سے پہلے اچھے منڈے ہر کڑی، کو اپنی بہن سمجھتے ہیں۔“ وہ ہنس پڑی۔

”لیکن اماں بس ناں تو مان جا، وہاں میرا رشتہ مت لے جائیں۔“ اس کے ہاتھ تھام کر

رشید نے التجائیہ انداز اپنایا۔

”تو بتا پھر کون ہے جو تجھے بہن نہیں لگتی۔“ وہ سیر تھا تو خود سوا سیر تھی اس کے دل کا چور پکڑ لیا۔

”مجھے دیر ہو رہی ہے اچھا اماں رب راکھا۔“ اس کی بات ان سنی کر کے لگا ہیں جراتا وہ ریزمی نے کرنٹل گیا، جنت بی بی نے دروازے پر ٹنگے میلے چیکٹ پردے کی اوٹ سے ایک برسوج نظر دور جاتے رشید کی پشت پر ڈالی اور چھوٹا سا کپڑا منہ پر کر کے اپنے کونھری نما کمرے میں چلی آئی۔

☆☆☆

جون کی چلا پاتی دھوپ میں سڑک کے کنارے کھڑی ریزمی کے اوپر تانے گئے ساتباں کے نیچے کھڑا وہ بے تابی سے گردن موڑ کر سڑک کے نیچے نظر آتے راوی کی گود میں سکرے سنے رواں دواں پانی سے کچھ پرے ٹھہرے میں پر بنائی گئی خانہ بدشوں کی جھکیوں کی جانب نگاہ کیے ہوئے تھا۔

معمول کے مطابق چند بمبیس دریا کے کنارے نہانے کا شغل فرما رہی تھیں اور کسی جھکی والے کی پالتو مرغیاں دریا کی خشک ریتیں سر زمین پر دانا دنا کھاتے میں محو تھیں۔

جبکہ چند ایک عورتیں نئی نویلی لہن کی مانند سکرے سنے رواں دواں راوی کے پانی میں کپڑے دھونے میں مشغول تھیں۔

بس وہی نجانے کہاں غائب تھی اور اسے دیکھے بنارشد کو سانس لینا محال لگ رہا تھا، ریزمی کے گرد کھڑے گاؤں نے اسے اپنی اور متوجہ کیا تو گہری سانس بھر کر وہ ان کی سمت مڑا اور دیئے گئے آرڈر کے مطابق دال چاول پلینوں میں نکالنے لگا۔

شام تک ہر روز کے معمول کی مانند دال چاول کے دھچکے خالی ہو چکے تھے مگر آج اس نے چپکے سے ایک لفافے میں ایک پلیٹ دال چاول ڈال کر الگ سے رکھ دیئے تھے۔

مگر اس کو نہ آتا تھا نہ آدمی دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر ریزمی دھکیلا پی سی اودالے مجید تک آیا اور سلام دعا کے بعد جھلک میں اسے ریزمی کا خیال رکھنے کی ہدایت دیتا دال چاول سے بھرا لفافہ ہاتھ میں تھامے تیزی سے پل سے نیچے اترنے لگا۔

دن بھر کا غم دھمے جھلسی دھوپ کی صورت نکال کر اب تھکا ہارا آفتاب مغرب کی سمت سر جھکائے دھیرے دھیرے گاؤں ہو رہا تھا اور افق کے کناروں پر شام کی لالی پھیلتی جا رہی تھی، فضا میں بکھرے ہوا کے پھپھڑے اب بھی حدت کے احساس سے بھرپور تھے اور خواہ خواہ بغل گیر ہو کر جسم کے ہر مسام سے پسینہ باہر نکالنے کا باعث بنے جا رہے تھے۔

دریا کے اوپر جھکے کھلے سے نیلے آسمان پر پرندے اپنے اپنے ٹھکانوں کی طرف تھو پر دواز تھے اور دریا کے کنارے اترتی شام اپنے پر پھیلا کر اجالوں کو اپنے اندر سیننے کی خواہش میں ہر سو پھیلتی جا رہی تھی۔

ابھی کچھ ہی دیر میں دن بھر کے تھکے ہارے خانہ بدش مردوں نے تمام دن کی محنت مزدوری سے فراغت پا کر اپنی جھکیوں کی سمت لوٹ آنا تھا اور اس سے پہلے اس سے بات کرنے کا یہ سنہری موقع رشید ہرگز بھی گنونا نہیں چاہتا تھا۔

مخصوص جھوپڑی کے آگے سے گزرتے ہوئے وہ ہولے سے ٹھٹھکا اور اندر نیم اندھیرے میں چھپی اکلوتی جھنکاسی چارپائی پر اوندھے منہ لیٹا انسانی وجود چونک کر اس کی سمت

متوجہ ہوا تھا، وہ بدستور چلتا ہوا جھکیوں کی پچھلی سائینڈ پر چلا آیا اور کچھ بھر میں وہ بھی اس کے پیچھے آن مو جود ہوئی۔

”تو یہاں؟“ اسے اپنے سامنے موجود پارک وہ جی بھر کر حیران ہوئی۔

”تو، تو مجھ سے بات مت کر۔“ وہ زور سے پن سے گویا ہوا۔

”کیوں؟“ وہ بڑے آرام سے انجان بن گئی۔

”تیری طبیعت ٹھیک ہے؟“ رشید کے فکر مندی بھرے انداز پر شاداں نے ہولے سے اثبات میں سر ہلادیا، رشید نے شاکی نظروں سے اسے دیکھا۔

”تو بھلی چٹکی ہے اور پھر بھی مجھے سارا دن تڑپا یا اور میں خواہ خواہ تیری فکر میں دبلا ہو کر یہاں تجھے ملنے چلا آیا۔“

”تجھے میری بالکل پرواہ نہیں ہے۔“ شاداں کو سر جھکائے بدستور رہتلی زمین کی سمت متوجہ پا کر اسے غصہ آگیا۔

”لے پکڑا اب منہ کیوں پھلا رکھا ہے؟“ اسے ہنوز سابقہ انداز میں ساکت دیکھ کر رشید نے گہری سانس دریا کے کنارے اتری شام کے سپرد کی اور دال چاول کا لفافہ اس کی سمت بڑھایا۔

”مگر یہ کیا شاداں کی آنکھ سے آنسوؤں کے موتی ٹوٹ کر دریا کی پیاسی بجز زمین پر گرنے لگے۔“

شام کے دھندلکے میں اس کے سلونے چہرے کے دکش خدوخال پر پچھلی اداسی نے اور آنکھوں سے لگی جھڑی نے رشید کا دل بے حد بوجھل کر دیا۔

”شاداں! معاف کر دے چل چھوڑ تو دل

پر مت لے، میں نے یونہی غصہ میں تجھے نبھانے کیا کچھ کہہ دیا۔“ اس کے آنسوؤں سے اس اس کا غصہ جھاگ کی مانند بیٹھ گیا اب اسے خود پر ملامت ہو رہی تھی وہ تڑپ ہی تو گیا تھا کہ اس نے اپنی شاداں کو رلا دیا۔

”نہیں شیدے میں اس لئے نہیں رو رہی۔“ اس نے فوراً بھیکے لہجے میں رندھی ہوئی آواز سے وضاحت دی۔

”پھر کیا ہوا ہے کوئی پریشانی ہے کیا؟“ وہ ٹھک گیا دل میں ہزاروں اندیشے بن بلائے مہمان کی طرح نازل ہونے لگے۔

”چند دن تک ہم یہاں سے کسی انجان سفر اور نئی سمت روانہ ہو جائیں گے کیونکہ سادوں آتے ہی دریا کی بجز زمین پر اپنی محبت کی بارش برسا کر اسے سیراب کر کے لبالب بھر دے گا، لیکن میرے دل کی سرسبز زمین تجھ سے جدا ہو کر ہمیشہ کے لئے بجز ہو جائے گی کہ سادوں میں تیرے وصل کی بارش نہیں ہوگی اور ہم خانہ بدوش یہاں سے کوچ کر چکے ہوں گے۔“

”مجھے بھرتے توقف سے اپنی بات مکمل کر کے وہ ہچک کر رو دی اور خاموشی سے اپنی منزل کی سمت جو سفر راوی کے پانی نے ٹھک کر شاداں کی بات سنی، کناروں سے جڑی گیلی مٹی کچھ اور نم ہونے لگی۔

”تم کیوں رو رہی ہو۔“ چلتے دریا نے لمحہ بھر کے لئے رک کر روٹی ہوئی مٹی سے سوال کیا، ہوا دم سادھے ان کی گفتگو سننے لگی۔

”کیونکہ میں پچھڑنے کے درد سے آشنا ہوں۔“

”اور تم کیوں حیران ہو رہے ہو۔“ اب کے ہوانے ان کی گفتگو میں حصہ لیا اور راوی سے دریافت کرنے لگی۔

”میں سوچ رہا ہوں کہ سیرابی کا موسم بھی کسی کو تشنگی عطا کر سکتا ہے۔“ اس نے اپنی انجھن بیان کی۔

کناروں سے جڑی نم مٹی جون کی شام کی گرم ہوا اور ڈوبتے سورج کی الوادھی کرنوں نے اس اسرار کا مجید جاننے کے لئے بے اختیار سلونی شام کی آنکھوں میں جھانکا تھا اور فضا ٹیکدم ہی جس زندہ ہو گئی۔

یگا یک گہری ہوتی شام دھیرے سے چلتی ہوئی شاداں اور رشید کے مابین آنکھری ہوئی اور راوی کی انجھن ان دونوں کی سوچ کے سپرد کر کے ان کی گفتگو سننے لگی۔

”شاداں تو نے کسے سوچ لیا کہ سیرابی کے موسم میں تیرے دل کی زمین بجز اور تشنہ لب ہو جائے گی۔“ گرد پیش سے بے خبر ایک تک شاداں کو دیکھتے رشید کے ساکت لبوں میں جنبش ہوئی۔

”کیونکہ ایک ہی موسم ہر کسی پر مختلف انداز میں اثر انداز ہوتا ہے کوئی لبالب سیراب ہو جاتا ہے اور کوئی بوند بوند کوترستا ہے جیسے سادوں میں یہ دریا اپنی تشنگی مٹائے گا اور دور کوئی صحرا ایک بوند کو تر سے گا اور میرا دل تیری دید کو۔“ وہ پھر سے رو دی۔

ہوانے بے اختیار گہری تحسین آلود سانس خارج کی اور یہ الفاظ من و عن بپتہ پانیوں تک پہنچا دیے۔

”نہیں شاداں یہ میرا وعدہ ہے کہ تجھے میری جدائی کا درد نہیں سہنا پڑے گا تو نے کیسے سوچ لیا کہ رشید اپنی شاداں کو خود سے جدا ہونے دے گا جنہیں گے تو ساتھ ساتھ مریں گے تو ساتھ ساتھ۔“ اس کے آنسو اپنی پوروں پر چن کر اپنے بیان کے خوبصورت پھول اس کے دامن میں

ڈال کر وہ تیزی سے واپس مڑ گیا کیونکہ جھوپڑیوں کے رہائشی خانہ بدوش مردوں کی واپسی کا وقت شروع ہو چکا تھا۔

”مجھے بہت گہری ہونٹ شام میں کئی جھکیوں میں لائین کی مدہم روشنیاں جھگڑانے لگی تھیں۔“

☆☆☆

کچی آبادی کی حدود میں داخل ہو کر اپنے چھونے سے کچے مکان کے آگے ریزمی کھڑی کر کے رشید نے فائنٹ اس پر دھرا سامان اٹھا کر کچے آگن میں ٹکا دیا اور ریزمی کے پیسے کو زنجیروں میں جکڑ کر زنجیرہ کا ایک سرد دیوار کے اندر نصب لوہے کے کنڈے میں گزار کر تالا لگا دیا۔

”شیدے آج تو نے بڑی دیر کر دی۔“ جنت لی بی نے اپنی کٹھری سے نکل کر بیٹے کو مخاطب کیا۔

”اور یہ کیا تو صبح کے لئے سودا سلف لانا بھی بھول گیا۔“ معمول کے مطابق اس کے ہاتھ میں سودا سلف نہ دیکھ کر اسے تشویش نے آگھیرا۔

”ہاں اماں! بس ذہن سے نکل گیا ابھی لے آتا ہوں۔“ وہ لائے قدموں واپس مڑا۔

”نہیں تو ابھی تھکا ہوا آیا ہے سانس تو لے لے زرا، میں لے آتی ہوں۔“ اس نے پیار سے چکارا۔

”اماں تو رہنے دے دیے بھی میں داتا دربار کے مزار پر حاضری دینے جا رہا ہوں واپسی پر لینا آؤں گا۔“ وہ ہوا کے ٹھوڑے پر سوار باہر نکل گیا۔

مزار پر فاتحہ خوانی کے بعد وہ مزار سے ملحق مسجد میں نماز کی ادائیگی کے لئے اکھڑا ہوا نماز سے فراغت پا کر اس نے اللہ کی بارگاہ میں دو نوافل ادا کیے اور خشوع و خضوع سے شاداں کو

مانگا تھا۔

”اللہ پاک! شاداں کو میرے نصیب میں لکھ دے، میں اس سے بے حد محبت کرتا ہوں میں نے ساتھ جینے مرنے کا جو بیان اس کے آجکل سے باندھا ہے اس میں مجھ سرخوردے مولا یہ بہت ہی مقدس و معتبر جگہ ہے کہ ادھر تیرے بہت ہی خاص بندے کی لحد ہے اور اس جگہ پر تیری رحمت کا بے پناہ نزول ہے مولا مجھ پر بھی اپنی رحمت اپنا کرم فرما، مجھے اپنی رحمت کے خزانے سے فیضیاب کر دے، آمین۔“

”رشید! تو نے بتایا انہیں کہ پھر کہاں لے جانا ہے تیرا رشتہ۔“ رات کو کھانے سے فراغت کے بعد وہ چھوٹے سے آگن میں بان کی کھردری چارپائی پر لیٹا آسمان پر ٹنٹاتے ستارے شمار کر رہا تھا جب برآمدے میں پڑے سوئی کیس کے چولہے پر مچ کے لئے چڑھائی گئی وال کی بڑی سی دپٹی میں جنت بی بی نے کچھ ہلاتے ہوئے بظاہر سرسری انداز میں رشید کو مخاطب کیا۔

وہ جو اپنی سوچوں میں گمن تھا ماں کی بات پر ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اور برآمدے میں جلتے زرد بلب کی مدہم پڑتی ٹھکی ٹھکی روشنی میں ماں کے چہرے پر ٹھکی کے تاثرات تلاشنے جا رہے مگر اس کی توقع کے برعکس وہاں مبہم سی مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔

”اماں تو ناراض نہیں ہوئی۔“ وہ ہنسنے سے استفسار کر بیٹھا۔

”بھلا ہے تو، بھلا اپنے پتر کی خوشی سے بڑھ کر ماں کے لئے کچھ اور ہوتا ہے۔“

”مگر تجھے کیسے علم ہوا کہ کوئی ہے، جہاں رشتہ لے کر جانا ہے۔“ رشید کا سوال سن کر وہ دپٹی پر ڈھکن رکھ کر کے آگن میں چلی آئی اور برآمدے سے چھن چھن کر چھوٹے سے آگن میں

چارپائی پر براجمان رشید کے چہرے کا احاطہ کرتی زرد مدہم سی روشنی کو دیکھا، مدہم سی روشنی میں شیدے کے چہرے پر خوشیوں کے اجالے بھرے واضح نظر آ رہے تھے۔

”کیوں کہ میں تیری ماں ہوں۔“ لمحہ بھر توقف سے جواب دے کر وہ مسکرا دی۔

رشید پہ شادی مرگ طاری ہونے لگی، اس نے بے اختیار آسمان کی سمت نگاہ کر کے اپنی دعاؤں کی قبولیت کی منازل طے ہونے پر شکر منایا اور ماں کے شانے میں چہرہ چھپالیا۔

”چل اب بتا دے کون ہے؟ کہاں رہتی ہے؟“ وہ دپٹی و اشتیاق سے استفسار کرنے لگی اور وہ ماں کے آجکل کا کونا دھیرے سے اپنی انگلیوں میں مروڑتے ہوئے اسے سب بتانے لگا۔

”تیرا دماغ تو نہیں چل گیا، کہاں ہم کچی آبادی میں ٹھانٹھ سے سوئی کیس استعمال کرنے والے اور کہاں وہ لور لور پھرتے خانہ بدوش، ناں تو میں پوچھتی ہوں تجھے اس خانہ بدوش کڑی (لڑکی) کے سوا کوئی اور خاندانی کڑی کیوں نہ بھائی۔“

تمام ماجرا سن کر ماں کا حلق تنک کڑوا ہو گیا اور وہ دھم سے بھرپور انداز میں بیٹے کو ٹاٹنے لگی۔

”اماں! تو اس میں غصہ کرنے والی کون سی گل (بات) ہے۔“ وہ حق دق رہ گیا۔

”ناں تو اور کیا بھنگڑے ڈالوں، رانو کی عذرا کیسی اچھی اور خاندانی لڑکی ہے ایک عرصہ سے جی آبادی میں رہ رہے ہیں وہ لوگ۔“ جنت بی بی نے اپنی منہ بولی بہن کی بیٹی کی شان میں نصیہ گوئی کی۔

”اماں تو شاید بھول گئی ہے پہلے ہم بھی خانہ

بدوش تھے کئی سال پہلے جب ابا زندہ تھا تو ہم نے یہاں اپنی جگہ بنائی تھی اور رفتہ رفتہ دوسروں کی دیکھا دیکھی ہم نے جگہ کو کچے مکان کی صورت دے دی، حالانکہ یہ ساری اراضی گورنمنٹ کی ہے جس پر ہم لوگ بلا شرکت غیرے قبضہ جما کر بیٹھے ہیں۔“ اس نے عمر بھر تو قف سے سلسلہ کلام جوڑا۔

”اور تو..... تو کہتی تھی کہ سب انسان برابر ہوتے ہیں اور آج تو ہی امیر (اپنی دانست میں) ہو کر خانہ بدوش کی تحقیر کر رہی ہے۔“ اس کا لہجہ آخر میں بے حد بوہمل و افسردہ ہو گیا۔

”چل چھوڑ اب مینوں معاف کر دے وہ تو میں یونہی اک (گل) بات کہی تھی تو نے تو دل پر لے لیا۔“ شیدے کی باتوں پر خجالت منانے کو وہ کہہ اٹھی۔

”چل کل میں اپنی دھی شاداں کے لئے اپنے گھروہ جوان پتر (بیٹے) کا رشتہ لے کر جاؤں گی۔“ اس کے چکارنے پر شیدا خوشی سے بے قابو ہو کر اس سے لپٹ گیا۔

☆☆☆

سرخ جوڑے میں ملبوس تیز میک اپ کے شیدے کی سنگت میں وہ راوی کے پل پر بنی سڑک کے کنارے نصب گرل پر ہاتھ ٹکائے دریا کی خالی گود میں دھری ریت پر نگاہ جمائے کھڑی تھی۔

فضا میں سڑک پر سے گزرتی ٹریفک کا شور رقص کر رہا تھا، جون کی آخری شام کی ہوادریا کی سمت سے ہو کر آئی تھی اسی لئے تپش و جس کے احساس کے بجائے عجب سی حلاوت و سردی سے بھرپور تھی اور مسلسل شاداں کے سلونے دلکش چہرے کا طواف کرتی بالوں کی شریہ لٹوں کے ساتھ چھڑ خانی میں مشغول تھی۔

”دیکھا شاداں تو نے، راوی ابھی ا۔ ساون کا منتظر ہے اور انتظار کا روگ مسلسل بدن اس کی پیاس بڑھائے دے رہا ہے۔“ ”ہوں۔“ شاداں نے تاسف بھری نگاہ سمٹ کر نہر کی صورت اختیار کرتے دریا پر ڈالی۔ ”اور ہماری محبت میں وصل کے ساون؟“ ہمیں لبالب سیراب و شاداب کر دیا ہے تو سچ تھی کہ ہر موسم ہر کسی پر انوکھے انداز میں اثر انداز ہوتا ہے لوگ گرمی کا ردنا روٹے ہیں اور ہم سا، منا رہے ہیں۔“ اس نے بھرپور نگاہوں۔ شاداں کے حسین مونہے کھڑے کو دیکھا جاندار ہلکی ہنسنے لگا شاداں نے بھی اپنے شوہ بات سے اتفاق کرتے ہوئے مکان بھیر دی ”کیا ہے اتنی سہانی شام میں تو اتنی کہ کیوں ہے؟ ابا یاد آ رہا ہے؟“

اسے مسلسل تاحد نظر پھیلی بجز زمین پر جمائے دیکھ کر اس نے استفسار کیا، خانہ بدوش نے ٹھکانوں کی جانب کوچ کر چکے تھے اب وہ ریتیلی زمین پر محض خاک آلود جلی ہوئی ٹکڑوں کے ٹکڑے کہیں کہیں بکھرے ہوئے نظر آ رہے تھے۔

”ابے نے کہا تو ہے کہ نئے ٹھکانے کر ملنے آتا رہے گا۔“ اس کی ہنوز خاموش آنکھوں میں چپکٹی نمی پر گرل پر رکھے اس خردلی انگلیوں والے ہاتھ پر اپنا دایاں ہاتھ دلا سہ دیا۔

”رشید پانے کی خوشی کے ساتھ کھو۔ خوف کیوں بے چین رکھتا ہے؟“ اس کے سے سوال پر شیدے نے تعجب سے اس اُنجانے خوف کے حصار میں گھرا مکھڑا ملاحظہ ”پتا نہیں کیا کہہ رہی ہے میرے تو پلے نہیں پڑا۔“ وہ اس سے محبت بھری خو

باتیں کرنا چاہ رہا تھا اور وہ نجانے کیوں اداسی سے فلسفہ بکھار رہی تھی اسے جھلاٹ ہونے لگی۔  
 ”شیدے نے تیری سنگت میں زندگی بے حد خوبصورت لگتی ہے جیسے راوی پر جھکا یہ آسمان کسی دلکش خواب کی مانند لگتا ہے جسے تیری سنگت نے یہ دلکشی عطا کی ہے، نجانے کیوں اک عجیب سا خوف دامن گیر ہے کہ کہیں میری آنکھ کھل گئی تو یہ سہانا خواب ٹوٹ جائے گا، مگر کمریزہ ریزہ ہو جائے گا۔“ کھوئے کھوئے انداز میں اس کا کہا گیا ایک ایک لفظ رشید نے ہمہ تن گوش ہو کر سماعتوں میں اٹھایا۔

”میرا ساتھ کوئی خواب نہیں حقیقت ہے اور نونٹے خواب ہیں جبکہ حقیقت تو اکل ہوتی ہے اپنا آپ تسلیم کر داتی ہے تو بھی اس فضول کے خوف سے باہر نکل آ۔“ وہ بھرپور تہتہ لگا کر اسے دیکھنے لگا۔  
 ”جھلی نہ ہو تو۔“ اس کی بات پر وہ ہولے سے مسکرا دی۔

”پھر بھی پتا نہیں کیوں میرا دل چاہتا ہے کہ میں تیرا سایہ بن کر تیرے ساتھ رہوں، تجھے کہیں کھونے نہ دوں، خود سے جدا نہ ہونے دوں۔“

”نہیں سایہ تو اندھیرے میں ساتھ چھوڑ دیتا ہے شاداں، تو زندگی بن کر میرے ساتھ رفتی ہے جو صرف موت کے وقت تاٹوٹتی ہے۔“ وہ یکدم سنجیدہ ہو گیا۔

”ہائے رب سوہنا تجھے لمبی حیات دے، ہم ساتھ جنیں گے ساتھ مریں گے تو نے وعدہ کیا تھا۔“ اس کے لبوں پر بے ساختہ اپنا خردیٹ اٹھایوں والا ہاتھ رکھ کر وہ نروٹھے پن سے گویا ہوئی۔

”تو پھر اتنی دیر سے کیوں فضول کی راہی

الاپ رہی ہے؟“

”وہ تو میں قسمت کی مہربانی پر بے یقین ہوں۔“ وہ یکدم ہلکھلا اٹھی اور فضا میں جیسے ڈھیروں ڈھیر چاندی کی گھنٹیاں بجائیں، وہ مہبوت سا اسے دیکھنے لگا۔

”چل گھر چلیں کافی دیر ہو گئی ہے اماں راہ دیکھ رہی ہوگی۔“ اس کی نگاہوں سے بچنے کی کوشش میں شاداں نے اس کا دھیان اترتی شام کی جانب گامزن کرنا چاہا اور قدرے کامیاب رہی کہ اب شیدے نے اس کی معیت میں واپسی کے راستے پر قدم بڑھا دیئے تھے۔

☆☆☆

فضا کے جس اور واڈا کی بے وقت کی مہربانی پر جنت بی بی اپنی کونھری سے بلبل کر باہر نکل آئی۔

”نہ ویلا (وقت) دیکھتے ہیں نہ طبیعت کا لحاظ کرتے ہیں سارا دن لائٹ بند کرتے رہتے ہیں۔“

کچے آٹھن میں ہان کی کھروری چارپائی اپنے خفجہ و کمزور ہاتھوں سے چادر بچھانے کے دوران اس نے واڈا کی شان میں قصیدہ پڑھا، کل سے اسے ہلکا سا ٹیپر پچر ہو رہا تھا اور دل پر عجب سی گھبراہٹ طاری تھی وہ مذہال سے انداز میں چارپائی پر ڈھبے گئی۔

اسی بل داخل دروازے کا میلا بوسیدہ پردہ ہٹا کر شاداں نے رشید کی کسی بات پر مسکراتے ہوئے اندر قدم رکھا اور جنت بی بی کو سامنے پا کر سلام بجا دیا جس کا جواب اس نے قدرے منہ پھلا کر دیا۔

”کار (گھر) کی یاد آگئی سارا دن خانہ بدوشوں کی طرح گلیوں کی خاک چھان کر ٹھنڈ پے گئی کیجیے میں۔“

”پیار ماں کی کوئی فکر نہیں۔“ اس کا مخاطب رشید تھا مگر درد پر وہ شاداں کو سنا رہی تھی۔

”بس اماں پہلے شاداں کی سہیلی کے کار (گھر) گئے واپسی پر راوی نکل گئے نیم (ٹائم) کا پتا ہی نہیں چلا۔“ شیدے نے قدرے بجل ہو کر بیضاحت دی، جبکہ شاداں جلدی سے گاس میں جھنجھن بنا کر لے آئی۔

”ویاہ (شادی) کو مہینہ ہونے کو آیا بس اب بند کر یہ سیر سپاٹے، کل سے ریزمی شام تک لگا نا جب دیکھو دوپہر کو آ جاتا ہے تو، ریزمی اس نئے ملازم کے سر پر چھوڑ کر اور اس کو بھی فارغ کر خواہ مخواہ نکالنے پرے گی۔“ جنت بی بی نے جھنجھن کا گھونٹ بھر کر اگلی پچھلی تمام بھڑاس نکال دی شاداں اماں کو دست باندھی سے ہوا جھلنے میں مگن ہو گئی اور رشید نئی نو بیلی ٹیکے کے سامنے عزت افزائی پر بغلیں جھانکنے لگا۔

”اماں! بالے (ملازم لڑکے کا نام) کو تو عارضی طور پر اس لئے رکھا تھا تا کہ تھوڑے دن سیر سپاٹے ہو جائیں پھر رب جانے زندگی مہلت دے نہ دے۔“

”ہائے دے اللہ تجھے میری حیات بھی لگا دے، کیسی اول نول باتیں کر رہا ہے۔“ جنت بی بی دل ہی تو مگنی۔

”اماں میں تو ایسے ہی ایک بات کہہ رہا تھا کیونکہ زندگی چھوٹی سی اور ناقابلِ بھروسہ چیز ہے۔“

”شیدے کیوں ایسی باتیں کر کے ہم دونوں کا دل دہلا رہا ہے۔“ شاداں نے خشکی سے اسے ٹوک دیا وہ مسکرا کر کل کے لئے سودا سلف خریدنے کے لئے باہر نکل آیا۔

اگلے دن شام ڈھلے وہ گھر لوٹا اور ریزمی پر سے خالی دیکھنے اتارنے لگے، اسے سارا دن کے

بعد اپنے روبرو دیکھ کر شاداں کا چہرہ جھگکانے لگا اور وہ آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ بٹانے لگی۔

”اماں کئی دن سے میرا دل بہت گھبرا رہا ہے، سچ بخش علی بھویری کے مزار پر حاضری دینے چلیں۔“ جلدی جلدی کام نمٹا کر وہ ساس کے پاس اجازت لینے چلی آئی۔

”لے تو نے جانا تھا تو فجر ویلے چلی جاتی اب تو کتنی رات ہو گئی ہے۔“ وہ بڑبڑاتی۔

”اماں میں نے شیدے سے کہا تھا پر اس نے کہا کہ تھا کہ شام کو چلیں گے اب سارے کام نمٹاتے ہوئے عشاء ہو گئی ہے۔“

”مگر آج تو جمعرات ہے خوب رونق میلا لگا ہو گا رات ہے تو کیا، چل اماں تو بھی۔“ شیدے نے آکر اس کی بات میں ٹکرا لگایا۔

”پتر تم دونوں چلے جاؤ بخار اتارنے کے بعد مجھے بڑی کمزوری محسوس ہو رہی ہے داتا صاحب کو میرا سلام دینا۔“

اپنے عقیدے کے مطابق اس نے ہدایت دی شیدا اُس پڑا۔

داتا دربار کے مزار پر حاضری سے فراغت کے بعد رشید نے شاداں کو مزار کے دائیں طرف مڑتی سڑک پر سچے چوڑیوں و زیورات کے اسٹال پر سے لاکٹ اور بندے خرید کر دیئے۔

”ہائے کتنے سوہنے ہیں۔“ وہ نہال ہو گئی۔  
 ”اور کچھ لینا ہے تو بتا۔“ رشید نے فراخ دلی دکھائی۔

”نہیں بس اب چلتے ہیں اماں راہ دیکھ رہی ہوگی۔“ شاداں کو لگتا لاحق ہوئی۔

وہ سر ہلا کر شاداں کے سنگ چنگ چپی رکشے کی سمت بڑھ گیا جس کا ڈرائیور بندر وڈنشی ہسپتال کی آواز سن لگا رہا تھا، یہ چنگ چپی رکشے بندر وڈنشی ہسپتال تک جاتے تھے وہاں

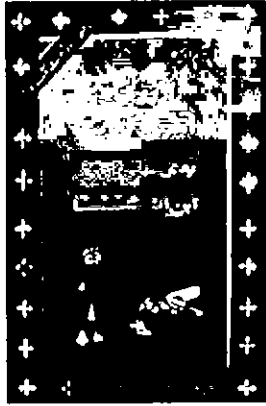


## شگفتہ شگفتہ رواں دواں



## لارو دوگی آخری کتاب

طنز و مزاح



لاہور اکیڈمی

کلی منزل محل، مین میڈین، آریٹ 207 مرکز رورڈ اور داتا دربار  
فون: 042-37310797, 042-37321690

”رب خیر کرے اتنی دیر تو کدی دی (کبھی بھی) نہیں ہوئی۔“ پونے بارہ کے قریب وہ اندھیرے کی چادر میں اپنے کچے آنکھن میں پھٹی چار پائی سے اٹھ کر دروازے تک آئی اور بند کواڑ کھول کر گلی میں جھانکا۔

رات کے دلدوز سناٹے میں مدہم سی چاندنی میں نظر آتے راستے پر کسی ذی روح کا نام و نشان تک نہ تھا، گھبراہٹ، ہول، فکر مندی سے مغلوب ہو کر اس نے بغل والے گھر کا دروازہ دھڑ دھڑایا۔

”کون ہے؟“ اندر سے نیند میں ڈوبی آواز ابھری۔

”نوید پتر میں ہوں دروازہ کھول۔“ دروازہ اٹکے ہی لمحہ جھٹ سے کھل گیا۔

”کیا ہوا اماں خیر تو ہے۔“ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑتی دیکھ کر نوید پریشان ہو گیا۔

”پتر ذرا اپنے موبائل سے رشید کو فون کر کے پوچھ کہ وہ دونوں اب تک کیوں نہیں آئے۔“

”کہاں گئے تھے؟“ نمبر ڈائل کرتے ہوئے سرسری سا استفسار کیا۔

”داتا دربار۔“

”کیا؟“

”کیوں پتر کیا ہوا؟“ نوید کو یکدم حواس باختہ دیکھ کر وہ ٹھٹھک گئی۔

”اماں لوہاری میں میری پھپھی رہتی ہے گھنٹہ بھر پہلے اس کا فون آیا تھا اس نے بتایا کہ داتا دربار میں تین خودکش دھماکے ہوئے ہیں۔“

”اندہ کر کے سب خیر ہو رشید افون کیوں نہیں اٹھا رہا۔“ یونی بولتے بولتے اس کی نگاہ چکر اکر گرئی جنت بی بی پر پڑی۔

”اماں... اماں...“ اس نے فوراً سے پیتر

ہوا سا کن تھی، فضا میں ارد گرد کانوں پر نیپ ریکارڈ میں جتنی تو ایلوں کی بازگشت تھی۔

”مجھے ہجوم سے ڈر لگ رہا ہے۔“

”ارے یہ تو معمول کی چٹل پہل ہے تیرے ساتھ جب میں پھٹی بار آیا تھا تو اس سے کہیں زیادہ بھیڑ تھی۔“ وہ ہنسنے لگا۔

”مگر آج نجانے کیوں مجھے بہت گھبراہٹ ہو رہی ہے دل ہول رہا ہے۔“

”ہا ہا ہا، کیسی بھکی بھکی باتیں کر رہی تو، میری تو سمجھ سے باہر ہے جھلی نہ ہو تو۔“ اب وہ دونوں برآمدہ عبور کر کے وضو خانے میں داخل ہو چکے تھے۔

”بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ آج یہیں رہ جاتے ہیں۔“ شیدے نے پانی کی بوتل بھرتے ہوئے شرارت سے اسے ملاحظہ کیا۔

”چل جلدی کر رکشہ والا انتظار کر رہا...“

شاداں کی بات ادھوری رہ گئی نجانے کیا ہوا تھا شاید قیامت آگئی تھی۔

کانوں کے پردے بھاڑنے والی آواز کے ساتھ ہی ان کے وجود ہوا میں معلق ہو گئے۔

☆☆☆

جنت بی بی کو رہ کر غصہ آ رہا تھا۔

”لو کوئی کل ہوئی بھلا، میں کار (گھر) میں بیمار پڑی ہوں مگر ناں جی جونوں (بہو) اور پتر کو کوئی ہوش فکر ہوا لینے دو آج چٹلی طرح خبر لوں گی۔“ وہ خود کھائی کے انداز میں بڑبڑائی۔

رفتہ رفتہ اس کا غصہ فگور پریشانی میں ڈھلتا گیا گھڑی کی سونیاں جوں جوں گیارہ کا ہندسہ عبور کر رہی تھیں اس کی فکر میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

”بس آتے ہی ہوں گے۔“ وہ خود کو دلاسا دیتی۔

سے بند روڈ کراس کر کے کبھی آبادی میں فٹ کی پیدل مسافت تھی۔

رکشہ میں ابھی اور سوار یوں کی سیٹیں خالی تھیں وہ دونوں بیٹھ کر سیٹیں پر ہونے کا انتظار کرنے لگے۔

”تو نے اماں کے لئے دربار کے چشمے کے پیٹھے پانی کی بوتل بھری ہے۔“

”ہاں۔“ رشید کے استفسار پر شاداں نے سر ہلا کر حیلے سے پلاسٹک کی چھوٹی سی بوتل نکال کر اسے دکھائی۔

”لا رے ذرا بہت پیاس لگ رہی ہے۔“ وہ غنا غٹ پانی پی گیا۔

”اچھا تو ادھر پیٹھے میں بوتل میں پانی بھر کر لاتا ہوں۔“

”نہیں مجھے چھوڑ کر مت جا۔“ اس نے بے ساختہ رشید کا ہاتھ تھام لیا۔

”چل آ جا تو بھی۔“

”او بھائی کہاں چلے بس ابھی اور سواریاں مل جائیں گی ذرا ٹھہرو۔“ رکشہ ڈرائیور اپنی دو سواریاں واپس اترتے دیکھ کر بوکھلا گیا۔

”ابھی آتے ہیں پانی لینا ہے دربار کا۔“ رشید اسے مطمئن کرنا مردانہ گیٹ کی سمت بڑھ گیا۔

”او تو کہاں ساتھ ساتھ گئی آ رہی ہے ادھر کھڑی ہو، میں یوں گیا اور یوں آیا۔“ شاداں کو اپنے ساتھ مردانہ حصے میں آتے دیکھ کر رشید نے ٹوک دیا۔

”نہیں میں تیرے ساتھ جاؤں گی۔“ وہ اس کے ساتھ سبز حیاں چڑھنے لگی۔

”کیوں؟“ شیدے نے لمحہ بھر کے لئے ٹھہر کر اس کے سلوٹے مگھڑے پر اک نگاہ ڈالی اور پھر اس کے سنگ قدم سے قدم ملانے لگا۔

اس کا بے جان ہو کر گناہ و جود تھا ملایا۔  
 ہوش آیا تو وہ اپنے جھوٹے سے کمرے کی  
 پرانی مسبری پر موجود تھی جبکہ پورا کمرہ محلے کی  
 عورتوں سے کھینچ بھرا ہوا تھا، وہ خالی الفنی کی  
 کیفیت میں انہیں دیکھنے لگی۔  
 ”شکر ہے آپا تجھے ہوش آیا، پورے دو دن  
 تو بے ہوش رہی ہے۔“ لویہ کی ماں نے اسے ترم  
 بھری نگاہ سے دیکھ کر شکر کا کلمہ پڑھا۔  
 ”رشد شاداں۔“ وہ بے اختیار انہیں  
 پکارنے لگی۔  
 ”ہائے اماں جی کیا بتائیں محلے کے  
 منڈوں نے تمام ہسپتال چھان مارے نہ تو  
 رضیوں میں کہیں نظر آئے نہ ہی لائیں ملیں وجود  
 کے پرچے ہوا میں نجانے کہاں کہاں اڑ گئے۔“  
 ایک پڑوسن آبدیدہ ہو کر بتانے لگی۔  
 ”نہیں جھوٹ ہے یہ سب جھوٹ کہتے  
 ہو۔“ وہ سکتے لگی۔  
 ”حوصلہ رکھو محلے کے امام صاحب نے  
 غائبانہ نماز جنازہ مسجد میں ادا کر دالی ہے۔“ کسی  
 نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔  
 ”تم کیوں میرے بچوں کو مارنے پر تلے ہو  
 اگر وہ مر گئے تو دکھاؤ کہاں ہے جسد خاکی۔“ وہ  
 چلا اٹھی۔  
 ”ہاں نہیں ہے ناں کیونکہ میرے شیدے  
 اور شاداں کو کچھ نہیں ہوا وہ خانہ بدوش لڑکی اسے  
 لے کر کسی اور ٹھکانے پر نکل گئی، میں خود ڈھونڈ کر  
 لاؤں گی کھینچائی کروں گی دونوں کی۔“ اس کی  
 باتوں پر دلا سے دیتی عورتیں ضبط کھو کر رو پڑیں۔  
 ”ماں کی فکر نہیں سیر سائے میں لگے ہوں  
 گے دربار کے بہانے نکل گئے۔“ تمام دن وہ  
 ساکت سی خود کلائی کرنے لگتی، کبھی روٹی، کبھی  
 پنس پڑتی۔

”جنت سینکڑوں لوگوں کے چیتوے ہو  
 گئے دھجیاں بکھر گئیں خون کے دریا میں بہہ گئے  
 جن میں تیرے بچے بھی شامل تھے روئے جی بھر  
 کر۔“ اس کی ہم عمر ایک خاتون نے اسے تلخ  
 حقیقت سے روشناس کروا کر جھجھوڑا مگر اس کی  
 کیفیت ہنوز برقرار رہی۔

☆☆☆

رات کی خاموش ویرانی میں وہ چپکے سے بند  
 کواڑ کھول کر شیدے اور شاداں کو تلاشنے نکل  
 کھڑی ہوئی، اس کے بعد سے جنت ہی بی جگی  
 آبادی میں کسی کو نظر نہیں آئی ہاں بکھرے ہالوں  
 اور میلے چپکے کپڑوں والی ایک بوڑھی مائی  
 اندرون شہر کی گلیوں میں گزشتہ دو سالوں سے  
 چکرائی پھرتی ہے۔

زندگی کے پر خار راستوں پر برہنہ پا چلتے  
 ہوئے گرد آلود بکھرے ہالوں اور بوسیدہ میلے  
 لباس والی وہ بڑھیا اس دن اچانک ایک ہل کے  
 لئے ساکت ہو گئی جب سڑک کے کنارے بنے  
 اک چھوٹے سے چھپر ہوٹل میں لگے ٹی دی سے  
 آتی آوازوں نے اس کی سماعتوں کو لمحہ بھر کے  
 لئے اپنے حصار میں مقید کر لیا۔

اور اگلے ہی ہل یکدم وہ سڑک پر بڑے پتھر  
 اٹھا اٹھا کر ہوٹل میں بیٹھے گاؤں کی سمت  
 اچھالنے لگی، کسی بھی نیوز چینل پر حالیہ دھماکے کی  
 تازہ ترین نوٹیج دکھائی جا رہی تھی اور ہوٹل میں  
 موجود لوگ بے نیازی دے جی سے کھانا کھانے  
 میں مشغول تھے ان کے لئے اب یہ سب معمول  
 کی باتیں تھیں۔

مگر اس خطی بڑھیا کے پیچھے گئے پتھروں  
 سے ایکدم وہاں پانچل کی گئی۔  
 اس مائی کے دماغ میں نیوز کا سڑک کی آواز کی  
 بازگشت ایک تو اتر سے گونج رہی تھی۔

”پشاور میں تین دھماکے۔“ اور ٹی دی  
 سکرین پر دھماکوں کی متاثرہ جگہوں کی نوٹیج دکھائی  
 جا رہی تھی۔

”میرے بچوں کو مار کر تم لوگ یہاں مزے  
 کر رہے ہو۔“ وہ پتھر مارتے ہوئے چلا رہی  
 تھی۔

”ارے او پاگل مائی ہوش کر کسی کی جان  
 لے گی کیا؟“ ہوٹل کے گاؤں میں سے دو  
 اشخاص پتھروں سے بچ بچاؤ کرتے اس کے سر پر  
 پہنچ گئے اور اس کے ہاتھوں سے پتھر چھین کر دور  
 پھینک دیئے۔

”کتنی بہو نہیں کتنے بیٹے مارو گے اور کتنے  
 پسماندگان کو زندہ درگور کرو گے؟ کتنا لہو چاہیے تم  
 لوگوں کو بولو۔“ اس نے دیوانگی کے عالم میں ان  
 دونوں کا گریبان پکڑ کر جھجھوڑا ڈالا۔

”چل اماں اپنا رستہ نا۔“ اس اچانک  
 افتاد پر دونوں نے مذاحمت کی مگر گرفت مضبوط  
 تھی، آن واحد میں وہاں لوگوں کا اک جم غفیر اکٹھا  
 ہو گیا۔

”چھوڑو جانے دو مائی پاگل ہے۔“ کئی  
 آوازیں ایک ساتھ گونجی تھیں دو تین آدمیوں نے  
 بچ بچاؤ کر دیا اگر اسے ایک سمت میں دھکیل دیا۔  
 ”خون بہانا بند کرو، خون بہانا بند کرو۔“ وہ  
 مسلسل ایک جملے کی تکرار کرتے ہوئے عالم  
 وحشت میں اپنے بال نوچتی دربار کی سمت نکل  
 آئی۔

ہوا بے حد بوجھل قدموں سے چلنے لگی جبکہ  
 آسمان کا چہرہ بے گناہوں کا لہو بہنے پر ضبط کی  
 شدت سے سرخ پڑنے لگا۔  
 ”خون بہانا بند کرو۔“ تکرار مسلسل کے  
 دوران وہ تیزی سے دربار کی سیڑھیاں عبور کرتی  
 ہوئی لڑکھڑا کر وہیں گر پڑی۔

اسی اثناء میں اس کی نگاہ افق پر چھائی لالی  
 کی سمت اٹھی تھی تو اس نے بے حد کھوئے کھوئے  
 انداز میں فلک کو مخاطب کیا۔

”یہ کس نے ہم سے پھر لہو کا خراج مانگا۔“  
 اس بوڑھی جھریوں زدہ چہرے والی ان  
 پڑھ مائی نے یہ شعر نجانے کہاں سے سن کر اپنے  
 حافظے میں محفوظ کر لیا تھا جو لاشعور کے درپچوں  
 سے سفر کرتا ہوا شعور میں آن وارد ہوا اور بے  
 ساختہ زبان پر پہنچ گیا تھا۔

”یہ کس نے ہم سے پھر لہو کا خراج مانگا  
 اچھی تو سوئے تھے ہم قتل کو سرخرو کر کے  
 آسمان کی بدستور خاموشی پر وہ ہتے ہتے ہتے  
 شدتوں سے رو پڑی۔

”ابھی تو سوئے تھے ہم، ابھی تو سوئے  
 تھے۔“ وہ زور دشور سے سسکیاں بھرتے ہوئے  
 تکرار مسلسل کرنے لگی، شام نے بے اختیار  
 سسکاری بھری اور رات کی آغوش میں چھینے کی  
 سعی میں مگن ہو گئی جبکہ ہوا دیر تک راستوں پر گرد  
 اڑاتی رہی۔

☆☆☆

ہمارے طبعات

قواعد و نصاب  
 انتخاب نام مقب  
 مانتہ جت  
 نیاحتہ  
 تمام درجے  
 رام درجہ تک  
 اسلام کھانا کھانا کھانا  
 ہوا و دکان کھانا  
 لاہور، پاکستان  
 ۲۰۵۰ سرکولر روٹ - لاہور

”کیلی۔“ زبیدہ نے تڑپ کر اسے سینے میں چھپا لیا، دونوں سکے لگیں۔  
 ”نہ رو میری بچی، میری پیاری بیٹی، میرے ساتھ کھیلو، مجھے اپنی سہیلی سمجھو۔“ زبیدہ اس کا دل بہلائی، مگر رانیہ اندر ہی اندر تنہائی کا شکار رہتی،

”بیٹا اللہ کی مرضی ہوتی ہے۔“ وہ اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرنے لگیں۔  
 ”مگر ماں، نبیرہ اور دعا کے تو دو بھائی، دو بہنیں ہیں، وہ ان سے کھیلتے ہیں، لڑتے ہیں، چیزیں چھپاتے ہیں اور مزا کرتے ہیں اور میں

آرزو تھی، ان سب اشیاء کی ضرورت ہیں، نہیں اس کے اندر سے کوئی چنچا۔  
 یکا یک وہ چہرہ ہاتھوں میں چھپا کر زارو قطار رو پڑی اور کہیں دور تھکی کی بچی کی آواز اسے ماضی کے جمر دکوں میں دھکیل گئی۔

☆☆☆

رانیہ اپنے ماں باپ کے ساتھ چھوٹے سے گھر میں سکون سے رہ رہی تھی، زبیدہ اور فاروق کی شادی سے چار برس بعد پیدا ہونے والی رانیہ، واقعی رانیوں جیسی صورت لے کر آئی تھی، زبیدہ اور فاروق دل سے دعا کرتے کہ اس کی قسمت بھی رانیوں جیسی ہو، دونوں اسے دیکھ کر چیتے تھے، اس کے بعد زبیدہ کو دوبار ماں بننے کی نوید ملی، مگر مشیت الہیہ کوئی بچہ دنیا میں نہ آسکا۔  
 یوں رانیہ ان کی اکلونی اولاد سمجھری، دونوں اس کی تربیت میں لگ گئے، خود رانیہ فطرتاً اچھی عادات کی مالک تھی، نہ تنگ کرتی نہ فالتو فرمائش، مگر ایک روز جب وہ تیسری کلاس میں تھی، زبیدہ کے سامنے عجب انداز میں بولی۔

”اماں! میرے بہن بھائی کیوں نہیں ہیں۔“ وہ اکیلے پن سے گھبرا کر بولی تھی، کھلونوں سے کب تک دل بہلائی، کارٹونز بھی کب تک ساتھ دیتے، اسے تو ایک جتنا چاہتا بھائی یا بہن چاہیے تھا، جن کے ساتھ کھیلتی، لڑتی جھگڑتی مستیاں کرتی، تو دل ہنستا، شور شرابا ہوتا، تو سکون میسر آتا، زبیدہ کا چہرہ لمحہ بھر کو تاریک ہوا، پھر مسکرا کر اسے پیاد کرتے ہوئے بولیں۔

ہاتھوں سے سر تھامے، چکراتے دماغ کو قابو کرنے کی ناکام سعی میں وہ سرگرداں تھی، بھیگی آنکھوں سے اپنا کھڑتا وجود، دیکھتی اور پھر ہچکیوں سے رو پڑتی۔  
 اس کے گرد قیمتی ملبوسات، پارچہ جات، برانڈڈ جوتے، نفیس جیولری، پرفیومز، جانے کیا کہا تھا اور کیا نہ تھا ان لفافوں میں اس میں کھول کر دیکھنے کی سکت بھی نہ تھی، جہازی سائز بستر پر وہ سامان کے درمیان بیٹھی تھی، کسی چیز کو ہاتھ نہ لگایا تھا۔

دینے والے اسے دے کر جا چکے تھے، گویا فرائض سے سبکدوش ہو گئے تھے اپنے سینے، یونہی اک اس نے پورے کمرے میں دوڑائی، کمرہ کیا تھا، گویا ایک محل تھا، قیمتی قالین، بیش قیمت فرنیچر، دیواروں پر لگی لاکھوں کی پینٹنگز، ڈریسنگ ٹیبل پر جہاں بھر کا سامان آرائش و زیبائش، دیو قامت الماری میں دنیا بھر کے قیمتی ملبوسات، جوتے، جریساں، ذرا فاصلے پر مزیدار اور مزید چیزوں سے بھرا ریفریجریٹر، غیر ملکی فرحت بخش مشروبات، چائینس، فردوس، غرضیکہ کیا نہیں تھا، جو کہ نہایت آسودہ زندگی گزارنے کے لئے بہت تھا، نوکر چاکر الگ، جو لمحہ بھر میں اس کا حکم بجا لانے کو تیار تھے۔

مگر یہ کیا..... وہ پھر بھی رو رہی تھی، سسک رہی تھی، اسے ان سب اشیاء کی چنداں طلب نہ تھی، نہ ان مادی چیزوں سے اسے من خوش ہوتا تھا، ایسے تو طلب تھی، طلب کیا تھی، کس کی اب



شدت سے یہ خواہش اس کے اندر جڑ پکڑے بیٹھی تھی، کہ وہ شدید تنہائی اور اکیلے پن کا شکار ہے، پھر کتابوں کو اپنا سہلی بنا لیا، گھلونوں سے، نڈی کی بھر سے دل بہلاتی۔

مگر یہ سب وقتی تھا، زبیدہ اور فاروق کے پاس اس کی تنہائی کا کوئی حل نہ تھا، سوائے دعا کے، وہ اپنے طور پر اسے ہر دم ساتھ رکھتے۔

یوں دیکھتے دیکھتے وہ دسویں جماعت پاس کر گئی اور کالج میں آ گئی، ایک عجیب سنجیدگی اس کے حسین چہرے کا احاطہ کیے ہوئے تھی، حسن کی دولت بھی رب نے فیاضی سے عطا کی تھی، ذہین تھی، حسین تھی، سہیلیاں بھی بن گئیں، مگر جو خواہش حسرت بن چکی تھی، اس کا کوئی مداوا نہ تھا، دل میں دے آرزو کے بیچ تادور درخت بن گئی تھے، یہاں تک کہ وہ تنہائی میں خود کلامی کرتی رہتی، گڑبڑ اور گڈے کا بھائی بہن بنا کر ان سے باتیں کرتی۔

رات کو دونوں کو اپنے ہمراہ سلاتی، ان کی بڑی بہن بن کر انہیں سمجھاتی، اچھے برے کی تیز سیکھاتی اور اپنے نا آسودہ جذبوں کی تسکین کرتی رہتی۔

زبیدہ اور فاروق اس کی عادتوں اور حرکتوں سے واقف تھے، اسے منع نہ کرتے کہ کہیں نفسیاتی مسئلہ نہ پیدا ہوئے، بلکہ دونوں مسکرا دیتے، چلو اس کے اندر کا غبار شاید اسی طرح ہی نکل جائے۔

بارہ جماعتیں پاس کر لیں تو دونوں کو اس کے رشتے کی فکر لگ گئی۔

”آپ ہی کسی سے کہیں ناں۔“ زبیدہ فاروق سے کہتی، تو وہ گہری فکر مند سوچ میں غرق ہو جاتے، تو کیا اکلوتی بیٹی سے جدائی کا دقت آنے کو ہے، یہ لمحے ان کے کہ سوا ان روح

ہوتے۔

خود زبیدہ کی آنکھیں بھی نم ہو جاتیں، مگر یہ قانون فطرت تھا، کون بیٹی کو گھر میں بٹھا پایا ہے، سبھی نے اسے رخصت کرنا ہوتا ہے دل پہ پھر رکھ کر۔

زبیدہ کو یقین تھا کہ ان کی رانیہ کے لئے کوئی شہزادہ ہی آئے گا، رانیہ اترے گا، مگر ان جیسے متوسط طبقے کے لوگوں کے گھر راجاؤں اور شہزادوں کا کیا کام، زبیدہ اپنی سوچ کی خود ہی تردید کر ڈالتیں اور پھر بھی زیر لب دعائیں کرتیں، اس پر چھوٹک مار کر اسے روشن مستقبل اور نصیب کی دعا کرتیں۔

☆☆☆

ایک دور رشتے جاننے والوں کے توسط سے آئے عام سے تھے، کچھ بے حد امیر کبیر، بات بن کر نہ دے رہی تھی، چھ ماہ اسی تک ددو میں صرف ہو گئے، زبیدہ زیادہ پریشان رہنے لگیں تھیں، جبکہ فاروق تسلیاں دیتے اور اللہ پر بھروسے کی تلقین کرتے پھر اچانک ایک دن رانیہ حیران رہ گئی، جب اس کی ہم جماعت ٹوبیہ اپنے بھائی اسفر آئندی کا رشتہ لے کر آ گئی، اپنی والدہ کے ساتھ۔

”پتہ ہے رانیہ بھانے کچھ دن پہلے ہی جنہیں دیکھا ہے، جب مجھے کالج سے لینے آئے تھے، اب ان کی ضد ہے کہ انہوں نے بس تم سے ہی شادی کرنی ہے۔“ ٹوبیہ کے انکشاف پر وہ ہراساں ہو کر رہ گئی۔

”اتنے امیر لوگ اور ہم؟“ وہ الجھ کر سوچنے لگی۔

ٹوبیہ کی والدہ سیدھی سادھی محبت کرنے والی خاتون تھیں، انہوں نے پہلی ہی ملاقات میں رانیہ کو پسند کرنے لال دوپٹہ اوڑھا کر بہت

سارے پیسے اس کے ہاتھ پہ رکھ دیئے، گویا رشتہ پکا کر کے مہر ثبت کر دی، تو زبیدہ فوراً بولیں۔

”بہن جی ہمیں سوچنے کا موقع دیں ابھی۔“ اس پر وہ نرم مسکراہٹ لئے بولیں۔

”بے شک آپ کا حق ہے، آپ اس جھوٹے ہمارے گھر آئیں، اسفر سے ملیں ہمارا گھر دیکھیں، آپ انکار نہ کر سکیں گی۔“ زبیدہ ان کے جواب پر لا جواب ہو کر رہ گئیں۔

پھر در بھی نہ لگی، ابھی پڑھائی جاری تھی کہ رانیہ کے ذہن بننے کی تیاریاں ہونے لگیں، ہماری بیٹی بڑی نصیبوں والی ہے، ایسا شاندار رشتہ، فاروق رب کا شکر ادا کرتے نہ تھکتے تھے، رانیہ خود کو مسرتوں کے جھولے پہ جموت محسوس کرتی تھی۔

اب اس کے رات دن اسفر کے خوابوں میں بسر ہونے لگ تھے، اس نے بس اسفر کی تصویر دیکھی تھی، کیسا شاندار بندہ تھا، خوب رو، پڑھا لکھا اور دولت مند، رانیہ اپنی قسمت پر جتنا ناز کرتی کم تھا۔

ماں باپ خوش خوشی جہیز بنانے میں لگ گئے، حالانکہ اسفر کی والدہ نے سختی سے کچھ بھی لینے سے انکار کیا تھا، وہ مگر کیسے اسے بڑے گھر میں خالی ہاتھ رخصت کرتے، آخر کار وہ دن بھی آ گیا جب وہ اسفر کی بن گئی، روشنی اور نور کی بارات رانیہ کے لئے کھکشاں سے اتری تھی۔

جس نے دیکھا حیران رہ گیا، رانیہ کی شکل و صورت کی طرح قسمت بھی خوبصورت نکلی، انکسوں بھری دعاؤں کے سائے تھے وہ رخصت ہوئی اور ”معتبر محبت“ میں آ گئی، دل ہی دل میں خدا کا شکر کرتی، وہ بچے سجائے کمرے میں پہنچا دی گئی۔

دبیز قالین پہ اپنے نرم و نازک پاؤں دھنستے

محسوس ہوئے، کمرے میں ایسی قیمتی چیزیں اس نے صرف خوابوں میں دیکھی تھیں، ساس نے بیش قیمت کڑے پہنائے، ٹوبیہ نے کئی تحائف بٹھا دیئے، اسفر اس کا اکلوتا بھائی تھا، سر وفات پا چکے تھے، مگر میں بس قریبی لوگ تھے۔

گھر خالی ہوا تو اسفر اندر آ گیا، اس کا رو پہلا آچل اٹلتے ہی اس نے رانیہ کے حسن کے قہیدے پڑھنے شروع کر دیئے اور ساتھ ہی بے تابوں کے قہے بھی سنا ڈالے، رانیہ آج کسی حور سے کم نہ لگ رہی تھی۔

رات بھی ان کے اس مدھر ملن پر مسکرا رہی تھی، ہیروئن کا ہار اسفر نے اسے رونمائی میں دیا تھا، اتنا قیمتی اور محبت بھرا تحفہ پا کر رانیہ محبت کا ہاتھ تھامے عشق کے سفر پر اسفر کے ہمراہ سفر کرنے لگی۔

☆☆☆

اس کی شادی پہ ایک ٹیلی نے ٹوبیہ کو پسند کر لیا تھا، یوں ان کا آنا جانا شروع ہو گیا، اسفر، رانیہ روز کہیں نہ کہیں دھوکوں پر مدعو ہوتے، سیر سپانے، رانیہ کے لئے کسی خواب سے کم نہ تھے، اسفر اسے مٹی مون کے لئے سنگاپور لے گیا۔

سیر و سیاحت، شاپنگ اور اسفر کا دلکش ساتھ، رانیہ خوش قسمتی کے مدار میں چکرار رہی تھی، سیکے جاتی تو ماں باپ نہال ہو جاتے۔

اسفر کی ہمراہی، روپے پیسے کی فراوانی، گھر میں سکون، رانیہ کو یاج گچ کی رانیوں جیسی زندگی گزار رہی تھی۔

اب تک کی گزری تنہائی کا شکوہ ہوا نہیں اڑا محسوس ہوا۔

گھر ٹوبیہ کی شادی کا ہنگامہ جاگ اٹھا رانیہ نے خوب لطف اٹھایا، گھر میں بس سار تھیں، وہ بھی گھریلو خاتون عبادت گزار، نوک

چاکر تھے، ان سے کام لینا، گھر دیکھنا، کوئی خاص ذمہ دار نہ تھی، اب اس کی بس یہی خواہش تھی کہ وہ جلدی سے ماں بن جائے۔

شادی کے دو ماہ کے بعد جب اسفر کو کاروبار کی طرف سے بیرون ملک جانا پڑا تو رانیہ کی جان بہ بن آئی۔

”میں اکیلی اتنے دن آپ کے بغیر، نہ جی مجھ سے نہیں رہا جائے گا۔“ رانیہ گلوگیر آواز میں کہتے ہوئے بچوں کی طرح رو پڑی، تو اسفر نے مسکرا کر اسے ساتھ لگا لیا، وہ کون سا خوشی سے جا رہا تھا۔

”تو کیا کام چھوڑ کر گھر بیٹھ جاؤں، ہاں بولو۔“ وہ انگلی سے اس کی تھوڑی اونچی کر کے اس کی بیگی آنکھوں میں جھانک کر وارنگی سے بولا تو رانیہ کے رونے میں شدت آگئی، تب اس نے روتے روتے اسفر کے چوڑے سینے پر ٹپکتے برساتے ہوئے اپنا مطالبہ دہرایا، پھر سینے میں ہی منہ چھپا کر سسک اٹھی۔

”تم ایسا کرو، اپنی امی کے گھر چلی جانا پندرہ دن کے لئے۔“ اسے مشورے پر بھی وہ ردی رہی، یوں کچھ دن وہ ماں کے گھر رہنے چلی آئی، مگر دن صدیوں کے برابر تھے، اسفر واپس آیا تو اس کی جان میں جان آئی۔

”تمہاری تنہائی کا بندوبست کرنا پڑے گا۔“ وہ شرارت سے بولا تو رانیہ تا بھی سے اسے دیکھتے ہوئے بولی۔

”کیا مطلب؟“  
”تمہیں بس اللہ جلدی سے اللہ گڑیا یا گڈا دے دے تو اس میں تم معروف ہو کر مجھے بھول جاؤ گی۔“ اسفر ابھی تک شرارت کے سوڈ میں تھا۔ تب اس کی بات سمجھ کر وہ شرما تے ہوئے مسکرا دی، تو اسفر نے اسے ہانپوں میں بھر لیا۔

☆☆☆

اللہ نے اس کی مراد جلد پوری کر دی، جب ڈاکٹر نے اسے ماں بننے کی نوید سنائی اور خوشی اس وقت دو چند ہو گئی جب اسے جڑواں بچے کا پتہ چلا، فرط مسرت سے اس کے پاؤں زمین پر نہ ٹک رہے تھے۔

ساس الگ خوش نہیں اور ٹوبہ کو بھی بچوں کا شدت سے انتظار تھا، وہ بھی ایک ایک دن گن رہی تھی، آخر کار اوپر والے نے اس کی جھولی میں دو چاند ڈال دیئے، وہ احمر اور احمد جیسے شہزادوں کی ماں بن گئی، کیا روپ چڑھا تھا اس پر، مانتا کا نور چہرے کا احاطہ کیے ہوئے تھا۔

مٹھائیوں کے ٹوکے بے بائے گئے، خوش بختی گویا گھر کی باندی بن گئی تھی، کتنا ارباب تھا کہ اپنے ڈھیر سارے بہن بھائی ہوتے، کھیلی، کودتی ان کے ساتھ اب جیسے ساری تنہائیں پوری ہو گئی تھیں۔

اسفر نے اسے وزنی زیورات ہنوا کر تحفہ دیا، مگر رانیہ کو اب ان چیزوں سے قطعاً دلچسپی نہ تھی، اسے جیتے جاگتے اصول خزانے مل گئے تھے، وہ ان میں واقعی مصروف ہو گئی تھی۔

ساس کچھ دن بیمار ہو کر ملک راہی عدم ہوئیں، دو برس بعد آذر اس کی گود میں آگیا، ماں باپ کے بعد دیگرے چل بسے، میکہ ختم ہو گیا، خوشی اور غم کے لمبے جلے تاثرات تھے زندگی گزر رہی تھی، اسفر کا کاروبار ترقی کرتا جا رہا تھا، وہ رانیہ کو اپنی خوش قسمتی کا ذمہ دار ٹھہراتا تھا، اب کئی کئی دن ملک سے باہر رہتا، کاروبار وسیع ہو رہا تھا، رانیہ کو وقت کم دیتا، وہ شکوہ کرتا تو اسفر تینوں بیٹوں کی طرف اشارہ کرتا، اتنے پیارے زندہ کھلونے ہیں ناں تمہارے پاس، ان کے ساتھ مزے کرو، تب رانیہ وقت کے ساتھ ساتھ سنجیدہ

ہوتی گئی۔

آخر میں بیچہ نے آکر بیٹی کی کی پوری کر دی اور خاندان مکمل ہو گیا، مگر میں کسی شے کی کمی نہ تھی، سکون، اولاد، دولت، محبت اور رب کی لاتعداد نعمتیں، وہ شکر گزاری سے آنکھیں جھگو بیٹھتی۔

وقت گزرتا رہا، بچے سکولوں میں آ گئے، عیش و سکون کی زندگی گزر رہی تھی، اسفر کی طبیعت مسلسل کام کی وجہ سے کبھی کبھار خراب ہو جاتی، پھر وہ کچھ دن آرام کرتا، دوبارہ کام سنبھال لیتا، رانیہ کو گھر سے ہی لگاؤ تھا، زیادہ کہیں نہ آتی جاتی۔

ٹوبہ کے دو بچے تھے، بڑا بیٹا حماد اور گلا رحنا، ٹوبہ نے حلیہ کو اپنے حماد کے لئے مانگ لیا تھا، یہاں بھی رانیہ کو رب نے سکون سے بچا لیا تھا، وہ شکرانے کے قفل ادا کرتی۔

زندگی میں کیا کچھ کی تھی؟ اس سوال کے جواب میں صفر ہی آتا تھا، رانیہ اپنی مطمئن زندگی پر اطمینان بھری نگاہ ڈالتی، تو دل سکون سے ہلکورے لیتا، اسفر اور رانیہ جوانی کو رخصت کر کے بڑھاپے کی جانب بڑھ رہے تھے۔

احمر اور احمد کا میڈیکل کی طرف رجحان تھا، دونوں ڈاکٹر بن رہے تھے، جبکہ آذر کا دھیان کاروبار کی طرف تھا، وہ ایم بی اے کر رہا تھا حلیہ دسویں کلاس میں تھی۔

بہترین ماحول، اعلیٰ تربیت نے بچوں کے اندر رکھ رکھاؤ، تیز اور ریع داری پیدا کر دی تھی، اسفر رانیہ کا شکر گزار تھا کہ اس نے بچوں پر دن رات محنت کر کے انہیں اچھا انسان اور تعلیم یافتہ بنایا ہے، گھر میں انہی کے دم سے رونق اور چہل پہل تھی۔

مگر..... مگر..... یہ کیا..... یہ چھپاتے پنچھی

اچھی کتابیں پڑھنے کی عادت ڈالیں

ابن انشاء

- ☆ اردو کی آخری کتاب.....
- ☆ خار گندم.....
- ☆ دنیا کول ہے.....
- ☆ آوارہ گرد کی ڈائری.....
- ☆ ابن بطوطہ کے تعاقب میں.....
- ☆ چلتے ہو تو چین کو چلئے.....
- ☆ ٹکری ٹکری پھر مسافر.....
- ☆ خط انشائی کے.....
- ☆ بستی کے اک کوپے میں.....
- ☆ چاند گھر.....
- ☆ دل، خوشی.....
- ☆ آپ سے کیا پردہ.....
- ☆ ڈاکٹر مولوی عبدالحق.....

☆ قواعد اردو.....

☆ انتخاب کلام میر.....

☆ ڈاکٹر سید عبداللہ.....

☆ طیف نثر.....

☆ طیف فزائل.....

☆ طیف اقبال.....

لاہور اکیڈمی، چوک اردو بازار، لاہور

فون نمبر 7321690-7310797

تو اڑنے کو پر توڑنے لگے تھے، بلبل بھی اٹھ اے کے استکان دے کر فارغ ہوئی تھی کہ تو یہ سنے شادی کا معاملہ اٹھا دیا۔

”اتنی جلدی۔“ رانیہ نے گویا دل پہ ہاتھ رکھ کر گھبرا کر کہا اور کپکپا اٹھی، اسفراداس سمجھے میں گویا ہوا۔

”پرایا دھن ہوتی ہیں پینیاں، اک نہ اک دن تو رخصت کرنا ہوتا ہے۔“ اس کی آواز میں کمی تھی۔

”مگر.....“ رانیہ اب بھی صدماتی کیفیت میں بولی۔

”اگر مگر رہنے دو، بس شادی کی تیاری کرو اور ہاں ایک اور بات.....“ وہ کہتے کہتے ذرا رکا، رانیہ کی حالت جیسی بھی تھی یہ بات لازمی کرنا تھی۔

”احمر اور احمد باہر جا کر پڑھنا چاہتے ہیں، میں انہیں بھیج رہا ہوں، چند سالوں کی بات ہے، اچھی تعلیم لے کر آئیں گے تو کامیابی مزید قدم چوسے گی۔“

”یہ..... یہ آپ کیا کر رہے ہیں، مجھ سے تو ایسا کچھ نہیں کہا ان دونوں نے۔“ وہ آنے والے دنوں کے اکیلے پن کو شدت سے محسوس کر کے روتے ہوئے بولی۔

تو اسفر نے اسے ساتھ لگا کر تسلی دی، بچوں میں تو جان تھی اس کی، ایک ہل کی جدائی گوارا نہ تھی، کجا اتنی دور، اتنے لمبے عرصے کے لئے۔

”نہیں..... نہیں اسفر آپ انہیں یہیں کہیں پڑھالیں، کچھ بھی کر لیں، مگر اتنی دور نہ بھیجیں۔“ رانیہ گڑبڑا کر بولی تو اسفر اسے پیار بھری تسلیاں دیتا رہا۔

☆☆☆

بلبلہ حماد کی ہو گئی، معصوم سی گزیا پری بن کر

دلہن کا روپ دھارے ہوئے تھی، رانیہ اس کی رخصتی پر ایسا ٹوٹ کے روئی کہ سب کو رولا ڈالا، خود اسفر بھی خود پر ضبط نہ کر سکے اور بیٹی کو ساتھ لگا کر بھٹ کر رو پڑے۔

احمر، احمد اور آذر نے بازوؤں کے حلقوں میں لے کر بہن کو رخصت کیا، رانیہ کی طبیعت بہت خراب ہو رہی تھی، اسفر نے اسے سکون آوار دوائی کھلا کر سلا دیا، مگر رانیہ کے اندر اک خوف ہل مارے بیٹھ گیا تھا، کہ اب تنہائی شروع ہونے کو ہے ”دور جنوں“ آغاز چاہتا ہے۔

احمر اور احمد کے جانے کے دن بھی قریب آ گئے، رانیہ ماں تھی، بچے اس کی اس شدت کی تکلیف کے درجے پر نہ تھے، جہاں رانیہ کی سوچیں مفلوج ہو جاتی ہیں، وہ کم کم ہو گئی تھی۔

دونوں بیٹے اسے جلد آنے کا کہہ کر پرانے دیس جا رہے، مگر میں عجیب اداس اور خاموشی نے ڈیرے ڈال لئے تھے، اداسی تنہائی پہنچے گاڑے بیٹھی تھی۔

اسفر اسے سمجھاتا، مگر وہ اندر ہی اندر اک نفسیاتی دباؤ کے تحت کھلتی رہتی، دونوں کو گھنے کئی ماہ ہو گئے تھے، وہاں سیٹ بھی ہو گئے تھے، اک نئی سنہری زندگی گزارنے لگے، ماں کے جذبات اس کے آنسو، ان کا انتظار بن گئے تھے۔

☆☆☆

بلبلہ آ جاتی تو جمود میں ارتعاش پیدا ہو جاتا، درندہ وہی اکیلی بولاٹی بولاٹی پھرتی، اسفر باہر جاتے تو گھر کاٹنے کو دوڑتا۔

یوں لگتا جیسے بچپن کی تنہائی عود کر آ گئی ہے، یہ چند روز تو بس خواب جیسے تھے، بہار کے خوشگوار جھونکے کی طرح آئے اور گزر گئے، یہاں تک تو وہ برداشت کر رہی تھی مگر ایک رات۔

اسفر بھی رات کے کسی پہر خاموشی سے اس

کا ساتھ چھوڑ گئے، رہی سہی کسر اسفر کی دامن چدائی نے پوری کر دی، رانیہ مکمل طور پر ٹوٹ چکی تھی۔

احمر اور احمد نہ آ سکے اور بعد میں آنے کا کہ اپنی زندگیوں میں ممکن ہو گئے، کہ ایک ماں، اک دکھیا ری، ایک بے بس عورت اس کی منتظر ہے۔

مگر وہ تو جیسا دیس دیا ابھیس کے مصداق اپنے لئے خوشیاں کشید کر رہے تھے۔

ستم پہ ستم ایسے ہوئے کہ وہ پھر کی ہو گئی، دولت، روپیہ، پیسہ، قیمتی مادی اشیاء سب بے وقعت اور بے معنی لگتے، عدت گزارنے کے بعد ٹوہیہ اور بلبلہ نے بہت کہا کہ وہ ان کے ساتھ رہے، مگر وہ نہ مانی۔

گھر کے کونے کونے سے بچوں کی قلقاریاں، اسفر کی محبت بھری سرگوشیاں اس کے پیروں کی زنجیر بن جاتے، حالانکہ سب سراب تھا۔

پھر یہاں آذر تھا، صبح گیا شام تک لوٹ آتا، مصروف بھی، بہت تھا، اس کی تعلیم کا آخری سال تھا، اسے اپنی کلاس فیلو بریرہ پسند آ گئی، رانیہ نے بلا چوں چرا اس کی شادی بریرہ سے طے کر دی، جو نہایت امیر، کبیر اور تک چڑھی سی تھی، ماڈرن ازم کا شکار، رانیہ اب خود کو آنے والے صدمات کے لئے تیار کر چکی تھی۔

بریرہ گھر میں آ گئی، مگر اس کا وجود نہ ہونے کے برابر تھا، آذر نے اسفر کا کاروبار سنبھال لیا تھا، بریرہ بھی اس کے ساتھ آفس جانے لگی، آخر تعلیم کا فائدہ بھی تو اٹھانا تھا، نہ کہ گھر داری سنبھالنا تھا۔

احمر اور احمد نے لندن میں ہی شادیاں کر کے ماں کو محنت سے بچالیا تھا، یہاں کیونگر آتے؟ رانیہ بے بسی کی تصویر بن جاتی، آذر اس

کا خیال رکھتا، مردوں لے پاس مرمت۔ س۔ تھی۔

بلبلہ کسی کے پاس بھی رانیہ کے لئے وقت نہ تھا، نہ اس کی تنہائی دور کرنے کا سامان، ہاں قیمتی سامان کی بھر مار تھی، جو اس کے لئے کسی کام کا نہ تھا اب۔

☆☆☆

پھر ایک خوشخبری نے اس کے تن مردہ میں جیسے جان ڈال دی، نئی روح پھونکی گئی اس کے بے جان جسم میں۔

احمر اور احمد دونوں کئی سالوں بعد ملنے آ رہے تھے، دونوں کے دودو بچے تھے، رانیہ اس خبر کو سن کر پھر سے جی اٹھی تھی، بچوں کو حالانکہ اسکا پ دغیرہ یہ دیکھ رکھا تھا، مگر اب رو برد یکنہا، اس کے لئے کسی نعمت متبرکہ سے کم نہ تھا، وہ ان کے آنے کی تیاریوں میں لگ گئی، خریداری کی، پورے گھر کو سنبھالا، بچوں کے لئے تحائف اور ٹھکڑے لئے، نئی ان دیکھی بہوؤں کے لئے بہترین لباس خریدے، اتنی مصروف ہوئی کہ اکیلا پن نہیں جاسویا، کہ وہ سب چاند، ستاروں جیسے چہروں والے اس کے سامنے آن موجود ہوئے۔

رانیہ مارے مسرت کے جھوم اٹھی، بچوں کو ساتھ لگایا تو مانتا کو چین آیا، رانیہ کے اندر نئی توانائی پیدا ہو گئی۔

بلبلہ اور ٹوہیہ بھی سب کے ساتھ آ گئے، مگر میں ایسی رونق تھی کہ رانیہ بار بار تشکر سے پلکیں جھونکتی تھی، خاص طور پر اسفر کی کی پر اس کی جاں لرزتی، روزانہ کہیں نہ کہیں چلے جاتے، کھانا، پینا، سیر و تفریح، رات گئے گپ شب لگانا، کافی پینا، سب کا یوں مل بیٹھنا رانیہ کی ازلی خواہشوں میں سے ایک تھا، اسفر کی یاد آتی تو بچے لمحہ بھر کو اداس ہوتے پھر بھانگتی دوڑتی زندگی کے ہم قدم ہو



سیما بنت عامر



لغانوں میں موجود تھا، جن کے درمیان بیٹھی وہ اٹکلا رہی۔

چھڑی ساز بیڑ بھرا ہوا تھا، اس نے آنسو بھری آنکھوں سے سب چیزوں کو دیکھا اور چہرہ ہاتھوں میں چھپا کر سسک اٹھی، کوئی آنسو پونچھنے والا نہ تھا، اکیلا پن تھا اور وہ بھی، یہی زندگی کا چلن اور رکھ رکھاؤ ہے۔

بے حسی کی دنیا میں مادی چیزوں کی فراوانی ہوتی ہے، سب مل جاتا ہے مگر ساتھ اور پیار کا حصول ناممکن ہے، شاید یہ اس کی خود ساختہ سوچوں اور توقعات کا قصور تھا، آنسو صاف کرتی وہ آہستہ آہستہ اٹھی اور اپنی الماری کھولی، کب کے سنبھالے ہوئے سامان کے نیچے سے ایک کپڑے میں لپیٹے اپنے بچپن کے گڈا اور گڑیا نکالے، انہیں سینے سے لگا کر مسکتی ہوئی بستر پر آ گئی اور ان کو دائیں بائیں لٹا کر ان بے جان کھلونوں سے بے ربط باتیں کرنے لگی، جو صرف اور صرف وہی سمجھ سکتی تھی، اپنی ذہنی کشش کو سکون دینے کے لئے، نہ جان سکتے تھے، نہ سمجھ سکتے تھے، نہ کوئی انسان نہ یہ بے جان گڈا، گڑیا بس رانیہ یہی جانتی تھی کہ وہ ازل سے تنہا ہے اور اس کی تنہائی کے ساتھ یہ کھلونے ہیں۔

☆☆☆

جاتے۔

ڈیڑھ ماہ ایسے گزرا کہ پتہ ہی نہ چلا، خوشیوں کے دن لمحہ بھر کو لگتے ہیں اور غم کے دن صدیوں برابر، وہ رانیہ کو ساتھ لے جانے کا کہتے، مگر اس نے صاف انکار کر دیا، یہاں تک کہ ان کے جانے کے دن قریب آ گئے، رانیہ کے اندر سے جیسے کوئی لہو نچوڑنے لگا۔

بچوں میں اس کا دل لگ گیا تھا، مگر جانتی تھی کہ انہیں لوٹ کر واپس جانا ہے اور تنہائی ہی نے سدا اس کا ساتھ بھجانا ہے۔

بے شک ملازمین تھے گھر میں، پریرہ اور آذر تھے، مگر اس کے پاس وہی تنہائی تھی، اسی سے سمجھوتہ کئے ہوئے تھی۔

احمر اور احمد اپنی اپنی ٹیمبلرز کے ساتھ واپس چلے گئے، انہیں تو جانا ہی تھا۔

☆☆☆

جس رات وہ گئے، وہ سو نہ سکی، صبح اٹھی تو سر بھاری بھاری تھا، وہ بے حد اداس تھی، آذر اور پریرہ آفس جا چکے تھے، ملازمہ نے اسے ناشتہ بنا کر دیا، بے دلی سے کر کے وہ واپس کمرے میں آ گئی، دونوں بیٹوں اور بہوؤں نے اسے بے شمار تحائف دیئے تھے، قیمتی تحائف کے درمیان بیٹھی سسک رہی تھی۔

نم آنکھوں سے کمرے کا بغور جائزہ لیا، کپڑوں سے بھری الماری کھل نما گھر، بڑا سارا عالیشان جدیدیت لئے ہوئے تھا، امریکن اسٹائل والا اس کا گھر، نرم و گداز ایرانی تاقین، پچاس انچ کی ایل ای ڈی، قیمتی موبائل پھلوں اور خورد و نوش سے لیا اب بھرا ریفریجریٹر، پیش قیمت جوتے، ڈریسنگ ٹیبل پر نگاہ دوڑائی تو جہاں بھر کا سامان آرائش، اعلیٰ و نفیس چوپڑی، جرسیاں، گرم چادریں، اب اس کے ارد گرد بھی ایسا ہی سامان

عمیر کے سدھارنے کے بعد میرے ہاتھ تیزی سے بچن سینے میں معروف تھے، جب کال بیل بجی، فلیٹ کے داخلی دروازے کی لینس سے آنکھ لگا کر جھانکا، تو اک اجنبی سراپا سامنے تھا، چمچی رنگت، کچھڑی بال، مغلی نقوش، کھنڈر بنانا کہ عمارت شاندار تھی، میں نے دروازہ وا کر دیا، جالی کے اس پار کھڑی وہ مسکرا رہی تھیں۔

”مجھے مسز عمیر سے ملنا ہے۔“ سامنے والے فلیٹ سے مسز ہاشمی۔  
”اوہ ہاں، عمیر نے ذکر تو کیا تھا۔“ میرے ذہن میں اک جھمکا سا ہوا۔

”تم سے ملنے کا بہت شوق تھا، سنا کہ تم لکھاری ہو۔“ جالی کا پٹ وا ہوتے ہی انہوں نے قریب آ کر مجھے پیار کیا اور پر شوق نظروں سے میرا جائزہ لیا تو مجھے اپنے حلیے پر شرمساری ہوئی، لاگ شرت پر ڈھیلا ڈھالا لٹراؤ زر، لمبا سا مفلر، اونچی پونی ٹیبل، ڈرائنگ روم داخلی دروازے سے منسلک تھا، ان فلیٹس کی ایک خوبی یہ بھی تھی، ہر فلیٹ کا رز فلیٹ، چار جانب کھڑکی، جالیوں سے فلیٹ روشن اور ہوا دار رہتے، نو آباد علاقہ تھا، ہوا مکمل کر آتی۔

میرا سارا دن، گھر مگرستی کے نام رہتا، انہوں نے اک ستائشی نظر چار سو دوڑائی، میں نے کچھ بچنے کے لئے پوچھا۔

”بچ بتاؤں تو کچھ بھی نہیں، ابھی ناشتہ کیا ہے، بس تم میرے پاس بیٹھو، کل پہلی بار تمہیں ڈاکٹر صاحب کے ساتھ دیکھا، مجھے لگا تم ان کی.....“ وہ قصداً چپ ہو گئیں میں سمجھ گئی۔

”ہماری بابت اکثر کوئی بھی گمان گزرتا، میری عمر چالیس سال تھی، لگتی تیس کی بھی نہ تھی، تو یہ میری قسمت تھی، عمیر خود سے لا پرواہ رہتے، ورنہ کچھ خاص تفاوت بھی نہ تھا، شادی کو بس دو سال

گزرے تھے۔“ سن کر ان کی حیرت دگنی پڑ گئی، پھر ادھر ادھر کی باتیں۔

”بس میرا دن یونہی گزرتا ہے، بالکونی میں وقت گزرا لیا، لی وی، اخبار دیکھ لیا، کبھی دروازے کی جھری سے لگ کر ادھر ادھر جھانکی ماری، عمیر نے بتایا وہ کل تمہیں ڈاکٹر کے لے جا رہے تھے؟“

”جی بس..... مری شدید ہے، چکر سے آ گئے تھے، لی وی لو ہو گیا تھا۔“

”اوہ تو یہ معاملہ ہے۔“ وہ کچھ اور سمجھیں۔  
”دید آید، درست آید۔“ ان کے لبوں پہ معنی خیز مسکراہٹ کھیلنے لگی۔

میں نے مسکراترگی میں سر ہلایا۔  
”کچھ لوگ بے نشان منزل کے راہی ہوتے ہیں، عرصہ ہوا، میں نے اس امر پر سمجھوتا کر لیا تھا اور انسان جب تقدیر پر سمجھوتا کر لیتا ہے تو زندگی سیل ہو جاتی ہے۔“

”پروردگار جب انسان کو کچھ نہیں دیتا تو اس کی بہتری و حکمت اور کچھ دے کر واپس لیتا ہے، تو اس سے کہیں زیادہ نوازتا ہے، میرا اس پر ایمان کامل ہے۔“

وہ جانے کیا سمجھیں، کیا نہ سمجھیں، ان کے ارادے طویل نشست کے لگے۔

”مجھے آج مزر فریز کرنے تھے، جاتے موسم کے دن تھے، پھلیوں کا ڈھیر تھا میں اٹھا کر دیں لے آئی۔“ وہ بھی ساتھ دیے لگیں۔

”ڈاکٹر صاحب نے بتایا تم کھانے بہت مزے دار پکاتی ہو، آج کیا ارادے ہیں؟“

”آج عمیر نے مٹر پلاؤ کی فرمائش کی تھی، کچھ کباب فریز تھے، رائیہ سلا دو غیرہ۔“ انہوں نے سن کر ہنسا رہا۔

”ارے واہ مزا آ جائے گا۔“

”عمیر کے لئے اہتمام شام میں ہوتا ہے، دن میں تو میرے لئے کچھ نہ کچھ نکل ہی آتا ہے۔“

”حق ہا، یہ تنہائی بھی کیا عذاب ہے، مگر کی چار دیواری سے اپنی ہی بازگشت مگر کر پھر خود کو لوہا بن کر رہتی ہے۔“

اب میں پہلی ملاقات میں ان سے اختلاف کرتی کیا بھلی لگتی کہ تنہائی سنا اور ویرانی، انسان کے اندر ہوتی ہے باہر نہیں، وہ ادھر ادھر کی کچھ باتوں کے بعد کام کی بات پر آئی تھیں۔

”میرے شوہر صحابی تھے، ہمارا اپنا پچا ہے، کچھ سینئر اینڈ میڈرز سے چلا رہے ہیں، مگر اب چینلو کی بھرمار ہے، لاکھوں کی آفرز ہیں، وہ رسی تڑاتے ہیں، مگر وفادار ملازم ہیں، چاہتے ہیں کوئی کام کا بندہ مل جائے تو اسے سکھا کر چارج دے دیں تاکہ ہمیں دشواری نہ ہو، مجھے لگتا ہے تم جلد سیکھ لو گی۔“

میں سوچنے کا کہہ کر ٹال گئی، عمیر کہاں ماننے، افسانہ نگاری میرا شوق تھا اور اینڈ ٹینگ، سنا تو یہی تھا کہ آگ کا دریا ہے۔

”ارے تمہارا نام تو پوچھنا ہی بھول گئی۔“ انہوں نے چلتے سے پوچھا۔

”تمہیں..... ویسے سب مینا کہتے ہیں۔“  
”مجھے سب بے جی کہتی ہیں، تم بھی کہہ سکتی ہو۔“

بے جی ان کی شخصیت کے لئے یہ نام انگوٹھی میں سٹپنے کی مانند تھا، بے تکلفانہ، اپنائیت لئے، مشفق انداز۔

☆☆☆

مجھے اعتراف ہے، رب کی اعلیٰ ذات نے مجھے بے تحاشا نوازا۔

ابا کی اچانک وفات نے مجھے اپنے پیروں

پر کھڑے ہونے کا حوصلہ بخشا تھا، عیم ممل لی، پھر بیلنگ کی جاب، گھر کی گاڑی، میری اسی جاب سے چلتی رہی، بہن بھائیوں کی تعلیم، شادیاں، مجھے اک عرصہ اپنا آپ یاد ہی نہ رہا، کہ رب نے مجھے دوسروں کی حاجات پوری کرنے کے لئے چنا تھا، یہ ایک بڑا اعزاز تھا، رشتے آتے، میں لوٹا دیتی، یہاں آ کر میں نے دیا کو کیونکر جھٹلایا، یہ ایک الگ کہانی رہی، میں نے خود کو اپنی ٹینگی کے لئے وقف کر دیا تھا، مانوا اپنا آپ ہی بھول گئی، مگر سب ایک ایک کر کے جب اپنے پردوں اڑنے لگے تو اپنے رستے ڈھونڈ لئے، یہی زندگی کا اصول ہے، جو ساتھ چلو تو ساتھ بہت، جو رک جاؤ تو تنہا ہو، میں نے بھی دل سے نہیں لگایا، کیونکہ کبھی امید نہیں باندھی، رشتوں، محبتوں میں لین دین، سود و زیاں کہاں چلتا ہے، آخر کار میں اور امی تنہا رہ گئے، انہیں میرا تم کھائے جاتا، سوچا تو یہی تھا، بھائی پیروں پر کھڑے ہوں گے تو، تاخیر سے سہی، میری شادی کر دیں گی، مگر زندگی حسب خشاء گزرے تو قسمت کا کیا کیا جائے، وہی عالم رہا کہ، دو آرزو میں کٹ گئے، دو انتظار میں۔

پھر یہ کچھ عرصہ پہلے کی بات ہے، اک معمولی سی تکلیف کی شکایت لے کر میں ڈاکٹر کے پاس پہنچی تھی، اس نے کچھ ٹیسٹ لکھ کر دیے اور نتائج حیرت انگیز و ناقابل یقین تھے۔

”یوئرس میں رسولی کی گرتھ ہے، جب یہ کمپلٹ ہو کے بال بن جائے گی تو آپریٹ کر کے نکالنی پڑے گی، تب تک تکلیف تو اٹھانی پڑے گی۔“

میں سر تا پا لرز کے رہ گئی، کئی ڈاکٹر زبدلیس، یہ بھی سننے میں آیا۔

”یہ ایک کامن پرابلم ہے، اس کی فکر چھوڑ



دواور اپنی نیلی بٹاؤ۔

نیلی کہاں سے بنتی، اب تو بھولے بھٹکے بھی کوئی آ جاتا تو پلٹ کر نہ آتا، وقت ہاتھوں سے پھسل گیا تھا اور اب اس ناکارہ پن سمیت مجھے کون سینٹا، لاکھ جگہ سر بٹھا، مگر مرض بڑھتا گیا، جوں جوں دوا کی اور ان دفتوں کی کرب واذیت، الامان الحفیظ، کچھ عرصہ گزرا، اس رسولی کے کینسر بن جانے کے خدشے کے تحت آپریشن ناگزیر تھا اور آپریشن کا نتیجہ، میرے وجود کا بھجر پن، اس روز میں آنسوؤں سے رو پڑی تھی اور یہی وہ وقت تھا، جب لیزڈی ڈاکٹر نے کہا۔

”یہ رب کے فیصلے ہوتے ہیں، اس کے ہر کام میں انسان کے لئے بہتری ہے، جب دو کسی سے کچھ لیتا ہے تو اس سے کہیں زیادہ نوازنا ہے۔“

میں نے زندگی کے لئے بڑے خواب دیکھے تھے، سب ایک ایک کر کے چٹکانچور ہو گئے، قریبی دوستوں میں، جو کئی کئی بچوں کی اماں تھیں، کہتیں، آپریشن کرا ڈالو، بہت سی عورتیں بنا کسی وجہ کے بھی مائیں نہیں بن پائیں، مگر دل اس اعزاز سے دستبرداری پر آمادہ ہی نہ تھا۔

ایک نے تو یہ تک کہہ دیا، اولاد ہو بھی تو کون سا سکھ دیتی ہے، لا ولد کی کا دکھ، اولاد کے دکھ سے بڑھ کر نہیں ہے، مگر میں زندگی کو ثبت لیتی، اس کا روشن رخ دیکھتی، اتنا آسان بھی نہیں ہوتا، خوابوں سے دستبرداری خود کو بے نام نشان رہ جانے کا دکھ۔

میں نے اب تک کی زندگی خود کو لٹی کر کے گزاری تھی، جھٹکنے لگی تھی، اب تو بالکل ہی ٹوٹ گئی، شاید ڈھسے جاتی، اگر ڈاکٹر عمیر کا ساتھ مجھے بروقت نصیب نہ ہوتا، بات وہیں آ جاتی ہے، پردہ رگڑ جب کسی سے کچھ لیتا ہے، تو اس سے

کہیں زیادہ نوازنا ہے۔

ان کی عمر پچاس کے لگ بھگ تھی، اب بھی تھلپاں ان کے گرد روانہ وار منڈالتیں، مگر انہیں پیٹنے کی تقدیریں، اس کی حرمت کا خیال رہا، ایک آدمی کا برا فعل، سارے پیٹے کو میلا کرتا ہے، کم عمری کی شادی، برادری کی سفاک رواجوں کی بھیئت چڑھ گئی، ان کا خاندان دل خالی ہو گیا تھا، ذہن میں قدامت پرستی کا کیزا تھا، عورت کو، عورت کی حدود میں چاہتے، مجھ میں آئینہ نیل کی جھٹک پائی، اس وقت تو یہی کہا تھا، امی کو ان کی بابت دھڑکے، خدشے تھے، کہیں گاؤں لے جائیں، تو وہ میری صورت کو ہی ترس جاتیں، اگرچہ اس کا سوال ہی نہ تھا، ان کی جاب، رہائش، سب یہیں تھی، گاؤں سے رابطے تو چلنے، امی کی سلی کے لئے فلیٹ میرے نام کر دیا۔

اور اس روز تو میں جدے میں ہی گر پڑی، جس روز انہوں نے کہا۔

”ہر بات کا اک وقت ہوتا ہے اور جب وقت گزر جائے تو بات بے معنی ہو جاتی ہے، شادی وقت پر ہوتی تو میں اولاد کے لئے ضرور سوچتا، مگر اب نہیں۔“

پھر آٹھے کا سفر میرے لئے دشوار نہ رہا۔ مگر مجھے خود کے خالی پن کا دکھ کھائے جاتا، شاید زندگی میرے لئے ختم ہو کر رہ جاتی، اگر عمیر کا دلاسا، ان کا وجود نہ ہوتا خود کے بھجر ہو جانے کا دکھ کم نہیں ہوتا، مگر رب نے دوسری صورت مجھے بہت نوازا، عمیر جیسے جیون ساھی کا ساتھ کسی معجزے سے کم نہ تھا، امی دم آخر تک میرے ساتھ رہیں۔

☆☆☆

مجھ سے بڑھ کر کون جانتا، انسانی زندگی میں اگر سو مسائل ہیں تو ننانوے پیسے کی کمی کی وجہ

سے، اور پیسہ وہاں کے لوگوں کی پرالہم نہ تھا۔ زندگی کے مسائل زندگی کے معاملات ہیں، تقدیر کا کھونا پن نہیں، کسی بڑے آزار سے اللہ بچائے، تو یہ بڑی بات ہے۔

بہت کم عرصہ میں بے جی سے میری اچھی مہیرنگ بن گئی تھی، ہم مل کر کرنی دی دیکھتیں، ان ڈور کیمز بکھلیتیں، آٹس کریم کھانے یا کچن شاپنگ کو جاتیں، میں انہیں اخبار پڑھ کر سناتی، وہ مہینے میں ایک بار بینک جاتیں، تو میرے لئے بہت کچھ لے آتیں، میں نے بھی ان سے بہت کچھ سیکھا، نت نئی ڈشز، بکلیوں والے کروتوں کی کٹنگ و سلائی کڑھائی کے ٹانگے اور پائری بھی۔

کہانی کوئی نئی نہیں ہوئی، خود پر جتنی نرالی بن جاتی ہے، میری ذات رفتہ رفتہ ان پر کھل گئی تھی، وہ سر اٹھیں، مگر ان کے ذریعہ نظر میرے وہ آزار رہے جن دنوں میں نے کبھی غور ہی نہ کیا تھا، میری تنہائی انہیں ملتی، میں مسکرا کر ہمیشہ ان کی نفی کرتی، ایک ٹیٹھی میٹھی باتیں کرتا طوطا پال لیا، ایک خوبصورت بلی، سال میں دو بار بیاہتی، لوجی مٹ گئی تنہائی، عمیر کی آمدن کا برا حصہ، گاؤں ان کی نیلی کو جاتا، سوکھے نکلے پر کفایت میرا مقدر تھی، چنک کے پیسے میرے اپنے اخراجات کے لئے کافی رہتے، میری قسمت کا ہمیشہ مجھ سے کرا کر دوسروں کو ملتا، میں نے اس نکتے پر سمجھوتا کر لیا تھا، اک روز انہوں نے کہا۔

”تم نے کبھی اپنی کہانی لکھی ہے؟“ میں نے مسکرا کر نفی میں گردن ہلا دی۔

”میری کہانی میں کچھ ایسا تھا ہی نہیں۔“ ”اچھا، تو پھر میری کہانی لکھو، جیٹا کوئی تھا نہیں، بس تین بیٹیاں، باپ کی آنکھیں بند ہوتے ہی وارث کے لئے جھپٹ پڑیں، میں نے سب کو دے دلا کے چٹا کیا، جب رشتوں کے

درمیان عدالتیں آ جائیں تو رشتے ختم، انہوں نے بھی کبھی پلٹ کر نہیں پوچھا، دوسروں کو نوازنے والے یونکی خالی ہاتھ رہ جاتے ہیں، تنہائی اور میری طرح۔“ انہوں نے آنکھیں سوند لی تھیں۔

”کاش میری بھی کوئی بیٹی تم جیسی ہوتی۔“ اچانک انہوں نے پٹ سے آنکھیں داکی تھیں۔

”بھی تم نے سوچا تنہائی سبب عمیر کی زندگی میں اجالا ہے، اسے سب کچھ حاصل ہے، اک کم عمر، خدمت گزار، قابل بیوی، اس کی برعکس، ان کی بدولت، تنہا رہے پاس کیا ہے؟ صرف خسارہ، تنہائی، سچ تان۔“

میں نے نفی میں سر ہلایا، مگر دنیا اسی نکتے پر ایک جائے تو زندگی ٹھہر جائے، اگر میری زندگی سے عمیر کو حذف کر دیا جائے تو میرے لئے تنہائی، ویرانی و سناٹا ہے، رب نے انہیں مجھ سے بروقت ملایا، انہوں نے مجھے میری خامیوں سمیت اپنایا، تو یہ کم نہ تھا، میں زندگی کے خسارے چھنے بیٹھ جاتی یہ ناشکری تھی، یہ تصویر کا روشن رخ تھا۔

زندگی کا مفہوم اس سے منسلک فرائض نبانے میں ہے اور فرائض رشتوں سے جڑے ہوتے ہیں، رشتوں میں لین دین، سود و زیاں کہاں چلتا ہے، مجھے یہ یکے نہیں سمجھانے میں دیر تو لگی، مگر جیت میرا مقدر تھی۔

”اب آپ بھی نہیں کہیں گی کہ کاش آپ کی کوئی بیٹی مجھ جیسی بھی ہوتی، کسی کو بڑھ کر تمام لینا شکست نہیں، اپنا پن ہے۔“

انہوں نے مسکرا کر سونائیل کی سمت ہاتھ بڑھایا تو میں ان کے فلیٹ سے نکلتی چلی گئی۔

☆☆☆

### حدیث نبوی ﷺ

ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا۔  
”اللہ تعالیٰ کا خیال رکھو تیری حفاظت کرے گا، جب تجھ کو مانگنا ہو تو اللہ تعالیٰ سے مانگ اور یقین کر لے کہ اگر تمام گروہ اس بات پر متفق ہو جائیں کہ تجھ کو کسی بات کا قطع پہنچادیں ہر گز تم کو قطع نہیں پہنچا سکتے، بجز ایسی چیز کے جو اللہ نے تیرے لئے لکھ دی ہے، اگر وہ سب اس پر متفق ہو جائیں کہ تجھ کو کسی بات سے ضرر پہنچا دیں تو تجھ کو ہرگز ضرر نہیں پہنچا سکتے بجز ایسی چیز کے جو اللہ نے تیرے لئے لکھ دی ہے۔“ (ترمذی شریف)

سعدیہ جبار، ملتان

### کام کی باتیں

- زندگی میں وہ راہیں اپناؤ جہاں سے کچھ حاصل کر سکو۔
- بیل کی طرح سہارا مت ڈھونڈو بلکہ درخت کی طرح سہارا بنو۔
- دوست ہزار بھی کم ہیں دشمن ایک بھی زیادہ ہے۔
- اگر روٹی سے عقل حاصل ہوئی تو دنیا کے بے وقوف بھوکے مر جاتے۔
- چھوٹے چھوٹے اخراجات کا خیال رکھو کیونکہ معمولی سودا خ پورے جہاز کو ڈبو دیتا ہے۔
- اس خوشی سے دور رہو جو کل غم بن کر دکھ

- دے۔
- محبت کرنا اور محبت کو کھودینا محبت نہ کرنے سے بہتر ہے۔
- عقلمند کہتا ہے میں کچھ نہیں جانتا مگر بے وقوف کہتا ہے میں سب کچھ جانتا ہوں۔
- کسی کو اتنا بھی نہ چاہو کہ بھلانا چاہو تو بھلانا سکو۔
- جو اپنے محسن کا ناشکرا ہے وہ اپنے اللہ کا ناشکرا ہے۔

### طلباء کی نفسیات

- ☆ ایسے طلباء جو یکپہر کے دوران پین کو عموماً بند رکھتے ہیں وہ عام طور پر مغرور ہوتے ہیں مگر تنہائی پسند ہوتے ہیں۔
- ☆ ایسے طلباء جو یکپہر کے دوران پین کو کھولتے اور بند کرتے رہتے ہیں وہ عموماً بالائقی ہوتے ہیں مگر گھریلو مسائل بڑی خوبصورتی سے حل کر لیتے ہیں۔
- ☆ ایسے طلباء جو یکپہر کے دوران پین کھول کر رکھتے ہیں مگر لکھتے کم ہیں وہ عموماً پین ہوتے ہیں مگر دوسروں کو اچھا مشورہ نہیں دیتے۔
- ☆ ایسے طلباء جو یکپہر کے دوران پین کی نب جان بوجھ کر دوسروں کو چھوتے ہیں وہ عموماً حاضر جواب ہوتے ہیں مگر انہیں زندگی میں کامیابی بڑی دیر بعد ملتی ہے۔
- ☆ ایسے طلباء جو یکپہر کے دوران پین کو خواہ مخواہ استعمال کرتے رہتے ہیں اور الٹی سیدھی

- لکیریں کھینچتے رہے ہیں، وہ عموماً حاضر جواب ہوتے ہیں مگر ان کی پڑھائی میں دلچسپی کم ہوتی ہے۔
- ☆ ایسے طلباء جو یکپہر کے دوران پین کو بار بار منہ میں رکھتے ہیں وہ عموماً ہوشیار ہوتے ہیں مگر کسی کی چیز کو حفاظت سے نہیں رکھتے۔
- ☆ ایسے طلباء جو یکپہر کے دوران پین کا ڈھکنا دوسرے ہاتھ میں رکھتے ہیں وہ عموماً یکپہر کو بچھ لیتے ہیں، مگر ان کے جذبات سرد ہوتے ہیں۔
- ☆ ایسے طلباء جو کسی مسئلے کو حل کرتے وقت پین کو بار بار کتاب پر مارتے ہیں وہ ریاضی میں کمزور ہوتے ہیں مگر بہترین وکیل ثابت ہو سکتے ہیں۔
- ☆ ایسے طلباء جو یکپہر کے دوران صرف خاص خاص باتیں نوٹ کرتے ہیں وہ عموماً امتحان میں اچھے نمبر حاصل کر سکتے ہیں مگر وہ کسی کے حق دوست نہیں ہوتے۔
- ☆ ایسے طلباء جو یکپہر کے دوران پینل کو دانٹوں میں دباتے رہتے ہیں وہ عموماً آرٹ میں ماہر ہوتے ہیں مگر وہ جذباتی حوالے سے بڑے حساس ہوتے ہیں۔
- فریال امینی، نوبہ ٹیک سنگھ
- لفظ انسان پانچ حرف پر مشتمل ہے
- الف سے:۔ اللہ تعالیٰ رقیقین رکھنے والا۔
- ن سے:۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت کرنے والا۔
- س سے:۔ سلامتی کا پہننے والا۔
- الف سے:۔ امر بالمعروف کرنے والا۔
- ن سے:۔ نبی عن المنکر کرنے والا۔
- شازیہ ہاشمی میواتی، مکھدیاں خاص بڑی باتیں

- جو لوگ اصولوں کے پابند ہوتے ہیں وہ زندگی کے کسی مقام پر محرومی کا شکار نہیں ہوتے۔
- خواہ مخواہ دوسروں کے کردار پر شک نہ کیا کرو ہو سکتا ہے کسی کے جس عمل سے تمہارے ذہن کو دینی اذیت پہنچ رہی ہو کل وہ تمہاری زندگی کی اصل حقیقت بن جائے جسے تم تسلیم کرنے پر مجبور ہو جاؤ سچائی اپنا آپ خود منوا لیا کرتی ہے۔
- دل میں خلوص ہو تو انسان کے دمنوں کا مداوا تقدیر خود کر دیتی ہے۔
- خود دار انسان موت کو ہنس کر قبول کر لیتا ہے موت تو آتی ہے کیوں نہ ہنس کر گلے لگایا جائے۔
- کائنات بولی نہیں ہے مگر زندہ ہے کائنات دیلوں سے نہیں ابھرتی لیکن اصلیت کی منزل تک پہنچاتی ہے۔
- جو چیز نہ آتی ہو اسے سینکھنے میں شرم محسوس نہ کرو۔
- برائی کھوٹے سکے کی طرح ہوتی ہے جو فوراً لوٹائی جاتی ہے۔
- جس کو پیار کرو اس کی خامیاں نظر انداز کرو، اسے خلص بنو کو غیر کا خیال ہرگز دل میں جاگزیں نہ ہو۔
- جس سے دوستی کرو اس کی برائیاں نہ اس سے کرو اور نہ ہی کی اور سے۔
- محبت مکمل زندگی ہے اس کا نشہ تمام عمر انسان کو مد ہوش رکھتا ہے۔
- دولت مندوں کی سستی سے پناہ مانگو یہ ایک ایسی لمبی سستی ہے جس سے بڑی دیر کے بعد ہوش آتا ہے۔
- عقلمند وہ ہے جو کم بولے اور زیادہ سنے۔
- زندگی کو غنیمت جانو غریب تم سے لے لی جائے گی۔



سورة آل عمران کی آیت 103 میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔  
”اور سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑے رہو اور فرقوں میں نہ بٹ جاؤ۔“

اس آیت کرمہ میں اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو نصیحت فرمائی ہے کہ اس رسی کو مضبوطی سے تھام لو جو اللہ نے قرآن حکیم اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صورت میں عطا فرمائی ہے، اس رسی کو مضبوطی سے تھامنے کا مطلب یہ ہے کہ اہل ایمان انفرادی اور اجتماعی سطح پر خدا کے وعدہ لاشریک ہونے پہ دل کی پوری صداقت سے ایمان لائیں اور اس ایمان پر راسخ رہیں غیر اللہ کو وہ مال و دولت ہو کہ اقتدار اہل و عیال کی محبت ہو کہ جابر حکومت کا خوف، خود پر غالب نہ آئے دیں ہر چیز ان کے ایمان باللہ تک تابع رہے گی، وہ اللہ ہی کی عبادت کریں گے صرف اس کی امداد و استغانت پر بھروسہ کریں گے راہ حق میں ہر سختی، ہر آزمائش کو صبر اور استقامت سے برداشت کریں گے سابقہ امتوں کی طرح فُرعات میں الجھ کر فرقوں میں بٹ کر نہیں رہ جائیں گے۔

درشن، میاں چنوں

### اقتباس

ہم پر غریبی نازل ہوتی ہے تو اتنی کہ ہم اپنی زندگی سے مایوس ہو جائے ہیں اور دولت نازل ہوتی ہے تو اتنی کہ دوسروں کو زندگی سے مایوس کر دیتے ہیں۔ (دعائے علی واصف)

☆☆☆

- اللہ کی بہترین نعمت مخلص دوست ہے۔
- انسان کو چار چیزیں بلند کرتی ہیں، علم، خوش کلامی، کم گوئی اور بے آزادی۔
- مایوسی انسان کی سب سے بڑی دشمن اور خدا کا عذاب ہے۔
- پھولوں کی خواہش رکھنے والے لوگ یہ بھول جاتے ہیں کہ گلاب کی نرم نرم پتیوں کے نیچے کانٹے بھی ہوتے ہیں۔
- نیک بننے کی خواہش کرو جیسا کہ حسین بننے کی کوشش کرتے ہو۔
- اچھے کارگیر کو روزگار تلاش کرنے کے لئے کسی دور دراز ملک میں جانا نہیں پڑتا۔
- خوشی اور خالی پیٹ کی دوستی نہیں۔

### سے چارہ سانچ

اگر اسی طرح ہر بات میں غریب سانچ کو قصور وار ٹھہرایا گیا تو وہ دن دور نہیں جب کسی کو بخار چڑھے گا تو وہ منہ بسور کر کہے گا کہ یہ سانچ کا قصور ہے کوئی کمزور ہوا تو کہے گا کہ یہ سانچ کی برائی ہے اور اگر کوئی بہت مونا ہو گیا تو بھی سانچ کو ہی کو سنا جائے، نالائق طالب علم امتحان میں نکل ہونے کی وجہ سانچ کی کھوکھلی بنیادوں کو قرار دیں گے، یہاں تک کہ گالیاں بھی یوں دی جائیں۔  
خدا کرے تجھ پر سانچ کا ظلم ٹوٹے، یا اللہ اسے سانچ کے بچے میں کر، یہ بات ماننے چاہا تو سانچ سر پر چڑھ کر بولے گا اور دعائیں بھی اس قسم کی ہوں گی، پیسہ دیتا جا بابا، خدا تجھے سانچ سے بچائے، یا میرے اللہ مجھے سانچ کی ظالم ہوا سے بچائیو، وغیرہ۔

ثناء حیدر، سرگودھا

### اللہ کی رسی

کیا ذکر بازوؤں کا یہاں سر ہی کٹ گیا ہم تیرگی کے دور میں بھی ثابت قدم رہے حالانکہ مہتاب کا تختہ الٹ گیا

نانوس بن کے جس کی حفاظت ہوا کرے وہ شمع کیا بجھے جس کو روشن خدا کرے نیلے آصف

تو جو مل جائے تو زندگی سنور جائے نہ کرو ستم اتنے کہ کوئی مر جائے

تیرا ملنا اک خواب جیسا اور جینا ہے عذاب جیسا

اس طرف سمندر کے خوفناک تیور ہیں اور ہم گھروندوں میں سپہاں سجاتے ہیں وحشتوں کے صحرا میں کون یہ بتائے گا کس کو یاد رکھتے ہیں کس کو بھول جاتے ہیں

شمیہ رفیق

نہ دنیا سے نہ دولت سے نہ گھر آباد کرنے سے تسلی دی کو ہوتی ہے خدا کو یاد کرنے سے

یہ سوچ میں ڈوبا ہوا ٹھہرا ہوا انداز جیسے بھی آپس میں تعلق نہ رہا ہو مجھ سے تو نہیں رکتے یہ بتے ہوئے آنسو

سدرہ اسلم و ذرا کج

رجیم یار خاں

دقت کے سامنے تصویر بنے بیٹھے ہیں آئینہ گردش دوراں کو دکھانے والے حرام صادق

کھائی کوٹلی جہلم

یہاں کوئی کسی کے جذبات کب دیکھتا ہے ابن آدم و بنت آدم کی چاہ صرف پیسہ ہے

بچپن کتنا سہانا تھا

ہر طرف خوشیوں کا ٹھکانا تھا

آج جو بڑے ہوئے تو یہ جانا

یہ بھی وہ بھی مفاد پرست زمانہ تھا

شاز یہ ہاشم متواتی

جو صلے چھین نہیں سکتے کبھی تعزیروں سے خواب ٹوٹے ہیں کبھی کی تدبیروں سے

چ تو خوشبو سے ہواؤں میں بکھر جائے گا کیسے جکڑو گے اسے اتنی زنجیروں سے

چ بولنے کی اتنی سزا دی گئی مجھے

کیا بات ہے کیا ہو گیا کیوں مجھ سے خفا ہو  
رمشہ ظفر ----- بہاولپور

تنہائی سے باتیں کرتے شام گزاری ہے  
لحہ لہجہ جیتے مرتے شام گزاری ہے  
وہ جانے کس گھر آگن کی رونق بن بیٹھا  
جس کی یاد میں آہیں بھرتے شام گزاری ہے

اے میری جان برسات کے موسم میں روٹھانہ کر  
موسم اور بھی بہت ہیں رونسنے کے لئے

اگر آؤ تو عجب سا پتہ ہے میرا  
دل سے لینا اجازت اور چل پڑنا  
عاصمہ سرور ----- دہاڑی

تنہائی کا زہر پینا ہے مجھے  
تجھے ماں یاد کر کے رونا ہے مجھے  
دنیا کی باتیں جو میرے دل پہ گہرا زخم ہیں  
کہ اس زخم کو بھی پینا ہے تجھے

تو جو رہتا نہ تھا کہ اک پل بھی میرے بغیر  
مدت ہو گئی ہے اب تجھ سے ملے ہوئے

آنکھوں میں آنسو ملتے نہیں  
لوگ زخم لگانے سے باز آتے ہیں  
راہدارشد ----- فیصل آباد

ہوا۔ مت مری گلیوں میں آیا کرد  
آؤ تو اس کی خوشبو بھی لایا کرد  
مت اتنا شور کر مت اتنا تیز چلو  
اسے تو محسوس ہونے دیا کرد

تیرے حسن کے شعلوں سے جلتی ہوں مدتوں  
پھر بھی تیرے قرب کی تلاش میں رہتی ہوں

اوراق پریشاں کے شعلوں کے دیکھنے سے  
چڑیوں کے چپکنے سے پھولوں کے مہکنے سے  
ذہن کے گلستاں میں یہ بات ہے آئی  
شاید کہ باد صبا نے کی ہے انگڑائی  
سرت مصباح ----- لاڑکانہ

تمام عمر تعلق سے منحرف رہے  
تمام عمر اسی کو مگر بچایا ہے  
ہر اعتراض پہ گہری خاموشی  
یہی تو وصف مرے ہمسفر بچایا ہے

لہجہ تھکا تھکا ترا پلکیں جھکی جھکی تری  
اتنی خفیف سی خوشی کتنی صعوبتوں کے بعد  
خوشبو چراغ شاعری پہ ہدیہ تیرے نام ہوں  
تو بھی نہ آسکا اتنی نشانیوں کے بعد

ہم تو یوں اپنی زندگی سے ملے  
اجنبی جیسے اجنبی سے ملے  
ہر وفا ایک جرم ہو گویا  
دوست کچھ ایسی بے رخی سے ملے  
سعدیہ جبار ----- ملتان

تمام شب جہاں جلتا ہے ایک اداس دیا  
ہوا کی راہ میں اک ایسا گھر بھی آتا ہے  
وفا کی کون سی منزل پہ اس نے چھوڑا تھا  
کہ وہ تو یاد ہمیں بھول کر بھی آتا ہے

تم نے پھر بھی زمانے کے چلن سیکھ لئے  
میں تو کچھ بھی نہیں کر پایا محبت کے سوا

کب تک بنے گا ذہن میں لفظوں کے دائرے  
میں مسئلہ نہیں ہوں تو سوچا نہ کر مجھے  
آنسو ممتاز ----- رحیم یار خان  
عشرت غم نے پھیر لیں آنکھیں

اب تیری یاد آ کے بہلائے

عطا میں یوں بھی گیا اپنی عمر سے آگے  
کہ میرے ساتھ میری حسرتوں کا لشکر تھا

عشق گرم گشتہ تو شاید ہی ملے تم کو مباد  
جینا چاہو تو جیو دوسری صورت لے کر  
فریال امین ----- ٹوبہ ٹیک سنگھ  
عمر بھر ذہن میں چکا نہ کوئی لکڑ کا چاند  
چاندنی اب ترے شعلوں میں جلایا جاؤں

اب ڈوب گئی ہیں وہ صدائیں  
لوگوں سے کہو کہ لوٹ جائیں

اگر مگر تھا کوئی پرندہ لہو میں تر  
تصویر اپنی چھوڑ گیا ہے چنار پر  
نازیہ کمال ----- حیدر آباد  
اور دنیا سے بہلائی کا صلہ کیا ملتا  
آئینہ میں نے دیکھا تھا کہ پتھر برے

اب انہیں پرش حالات گزراں گزرے گی  
بدگمانی ہے تو ہر بات گمراں گزرے گی

افتن یہ دیکھتا تھا میں قطار قازوں کی  
مرا ریتیں کہیں دور جانے والا تھا  
مریم رباب ----- خاندوال  
ایک اجنبی کے ساتھ میں کہاں نکل آیا  
یہ تو میری بستی کا راستہ نہیں لگتا

بہت بھی تیز تھی یاروغم حیات کی دھوپ  
ملا جو زلف کا سایہ تو سو گئے ہم بھی

برا نہ مانے لوگوں کی عیب جوئی کا  
انہیں تو دن کا بھی سایہ دکھائی دیتا ہے  
ام خدیجہ ----- شاہدرہ لاہور  
بے وفا ہے ہو زمانے بھر کا  
پھر بھی اچھا ہے زمانے بھر سے

فلک اک عمر میں احساس میں حل ہوتی ہے  
بڑی مشکل سے طاقوں میں دیئے جلتے ہیں

فرمت شوق بن گئی دیوار  
اب کہیں بھاگنے کا رستہ نہیں  
ثناء حیدر ----- سرگودھا  
فلک نے سر پہ کڑے وقت ہاتھ کب رکھا  
جو خیر کی ہو توقع جہاں شر سے مجھے

فرمت ملے تو اپنی سماعت کر  
میرے غموں کی لے بھی تیرے قہقروں میں ہے

کھنی دلوں کی محبت تو شہر بڑھنے لگا  
نئے جو گھر تو ہویدا ہوئے مکاں کیا کیا  
ڈرگن ----- میاں چنوں  
گئے دلوں کا بھی مجھ سے یہی سلوک رہا  
یہ رنگ دیدہ و دل میں نے کب نہیں دیکھے

گنبد کا کیا قصور اسے کیوں کہوں بر  
آیا جدھر سے تیز ادھر ہی پلٹ گبر



راجہ سہج -----  
س: حنا کی محفل میں شرکت چاہتی ہوں پلیز  
اجازت دیجیے؟

ج: اجازت ہے۔  
س: حصول رزق حلال عبادت ہے آج کل کیسے  
سمجھایا جائے؟  
ج: نوٹ دے کر۔

س: جو لوگ حد کی بھی میں جلتے ہیں ان کا علاج  
بتائیں؟  
ج: ان کو جلتے دو جب جل جائیں گے تو خود ہی  
ٹھیک ہو جائیں گے۔

س: آپ کے پاس سے جلتے کی بو کیوں آ رہی  
ہے سچ بتاؤ کون ہے وہ؟  
ج: تم ہی تو ہو جو جل رہی ہو۔

س: میں نے سنا ہے آپ کی عینک بہت موٹی  
ہے، ویسے کیا نمبر ہے؟  
ج: کیا تم اپنی عینک گھر بھول آئی ہو جو میری  
لگانا چاہتی ہو۔

آنسہ ساجد -----  
س: سکون بھی خواب ہوا نیند بھی ہے کم کم،  
کیوں؟

ج: بڑھنسی کی وجہ سے ہے۔  
س: کیوں جان پر بن آئی ہے پھر اے اگر وہ؟  
ج: اس سے بھی پوچھو کہ تم سے پھر کردہ کتنا  
خوش ہے۔

س: شعر کا جواب دیں۔  
سب کو فکر ہے مگر اپنے آپ کی

مجھے فکر ہے تو صرف اس کی  
ج: جواب حاضر ہے۔

یہ راہ محبت کہتے ہیں پر خار بھی ہے اور دور بھی ہے  
لیکن دل مضطرب کیا کیجئے مشتاق بھی ہے مجبور ہے  
فریال امین -----

س: کبھی لمحے صدیوں جتنے ہو جاتے ہیں  
کبھی سال یہ لمحوں میں مک جاتے ہیں  
ج: دنیا بے ثبات میں ہر شے ہے تیز گام  
پردن کے ساتھ رات ہے اور صبح کی ہے شام

س: کبھی آنسوؤں سے ہتھیلیوں پر پڑے چھالے  
کبھی کوئی بے بسی سے انہیں چھپالے  
ج: نازک خیال ال بھی ہیں موجود اے لنگ  
خالی رہا نہیں کبھی دریا حباب سے  
نازیکمال -----

س: انسانیت کی معراج کیا ہے؟  
ج: انسان بننا۔  
س: دنیا کا مشکل مرحلہ کیا ہے؟  
ج: آدمی کا انسان بننا۔

س: تدبیر اور تعمیر میں کتنا فاصلہ ہے؟  
ج: بہت ٹھوڑا۔  
مریم رباب -----

س: یہ جلتے جلتے رک کیوں گئے؟  
ج: تم نے آواز جودی۔  
س: سوچ لو پھر نہ کہنا؟  
ج: سوچ بھی لیا کچھ نہیں کہوں گا۔

ام خدیجہ -----  
س: یہ دنیا والے بڑے بے وفا ہوتے ہیں؟

ج: مجھے تو دنیا والوں میں شامل نہ کرو۔  
س: کل میں نے اسے ڈانٹا تو یہاں بنانے لگا؟  
ج: چھوٹا بھائی ہے پیار سے بھی بات کریں اس

پیارے سے۔  
س: میں جب بھی اس کی طرف دیکھتی ہوں تو  
نظریں جھکا لیتا ہے؟  
ج: ابتداءئے عشق جو ہے نا۔

س: میرا دل زور زور سے ہنسنے کو چاہتا ہے؟  
ج: بڑی خطرناک علامت ہے۔  
ثناء حیدر -----

س: چپ چاپ میری بات سنو؟  
ج: شکر ہے کچھ سنانے کا خیال تو آیا۔  
س: یہ روگ مجھے اس جوگی سے لگا ہے؟  
ج: سانپ کی چال نہ چلیں کیونکہ جوگی پڑ لیتے  
ہیں۔

س: یہ زندگی انسانہ ہے ناول ہے یا ناولٹ؟  
ج: سچی کہانی بھی ہو سکتی ہے۔  
درکن -----

س: میں کیا کروں مجھ سے کچھ نہیں ہو پاتا؟  
ج: سارا دن لینے رہنا یہی حال ہوگا۔  
س: میں نے سنا ہے کہ وہ؟  
ج: کیا سنا ہے اس کے بارے میں۔

س: میں بھی کتنی نادان ہوں؟  
ج: چلو اب پتہ چل گیا۔  
آسیہ وحید -----

س: لوگ آسمان سے کیا چاہتے ہیں؟  
ج: گرمیوں میں ہارن اور سردیوں میں  
دھوپ۔  
س: یہ دنیا والے محبت محبت تو کہتے ہیں لیکن محبت  
کرنے والوں کے دشمن ہوتے ہیں؟

ج: اسے فعل اور قول میں فرق کہتے ہیں۔  
س: اب میرے پاس پوچھنے کے لئے کچھ بھی

نہیں؟  
ج: لیکن میرے پاس جواب دینے کو بہت کچھ  
ہے۔

جویریہ ناصر -----  
س: یہ بزرگ لوگ ہر وقت اپنے جوانی کے قصے  
کیوں سناتے ہیں؟

ج: اس کے سوا ان کے پاس اور ہوتا ہی کیا  
ہے۔

س: وہ پہلے سے آیا کچھ نہ کہا اور چلا گیا؟  
ج: اس نے کسی کے آنے کی آپٹ سن لی ہوگی۔  
س: میں آپ سے ایک سوال کرنا چاہتی ہوں  
کروں یا نہ کروں چلو نہیں کرتے آپ بھی کیا  
یاد کریں گے کسی رئیس سے بالا پڑا تھا؟

ج: اپنے منہ میاں منو بننے کی کوشش نہ کرو۔  
س: عین عین جی تم آخر ہو کیا شے؟  
ج: بس عین عین ہوں جو کھتا ہے کچھ لو۔

ام امین -----  
س: میں اب تک یہ سمجھ نہیں سکی کہ آپ سوالوں  
کے جواب کیا دیتے ہیں؟

ج: جواب سمجھنے کے لئے بھی عقل کی ضرورت  
ہوتی ہے۔

س: چلو جی مان لیتے ہیں کہ آپ بڑے حکیم ہیں  
لیکن ہم بھی کسی سے کم نہیں؟  
ج: یہ میں نے کب کہا ہے آپ کسی سے کم نہیں  
میں تو میں ہی ہوں۔

س: سنو سنو اے دنیا والوں عین عین کی امر  
کہانی؟  
ج: آپس کی باتیں دوسروں کو نہیں بتاتے۔

☆☆☆



### نکتہ چینی

ایک شخص کو بیوی کے کاموں میں نکتہ چیں کرنے کی عادت تھی، ایک روز وہ دفتر سے لوٹا تو اس کی بیوی نے انڈہ اہال کر دیا جس پر اس نے کہا۔

”آج تو میں نے آلیٹ کھانا تھا؟“  
دوسرے روز بیوی نے آلیٹ بنا دیا تو وہ بولا۔

”میں نے تو ابلا ہوا انڈہ کھانا تھا۔“  
تیسرے روز بیوی نے سمجھداری سے کام لیتے ہوئے ایک ساتھ آلیٹ اور ابلا ہوا انڈہ پیش کیا جس پر شوہر ناراض ہونے لگا۔  
”کر دیا ہاں ستیاناس جس انڈے کا آلیٹ بنانا تھا اسے اہال دیا اور جسے اہالنا تھا اس کا آلیٹ بنا دیا۔“

جویریہ ناصر، گجبرگ لاہور

لیکچر روم میں پروفیسر صاحب لیکچر دے رہے تھے کہ ایک بات پر بحث شروع ہو گئی کہ انسان کے مرنے کے بعد رو میں نہیں مرتیں، بلکہ زندہ رہتی ہیں۔

کچھ شاگردوں کا نظریہ تھا کہ رو میں مرنے کے بعد کسی دوسرے جسم میں داخل ہو جاتی ہیں، اسی دوران ایک لڑکے نے اٹھ کر سوال کیا کہ۔  
”اگر میرے مرنے کے بعد میری روح کسی گدھے کے جسم میں چلی گئی تو پھر کیا ہوگا؟“

پروفیسر صاحب اطمینان سے بولے۔  
”تم فکر مت کرو رو میں بھی اپنے پرانے جسم میں واپس نہیں جاتیں۔“  
ام ایمن، گوجرانوالہ

### شجرہ نسب

ابن انشاء اپنے شجرہ نسب پر روشنی ڈالتے ڈالتے ایک پتے کی بات کر جاتے ہیں کہ آدمی کے لئے کیا ایک ہی حوالہ کافی نہیں کہ وہ ابن آدم ہے وہ لکھتے ہیں۔

”پروفیسر محمد ایوب قادری ایک محقق آدمی ہیں، شجرہ نسب مانگ رہے تھے ہمارے ہاں کہاں سے آتا۔“

ہم نے کہا کہ ”بزرگوں میں ہمیں اپنے والد کا نام دیا ہے ایک اور مورث اعلیٰ کا کہ اپنے زمانے کے مشہور پیغمبر تھے، بولے کون؟“

ہم نے حضرت آدم کا نام بتایا تو عقیدت سے ادھ موئے ہو گئے۔ (ابن انشاء کی تصنیف ”خمار گندم“ سے)

عابدہ سعید، مہجرات

### گھانا

کرتے کرتے وہ یہ بات بھی کر گیا مری محبت میں اسے گھانا پڑ گیا پچھلے سال تھا جیب میں لاکھ روپیہ سال کے بعد جیب میں سناٹا پڑ گیا پچھلے سال چلتا تھا سپر اسٹور اب کے سال غلیلہ فٹ ہاتھ پر پڑ گیا

کل تک کھاتا تھا میں مگر فانیو اشار کے آج مجھ کھانا لنگر سے پڑ گیا مری کوٹ پتلون سب مگی ہیں یک نظر مرے پاس کرتا رہ پچامہ گیا گھر کر دیا جب سے میں نے تیرے نام سونا مجھے جب سے سڑک پر پڑ گیا فرخ عامر، جہلم

### ماہر امراض نسوان

ڈاکٹر صاحب ایک مریض کو دیکھتے ہی بولے۔  
”آپ کو تو عینک کی بہت عرصے سے ضرورت ہے لیکن آپ آج نظر چیک کرانے آئیں ہیں۔“

مریض نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔  
”کمال ہے، آپ کو یہ بات میرا معائنہ کرنے سے پہلے ہی معلوم ہو گئی، آپ تو یقیناً تجربہ کار ڈاکٹر ہیں۔“  
ڈاکٹر صاحب نے کہا۔

”تجربے کی تو اس میں کوئی بات نہیں ورنہ آپ بورڈ پڑھ لیتے، میں ماہر امراض نسوان ہوں۔“

فائزہ قاسم، سکھر

### مناسب موقع

ایلیج ڈرامے کے دوران ایک کارندہ ہانپتا ہوا دوڑا دوڑا پرڈیوسر کے پاس پہنچا، پرڈیوسر اس وقت ڈریسنگ روم میں ہیروئن کے ساتھ کولڈ ڈریک لی رہا تھا۔  
”کیا بات ہے اتنے گھبرائے ہوئے کیوں ہو؟“

”سردہ ہیروئنے دلن کو گولی مار دی ہے لیکن دلن نے چیپے سے ہاتھ بڑھا کر مجھے یہ چٹ تھا

دی ہے۔“  
کارندہ نے ایک چٹ پرڈیوسر کو دے دی، اس پر لکھا تھا۔  
”میرے بچا جات پچھلے پردے کے نیچے سے دے جاؤ ورنہ میں گولی کھانے کا باوجود نہیں مروں گا۔“

نعیم امین، کراچی

### نشے باز

ایک شرابی نشے کی حالت میں ایک عورت سے کرا گیا، عورت غصے کی ذرا تیز تھی، گالیوں کے ساتھ ساتھ اس نے شرابی کے دو ہاتھ بھی جڑ دیئے، شرابی کو بھی جواباً غصہ آ گیا اور وہ جل کر گویا ہوا۔

”میں نے پوری زندگی میں تمہارے جیسی بد صورت عورت نہیں دیکھی۔“ عورت شرابی کے اس جملے پر بولی۔

”میں نے بھی اپنی پوری زندگی میں تمہارے جیسا گھٹیا نشے باز نہیں دیکھا۔“  
”میرا نشہ۔“ شرابی ذومعنی انداز میں مسکرایا۔

”میرا نشہ تو صبح تک اتر جائے گا۔“

ہمارے، کراچی

### ریسرچ

”تم دو سال کہاں غائب تھے؟“  
محبوبہ نے طویل جدائی کے بعد ملاقات ہونے پر اشتیاق سے سوال کیا۔  
”کیا تم دوہنی چلے گئے تھے؟“  
”نہیں۔“ عاشق نے جواباً تہقیر لگایا۔

”میں گزشتہ دو سال سے نیورو تھراپی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ فار برین ڈس آرڈر میں مصروف تھا۔“

قلب فلک پر محبت چھا جاتی ہے اس طر  
تا ازل اسے بشر مٹا سکتا نہیں کو  
رکاوٹیں مصائب و آرام تو آتے ہی؟  
مگر نہیں سکتا  
ناداں لوگ سمجھتے ہیں کہ مٹا دینگے محبت  
مگر ایسا ہر گز نہیں کر سکتا کہ  
جن دلوں پر خدا کی حکمرانی ہو  
وہاں پر بشر کا راج چل سکتا نہیں کہ  
فریال امین کی ڈائری سے خوبصورت نظم  
”مشورہ“

اپنی سب خواہشوں کا مٹا کھونٹ کر  
جسم و جان کوئی زندگی بخش دے  
وقت یونہی نہ درود کے ناشاد کر  
یوں نہ اپنی جوانی کو برباد کر  
بیٹے لکھوں کو ہر بل نہاب یاد کر  
خدا کی یاد سے دل کو آباد کر  
مجھ سے بہتر ملے گا تجھے ہمسفر  
اے میری جان جاں!  
گزنہ ہو میں سرے پاؤں میں بیڑیاں  
بنا کے دہن تجھے لاتا میں اپنے گھر  
اے مری دلربا باب نہ آنسو بہا  
بیٹے لکھوں کو جان و وفا بھول جا  
بیٹے لکھوں کو جان و وفا بھول جا  
یوں سمجھنا کہ ماضی اک خواب تھا  
اک حسین خواب تھا  
نازیہ کمال کی ڈائری سے ایک نظم  
تم سے اچھا تو یہ چاند ہے

مست مصباح کی ڈائری سے ایک نظم  
”دستخط“

جب سے میرے  
دل کے کورے کاغذ پر  
تو نے دستخط کیے ہیں

تب سے  
میں نے ہر ممکن کوشش کی ہے کہ  
یہ میری نفرت کی ریزہ سے  
مٹ جائیں، ختم ہو جائیں  
لیکن میں ناکام ہو چکی

نہ یہ جیتا ہے اور  
نہ کسی اور کا نام اس پر لکھا جاتا ہے  
سعد یہ جبار کی ڈائری سے خوبصورت نظم  
میں اپنی ذات  
انا اور خودداری کے سپرد کیے  
منزل بہ منزل چلتی جا رہی تھی

یہ سوچے بنا کہ  
بہمی کبھی ذات کی حفاظت کے لئے  
انا اور خودداری بھی قربان کرنا پڑتی ہے  
کبھی اک لمحہ کی خوشی کی خاطر  
بڑا لکھوں کی غموں کی مسافت  
بہمی طے کرنا پڑتی ہے  
شازیہ ہاشم متوالی کی ڈائری سے ایک غزل  
خوشیوں کی ضمانت دے سکتا نہیں کوئی  
جذبوں پر پہرہ بٹھا سکتا نہیں کوئی  
پیار تو اک عجب خوشبو میرا جذبہ ہے  
خشیوں اس سے جذبہ ہو سکتا نہیں کوئی

سجاد گل صاحب نے ایک دن موڈ میں آکر  
فرمایا۔

”میری بیوی اتنی پڑھی لکھی ہے کہ وہ کسی  
بھی موضوع پر گھنٹہ بھر بات چیت کر سکتی ہے۔“  
جواب میں اقبال حسین نے فرمایا۔  
”اس میں حیرت کی کیا بات ہے یہی کام  
ان پڑھ عورت بھی کر لیتی ہے اور اس کے لئے  
موضوع کی شرط نہیں ہوتی۔“

رمشہ ظفر، بہاول پور  
حقیقت

ایک ماہر نفسیات بہت زور و شور سے اپنی  
خوبیاں بیان کر رہے تھے۔  
”میں کبھی کسی شخص پر صرف ایک نظر ڈال کر  
یہ بتا سکتا ہوں کہ وہ میرے بارے میں کیا سوچ  
رہا ہے۔“

”لیکن یہ جان لینے کے بعد تو آپ کو کوئی  
شرمندگی ہوتی ہوگی۔“  
ایک آدمی انہیں ٹوکتے ہوئے بولا۔

عاصمہ سرور، وہاڑی  
سنہری بات

کشتی کا پانی میں ہونا ایک فطری چیز ہے  
مگر  
پانی کا کشتی میں ہونا خطرے کی بات ہے  
اس لئے  
دنیا کے دل میں رہو  
مگر

دنیا کو اپنے دل میں مت رکھو  
شازیہ ہاشم میوالی، کھڈیاں خاص

☆☆☆

”مائی گاڈ“ محبوبہ حیرت زدہ رہ گئی۔  
”تمہارے پاس تو میڈیکل نہیں تھی پھر  
دماغی امراض کے اسپتال میں تم کیا کام کرتے  
رہے؟“

”میں وہاں عشق کرتا رہا۔“  
عاشق ہسٹریائی انداز میں تہقیر لگایا۔  
”دماغی ماہرین مجھ پر ریسرچ کر رہے تھے۔“  
نیلیہ آصف، قصور

قریب ترین راستہ

ایک دوست مند آدمی کو مچھلی شکار کا بہت  
شوق تھا، ایک روز وہ کچھ تو انتظار کی کوفت سے  
بچنے کے لئے اور کچھ سردی سے خود کو بچانے کے  
خاطر تھوڑی تھوڑی دیر بعد شراب پیتا رہا، شام کو  
جب اس نے اپنا سامان سمیٹ کر کار میں رکھا تو  
وہ بالکل ہوش سے بے گانہ ہو رہا تھا۔

کار چلانے کے کچھ سینکڑ بعد ہی جب پانی  
اس کے پیروں کو چھونے لگا تو اس نے سوچا۔  
”اف یہ تو بارش آگئی ہے میں نے سوچا  
بھی نہ تھا کہ آج پانی برسنے لگے گا، خراب مجھے  
جلد سے جلد اپنے گھر تک پہنچنا چاہیے۔“

اتنے میں اس کی نظر ایک کسان پر پڑی جو  
اپنے گھر جا رہا تھا، رہنمائی کے لئے اس نے  
کسان سے پوچھا۔  
”بھئی شہر تک پہنچنے کا قریب ترین راستہ  
کون سا ہے؟“

کسان نے جواب دیا۔  
”میری رائے میں سڑک کا راستہ ٹھیک  
رہے گا، ندی میں کار چلاتے ہوئے جانیں گے تو  
شہر بہت دیر میں پہنچیں گے۔“

شمینہ رفیق، کورنگی کراچی

زور گفتار

جو نظر نہ آتا ہے  
تم سے اچھے تو یہ ستارے ہیں  
جودل کی بات تو سننے ہیں  
تم سے اچھے تو یہ آنسو ہیں  
جو سدا آنکھوں میں رہتے ہیں  
تم سے اچھی تو تمہاری یاد ہے  
جو بھولتی ہی نہیں  
مگر پھر بھی دل کہتا ہے  
کہ تمہارے جیسا کوئی بھی نہیں  
اس جہاں میں تمہیں بھی نہیں  
مریم رباب: کی ڈائری سے وہی شاہ کی غزل  
اپنے احساس سے چھو کر مجھے صندل کر دو  
میں کہ صدیوں سے ادھورا ہوں مکمل کر دو  
نہ تمہیں ہوش رہے اور نہ مجھے ہوش رہے  
اس قدر ٹوٹ کے چاہو مجھے پاگل کر دو  
تم ہتھیلی کو مرے پیار کی مہندی سے رنگو  
اپنی آنکھوں میں مرے نام کا کاجل کر دو  
اس کے سائے میں مرے خواب دمک انھیں گے  
مرے چہرے پہ مہکتا ہوا آئینل کر دو  
دھوپ ہی دھوپ ہوں میں ٹوٹ کے برسوجھ پر  
اس قدر ہر سو میری روح میں جل ٹھل کر دو  
اُم خدیجہ: کی ڈائری سے ایک غزل  
ہاندہ میں ہاتھ پہ سینے پہ سکا لیں تم کو  
جی میں آتا ہے تعویذ بنا میں تم کو  
پھر تمہیں روز سنواریں بڑھتا دیکھیں  
کیوں نہ آنگن میں چنبیلی سا لگا لیں تم کو  
کیا عجب خواہش اٹھتی ہیں ہمارے دل میں  
کر کے منا سا ہاتھوں میں اچھا لیں تم کو  
کبھی خوابوں کی طرح آنکھ کے پردے میں رہو  
کبھی خواہش کی طرح دل میں بلا لیں تم کو  
اس قدر ٹوٹ کے تم پہ ہمیں پیار آتا ہے  
اپنی ہانہوں میں بھرے مار ہی ڈالیں تم کو

ثناء حیدر: کی ڈائری سے ایک خوبصورت نظم  
سوچ نگر کے ہاسیو  
مت مرادل پریشان کرو  
وہ لوٹ نہیں آئے گا  
مت دل میں چراغ جلایا کرو  
وہ آیا بھی تو  
دلیر سے لوٹ جائے گا  
جب بھی مرے نگر آئے گا  
مرادل بھی اب تو ہے  
قید و بند تجرے میں  
وقت کی فصیل کا  
لگا ہے تالاسا  
وہ لوٹ نہیں آئے گا  
مت چراغ امید جلایا کرو  
دُرخن: کی ڈائری سے ایک نظم  
اسے اپنے قرار کی فکر تھی  
وہ جو میرا واقعہ حال تھا  
وہ جو اس کی صبح عروج تھی  
وہ ہی میرا وقت زوال تھا  
میری بات کیسے وہ مانتا  
میرا حال کیسے وہ جانتا  
وہ تو خود منزل کے سفر میں تھا  
اسے روکنا بھی مجال تھا  
کہاں جاؤ گے مجھے چھوڑ کر  
میں پوچھ پوچھ کر تھک گئی  
وہ جواب مجھے نہ دے سکا  
وہ تو خود سراپا سوال تھا  
کیا اس کا ہیبت حسن تھا  
کیا اس کا رنگ جمال تھا  
وہ ستارہ کہاں کھو گیا  
جو اپنی مثال آپ تھا  
وہ ملا تو صدیوں بعد بھی

میرے لب پہ کوئی گلہ نہ تھا  
میری چپ نے اسے رلا دیا  
جسے گفتگو میں کمال تھا  
جو یہ یہ ناصر: کی ڈائری سے ایک غزل  
عکس خوشبو ہوں بکھرنے سے روکے کوئی  
اور بکھر جاؤں تو مجھ کو نہ سمیٹے کوئی  
کانپ اُٹھی ہوں میں یہ سوچ کر تنہائی میں  
میرے چہرے پہ تیرا نام نہ پڑھ لے کوئی  
جس طرح خواب میرے ہو گئے ریزہ ریزہ  
اس طرح سے نہ بھی ٹوٹ کے بکھرے کوئی  
میں تو اس دن سے ہراساں ہوں کہ جب حکم ملے  
خشک پھولوں کو کتابوں میں نہ رکھے کوئی  
اب تو اس راہ سے وہ شخص گزرتا بھی نہیں  
اب کس امید یہ دروازے سے جھانکے کوئی  
کوئی آہٹ کوئی آواز کوئی چاپ نہیں  
دل کی گلیاں بڑی سنسان ہیں آئے کوئی  
سیکھنے صدف: کی ڈائری سے ایک نظم  
وہ مجھ سے محبت کرتا ہے  
میں اس کے خواب دیکھتی ہوں  
اس کے انتظار میں بے قرار رہتی ہوں  
مگر اقرار کرتے وقت ایک انجانی سی طاقت  
مجھ روکے رکھتی ہے  
وہ ہمیشہ یہی کہتا ہے  
تو زدے اس زنجیر کو  
مگر رشتوں اور اعتماد کی یہ زنجیر  
مجھے پیاری ہے  
اس کی محبت سے بھی  
عابدہ سعید: کی ڈائری سے ایک خوبصورت نظم  
جو میری آنکھوں سے خواب دیکھو  
تو ایک بھی شب نہ سو سکو گے  
کہ لاکھ چاہوں نہ سو سکو گے  
ہزار چاہوں تو رو سکو گے

کہ خواب کیا ہیں عذاب ہیں یہ  
میری دکھوں کی کتاب میں یہ  
رفائتیں ان میں چھوٹی ہیں  
محبتیں ان میں روکتی ہیں  
پہنچتی ہیں ان میں وحشتیں سی  
ازیتیں ان میں پھوٹی ہیں  
انہی کے ڈر سے خزاں میں جذبے  
انہی سے شائیں سی ٹوٹی ہیں  
غموں کی بندش میں ہیں خواب میرے  
دکھوں کی بارش ہیں خواب میرے  
اہل رہا ہے دکھوں کا لاوا  
رہن آتش ہیں خواب میرے  
خیال سارے بھل گئے ہیں  
سکتی خواہش ہیں خواب میرے  
اکھڑتی سائیں ہیں زندگی کی  
لہو کی سازش ہیں خواب میرے  
جو میری آنکھوں سے خواب دیکھو  
تو ایک بھی شب نہ سو سکو گے  
فرح عامر: کی ڈائری سے ایک نظم  
”اک سہنا“  
خیالوں کی بستیوں میں دور نکل جائیں  
خوابوں کے تکیوں سے من کو بہلائیں  
آنکھوں میں سینے لے کر تم بھی جب  
میرے راستے سے گزر دو تو میرے  
ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر چمکڑی پر  
مل کر چلیں اور اس زمانے سے  
دور بہت دور اک ایسے  
دیس میں کل جائیں جہاں  
یہ زمانہ یہ سماج یہ دستور  
میرے اور تیرے ترچہ نہ آئیں  
جہاں جنگلی پھولوں کا بھو  
☆☆☆





## چکن جیلریزی

کا استعمال ضرور کریں۔ سپیکٹھی چکن اور پراؤن

اشیاء	آدھا کلو	چکن (بغیر ہڈی)	آدھا کلو
گرم مصالحہ	چوتھائی کھانے کا چمچ	چکن بغیر ہڈی کے	تین کپ
ادرک پسا ہوا	آدھا کھانے کا چمچ	چکن بخنی	دو عدد کی ہوئی
لہسن پسا ہوا	آدھا کھانے کا چمچ	پیاز	ایک کپ
کالی مرچ پسی ہوئی	آدھا کھانے کا چمچ	ٹماٹر پیسٹ	Grated
سویا ساس	دو کھانے کے چمچ	پیپر	آدھا کلو
پیاز ٹی ہوئی	تین عدد	سفید سرکہ	ایک کلو
ٹماٹر کٹے ہوئے	تین عدد	سویا سوس	ایک کلو
ہری مرچ	تین عدد	کالی مرچ پسی ہوئی	ایک کھانے کا چمچ
شملہ مرچ ٹکڑوں میں کٹی ہوئی ایک عدد	دو کھانے کے چمچ	ادرک پسی ہوئی	ایک چائے کا چمچ
شکر یا سفید سرکہ	ایک چائے کا چمچ	نوڈلز	ایک پاؤ کا بکٹ
چلی سوس		کھن	پاؤ کپ
ترکیب		میدہ	آدھا پاؤ
فیل گرم کر لیں اور مرغی کو اس میں فرائی کر		گاجر کٹی ہوئی الٹی ہوئی	ایک عدد
لیں، براؤن ہو جانے پر مرغی کو نکال کر زائد تیل		مٹا بلے ہوئے	آدھا کپ
کاغذ میں جذب کر لیں، پھر کسی برتن میں ڈال کر		شملہ مرچ کٹی ہوئی	دو عدد
ہلکی آگ پر چولہے پر رکھ دیں پھر اس میں ادرک،		نمک	حسب ذائقہ
لہسن، پیاز، ٹماٹر، شملہ مرچ ڈال کر تھوڑی دیر		چائیز سالٹ	ایک چائے کا چمچ
پکائیں اس میں نمک، کالی مرچ اور ہلدی پاؤ ڈر		ترکیب	
جھی ملادیں اس کے بعد ٹماٹر پیسٹ، سرکہ اور سویا		فیل کو گرم کر لیں اور حسب ذائقہ پسی ہوئی	
سوس اور چلی سوس شامل کر کے دس منٹ تک		ادرک ڈال کر بھون لیں تاکہ وہ براؤن ہو	
مزید پکائیں، چولہا بند کرنے کے بعد اوپر سے پسا		جائے، اس میں مرغی ڈال کر براؤن ہونے تک	
ہوا گرم مصالحہ چھڑک دیں۔		فرائی کریں، آج بکری رکھیں تاکہ مرغی گل جائے۔	
بچے مزیدار چکن جیلریزی تیار ہے،		اس کے بعد ساری سبزیاں، کالی مرچ،	
کھانے کی لذت بڑھانے کے لئے چلی سوس		چائیز سالٹ، کھن، بخنی اور ٹماٹر پیسٹ مرغی	

میں شامل کر دیں اور اس کو مسلسل بجپے سے ہلاتی رہیں اور اس وقت تک پکائیں جب تک پانی خشک نہ ہو جائے۔

نوڈلز کو علیحدہ سے پانی میں ابال لیں اور ٹھنڈا ہونے پر مرغی اور سبزیوں کے ساتھ کس کر لیں اور تھوڑی دیر میں کسی برتن میں نکال لیں۔

برتن میں نکالنے کے بعد اس کے اوپر Grated پیپر ڈالیں اور پانچ سے سات منٹ کے لئے اوون میں رکھ دیں۔

بچے مزیدار چکن اسپیکٹھی تیار ہے مزید ذائقہ حاصل کرنے کے لئے سویا ساس کے ساتھ پیش کریں۔

چکن / شاشلیک

اشیاء

چکن

نمک، مرچ

کالی مرچ، لال مرچیں

سفید سرکہ

سویا ساس

تیل

ٹماٹر

پیاز

شملہ مرچ

چائیز سالٹ

ادرک پیسا ہوا

لہسن پسا ہوا

ترکیب

چکن کو ایک کھانے کا چمچ لہسن اور ادرک کا پیسٹ ڈال کر لہا لیں، پیاز، شملہ مرچ اور ٹماٹر کو ایک سائز کے چھوٹے ٹکڑوں میں کاٹ لیں، تیل گرم کر کے مرغی کا ہلکا فرائی کریں پھر اس میں نمک، کالی مرچ، چائیز سالٹ، لال مرچیں،

اشیاء

چاول

مرغی بغیر ہڈی کے الٹی ہوئی سو گرام

انڈے

سویا ساس

سفید سرکہ

گاجر کٹی ہوئی

چائیز سالٹ

نمک

کالی مرچ پسی ہوئی

ہری پیاز

بند گوشتی

ترکیب

چاول ابال کر الگ کر لیں خیال رہے کہ چاول آدھے کپے اور آدھے ابلے ہوئے ہوں تیل گرم کریں اور انڈے تل کر اس کے چھو۔

ٹکڑے کر لیں، چکن کے ٹکڑے، ہری پیاز، بند گوشتی، گاجر، کالی مرچ، نمک، چائیز سالٹ سویا سوس، سرکہ بخنی میں ملائیں اور پانچ سے سات منٹ تک پکائیں، چاول شامل کر کے آنے تک چھوڑ دیں، چکن فرائیڈ رائس تیار ہوا سلا اور چلی سوس کے ساتھ نوش فرمائیں ذائقہ کو بڑھانے کا۔

السلام علیکم!

آپ کے خطوط ان کے جوابات کے ساتھ حاضر ہیں آپ سب کی صحت و سلامتی کی دعاؤں کے ساتھ۔

عہد حاضر میں ذرائع ابلاغ کی حیران کن ترقی نے فاصلوں کو سیٹ دیا ہے، موبائل فون، انٹرنیٹ اور ٹی وی چینلوں ہماری زندگی کا لازمی جز بن چکے ہیں، ایک خبر منٹوں میں پوری دنیا کا سفر طے کر لیتی ہے، لیکن افسوس کہ ایک ایک لمحہ سے باخبر ہم آج بھی زندگی کی بنیادی سچائیوں سے نا آشنا ہیں، بغلوں کے انبار، مختلف آراء کے جھوم میں حق اور صداقت تک پہنچنا نہ ممکن ہی ہو گیا ہے، سبقت لے جانے کی دوڑ میں میڈیا نے ذہنوں کو جس انتشار اور افراتفری کیفیت میں مبتلا کر رکھا ہے، اس سے کوئی سوچ کوئی نظریہ مستحکم نہیں ہو پا رہا، بولنے، سونے اور اظہار رائے پر پابندی نہیں لگائی جاسکتی لیکن آزادی اظہار کا یہ مفہوم بھی نہیں ہے کہ اخلاق اور شائستگی کو بالائے طاق رکھ دیا جائے، ملک کی سالمیت اور قومی اداروں کو سلامتی کو خطرے میں ڈال دیا جائے، صحافت کا مقصد عوام کے پیچھے چلنا نہیں، ان کی رہنمائی کرنا ہے، کوئی بھی چیز خواہ کتنی بھی اچھی کیوں نہ ہو، اس کا غلط استعمال نقصان کا باعث بن سکتا ہے، میڈیا کو کچھ حدود کا تعین کرنا ہوگا، کچھ معیار مقرر کرنا ہوں گا تب ہی ایک مستحکم معاشرہ وجود پا سکے گا۔

اپنی دعاؤں میں یاد رکھیے گا اپنا بہت سا

خیال رکھئے گا اور ان کا بھی جو آپ سے محبت کرتے ہیں آپ کا خیال رکھتے ہیں۔  
آئیے آپ کے خطوط کی محفل میں جلتے بین درود پاک، استغفار اور تیسرے طے کلاؤ کرتے ہوئے، اللہ تعالیٰ ہم سب کے لئے آسانیاں پیدا کرے آمین یا رب العالمین۔  
گزشتہ ماہ کا شمار سالگرہ نمبر تھا جسے قارئین نے بے حد پسند کیا ہم اس کے لئے ہم آپ کے شکر گزار ہیں۔

یہ پہلا خط فریدہ ضیاء کا اداکارہ سے موصول ہوا ہے وہ اپنی رائے کا اظہار کچھ یوں کرتی ہیں۔

سالگرہ کے حوالے سے سرورق پسند نہیں آیا، اسلامیات والا حصہ میرا سب سے پسندیدہ حصہ ہے، حمد و نعت اور پیارے نبی کی پیاری باتیں دل و روح کو تازگی بخشتی ہے۔

انشاء نامہ میں بڑے عرصے کے بعد انشاء جی کی شاعری پڑھنے کو ملی، آگے بڑھے تو پردین شاکر بڑے خوبصورت انداز میں انشاء جی کے بارے میں اپنے احساسات کا اظہار کر رہی تھیں، آگے تو زیہ آپ کی سالگرہ سروے کے حوالے سے مصنفین کو گھیرے ہوئے تھیں، سروے کے سوالات اور مصنفین کے جوابات بے حد بھائے، اس کے بعد اپنے پسندیدہ نام دل گزیدہ کی طرف بڑھے بہت خوب مریم جی کہانی کو آپ بڑی خوبصورتی سے لے کر چل رہی ہیں آپ کی تحریر کا

ہر کردار ہی اہم ہے، بس ایک شکایت کہ آپ نے ناول کے صفحات کم کر دیئے ہیں کیوں؟ ”سی رقص“ بشری سیال کی تحریر بے حد دلچسپ ہے جب کہ خمیں اختر کا ناول ”شہر دل کے راستے“ کا نہ صرف عنوان خوبصورت ہے بلکہ اس کی کہانی بھی بڑی مزے کی ہے آپ کی جگہ آپ سے یہ پوچھنا ہے کہ یہ کیا کہ دو ناول تھے اور دونوں قسط وار ایسا کیوں؟ پلیز ایک قسط وار دیا کریں اور ایک مکمل، مکمل ناول میں خدیجہ اختر کا ناول ”وہ جو جوتوں کا قرار تھا“ پسند آیا، اس سے پہلے خدیجہ اختر کا نام حنا میں نظر نہیں آیا یقیناً نئی مصنفہ ہے اور اگر نئی ہے تو ان کی یہ پہلی کاوش بے حد اچھی ہے، کچھ خامیاں ضرور نظر آئیں مگر مصنفہ کے نئی ہونے کے وجہ سے وہ نظر انداز کی جاسکتی ہیں ویلڈن خدیجہ اختر، اللہ تعالیٰ آپ کو مزید کامیابیاں عطا فرمائے آمین۔

سہاس گل کے ناول ”میری زندگی ہے نغمہ“ کا آخری حصہ بھی پسند آیا سہاس گل نے اس کا اینڈ وہی کیا جیسا ہم چاہتے تھے سہاس گل مبارک باد۔

”پر بت کے اس پار کہیں“ نایاب جیلانی کے سلسلے وار ناول کوئی خاص پسند نہیں نہ جانے نایاب نے یہ تحریر کیوں لکھی ورنہ ان کے کریڈٹ پر تو بہترین تحریریں ہیں۔

افسانوں میں ”میں چائے اور تم“ حیات بخاری اور سندس جیپس کا ”اس بے خودی میں“ بے حد پسند آیا، وجہ بخاری نے بھی اچھا لکھا۔ مستقل سلسلے ہمیشہ کی طرح بہترین تھے۔

آپ کی حنا کافی عرصے سے پڑھ رہی ہوں لیکن اپنی رائے کا اظہار پہلی مرتبہ کر رہی ہوں امید ہے جگہ چلتے گی اور آخر میں ایک فراموش پلیز پلیز خدیجہ تبسم کو کہیں برآمد کریں وہ

کہاں غائب ہو گئی ہیں، عرصہ دراز ان کی کوئی تحریر نہیں دیکھی۔

فریدہ ضیاء سب سے پہلے تو اس محفل میں خوش آمدید، جنوری کے شمارے کو پسند کرنے، شکر یہ آپ کی پسندیدگی ان سطور کے ذریعے مصنفین کو پہنچائی جا رہی ہے، مدیجہ تبسم شادی کے بعد بچوں اور گھر کی مصروفیت میں کم ہیں انشاء اللہ جیسے ہی تا م ملادہ حنا میں اپنی تحریر کے ساتھ آئیں گی، اپنی رائے سے آگاہ کرنی رہے گا ہم منتظر رہیں گے شکر یہ۔

افراء الیاس: مرید کے ضلع شیخوپورہ سے لکھتی ہیں۔

ناٹل پر اس بار مائل کی تصویر کچھ دھندلی سی دکھائی دی، سروے میں رائٹرز کو پڑھ کر خوشی ہوئی، بشری سیال اور ریحانہ آفتاب نے چونکہ تب سے لکھنا شروع کیا ہے جب سے میں نے حنا پڑھنا شروع کیا اس لئے انہیں دیکھ کر زیادہ اچھا لگا۔

”وہ جو جوتوں کا قرار تھا“ دوسروں کے حق میں تو انسان بول ہی لیتا ہے مگر جب خود کو دوسروں کی نظروں سے گرنے سے بچانا پڑتا ہے تو تب کتنی بے بسی کا عہد آن وارد ہوتا ہے اپنا ہی یقین ہاتھوں سے چھوٹنے لگتا ہے جب سے آپ ہی کو قصور وار ٹھہرا رہے ہوں اور جب انسان اپنے فیعلوں کا اختیار اللہ کے ہاتھ میں دے دے تو سزا اور جزا کا اختیار دکھ بھی نہیں سکتا سو خود کو بے نیاز بنائے کیونکہ انسان کے فیعلے اللہ سے بڑھ کر اور کبھی کیسے سکتا ہے جبکہ ہوتا ہی جو اللہ تعالیٰ چاہتے ہیں۔

”سی رقص“ میں عیسیٰ احمد کے ساتھ کچھ غلط نہیں ہو رہا؟ غلط تو صوفیہ جیسی عورت کے ساتھ ہونا چاہیے جو دوسروں کی زندگی اجاڑنے پر تلی

ہوئی ہے عروبہ کے ساتھ اتنا براسلوک کیا۔  
 ”راہ ہدایت“ رطل کو آخر اپنے کھنڈی سزا  
 مل ہی گئی حالانکہ مریم اور آمنہ بی بی پر غلوس  
 دو تین خوش قسمت لڑکیوں کو ملا کرتی ہیں جو بنا  
 کچھ چاہے رطل کو سیدھا راستہ جانے کی کوشش  
 کرتی رہیں، ”پریت کے اس پار کہیں“ شیل برکا  
 ناک چڑھا کر بات کرنے کا انداز بہت اچھا لگتا  
 ہے، ہیام اور نشہ کی ٹوک جھونک، حبیبہ کا جھلا  
 کڑھنا اور عروبہ کا بغض و حسد کہیں اسے خود ہی نہ  
 لے ڈوبے، جہاندار فرید سے شاہ کا جلو کے  
 میدان میں اترنے کا انداز بیاں نایاب جیلانی کا  
 ناول پڑھنے کے لئے تو ایک شراعت نام کی ضرورت  
 ہونی چاہیے اور موڈ بھی وہ والا جس میں غصے سے  
 پیشانی کی رکیں جلی ہوں اور چہرہ ضبط سے صراخ  
 پڑھ رہا ہو اور پریت کے اس بار پڑھتے پڑھتے  
 منہ سے بے اختیار پٹکی کا فوارہ چھوٹ پڑے۔  
 افسانے بھی سب کے سب بیٹ تھے ام  
 مریم کے ناول کے کردار اتنے جذباتی ہوتے ہیں  
 دوسرے ہی پل طوفان کھڑا کر دیتے ہیں ان کے  
 کرداروں کے جذبات بیان کرنے کا انداز بہت  
 خوبصورت ہوتا ہے جس بنا پر میں ان کے ناولز  
 پڑھتی ہوں حنا میں ہی چھپنے والا ان کا سلسلے وار  
 ناول ”اک جہاں اور بھی ہے“ بہت مزے کا لگا  
 تھا، کچھ دن پہلے میں نے آپ کے ادارے میں  
 کال کر کے اپنی تحریر کے بارے میں پوچھا  
 ”رجسٹر“ یہ جواب سن کر دھچکا لگا، کس بنا پر  
 رجسٹر ہوا پلاٹ کزور تھا۔  
 اقراء الیاس خوش رہیں، جنوری کے شمارے  
 کے لئے آپ کا تبصرہ بے حد پسند آیا، آپ کی  
 تعریف ان سطور کے ذریعے مصنفین کو پہنچانی جا  
 رہی ہیں، حنا میں شائع ہونے والا ناول ”اک  
 جہاں اور ہے“ ام مریم کا نہیں سدرۃ المصلیٰ کا تھا،

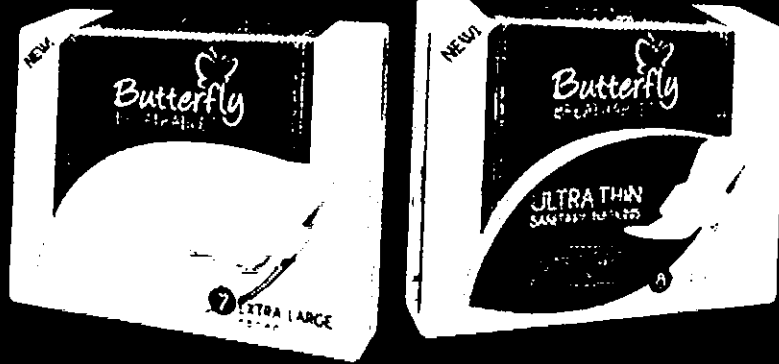
تحریر کے بارے میں جاننے کے لئے آپ بائج  
 تاریخ کے بعد گیارہ سے تین کے درمیان فون کر  
 لیجئے گا شکریہ۔  
 ایس کے بھتی: کپرائے ڈیرہ خاڑی خان سے  
 موصول ہوئی ہے وہ دھکتی ہیں۔  
 ماہنامہ حنا کو چالیسویں سالگرہ بہت بہت  
 مبارک ہو رب سے دعا ہے کہ حنا یونہی ترقی کی  
 میزبانی پر جاری رہے آمین۔  
 سب سے پہلے مسئلہ دیکھئے، جو کہ  
 واقعی تعریف کے لائق تھے، کس قیامت کے یہ  
 نامے پھرتے ہیں اس کے علاوہ حاصل مطالعہ،  
 رنگ حنا، حنا کی مغل بھی چھائے رہے۔  
 ”کچھ باتیں ہماریاں“ میں ہائل ٹھیک کہا  
 کیا پڑھنے کے بعد ہم نے بھی دل سے کہا  
 آمین، حمد و نعت کے بعد پیارے نبی کی پیادری  
 باتیں پڑھ کر ہمیشہ کی طرح ایمان تازہ ہوا، اللہ  
 تعالیٰ ہم سب کو ہدایت دے آمین، ابن انشاء  
 کے لئے ہر موقع پر خصوصی دعا میں لگتی ہوں،  
 ان کی بہترین غزل شائع کرنے پر شکریہ، انہوں  
 نے بہترین ادب تخلیق کیا، اللہ ان کے درجات  
 میں اضافہ فرمائے آمین۔  
 سب سے پہلے ہمیشہ کی طرح اسٹارٹ ام  
 مریم کی ”دل گزیدہ“ سے کیا جو کہ ایک واقعی میں  
 لا جواب کہانی ہے، نایاب جی کی ابھی پڑھی نہیں  
 سو معذرت، مجھے خط بھیجنے کی جلدی ہے نا، مکمل  
 ناول دونوں اچھے تھے، سہاس گل کو اتنا طویل  
 ناول لکھنے کا شوق کیوں ہے؟ سلسلے وار ناول لکھنا  
 آپ کو اچھا لگتا ہے کیا؟ خدیجہ اسحق کا ناول ”وہ  
 جو محبتوں کا قرار“ بیٹ تھا، اس کے علاوہ  
 انسانوں میں سندس جیس کا فسانہ بہترین تھا، حیا  
 بخاری مجھے ویسے بھی پسند ہیں، ان کی کہانی اچھی  
 لگی، واقعی میں حیا جی چائے کے تو ہم بھی فین

ہیں، باقی شمارہ زیر مطالعہ ہے، ارے ہاں سروے  
 سالگرہ نے سال کا تحفہ تھا، جو نوزیہ آئی ہمیشہ دیتی  
 ہیں، شکریہ نوزیہ آئی اس گفٹ کے لئے۔  
 نوزیہ آئی میں آپ کو دو کہانیاں بھیج رہی  
 ہوں پڑھ کر ضرور ضرور رائے دیں، آپ کی  
 مہربانی ہوگی، آپ کے جواب کی میں شدت سے  
 منتظر رہوں گی۔  
 ایس کے بھتی میرے نام کا مخفف ہے، میں  
 اسی نام سے پہچان بنانا چاہتی ہوں، نوزیہ آئی  
 پہلی مرتبہ شرکت پر امید ہو کر کر رہی ہوں کہ آپ  
 مایوس ہرگز نہیں کریں گی۔  
 ایس کے بھتی خوش آمدید، جنوری کے  
 شمارے کو پسند کرنے کا شکریہ آپ کی تحریریں  
 اچھی ہیں، انشاء اللہ جلد شائع ہوں گئیں لیکن  
 یہاں ہم آپ سے ایک بات ضرور کہیں گے کہ  
 آپ اگر اپنے اصلی نام سے نہیں لکھنا چاہتی تو  
 کوئی بات نہیں مگر یہ ایس کے بھتی کچھ مناسب  
 نہیں پلیز آپ اپنا تخلیقی نام ایسا رکھیں کہ وہ  
 پڑھنے میں اچھا لگے شکریہ۔  
 عاکشہ چوہدری ہاشم: ملتان سے لکھتی ہیں۔  
 جنوری 2018ء کا شمارہ کافی انتظار کے بعد  
 نو تاریخ کو ملا، ٹائٹل دیکھ کر دل ہار باغ ہو گیا  
 سب سے پہلے حمد و نعت اور پیارے نبی کی پیادری  
 باتیں پڑھیں، روح و قلب کو سکون میسر ہوا ”کچھ  
 باتیں ہماریاں“ میں عدل و انصاف کے حوالے  
 سے تحریر بے حد پسند آئی، انشاء جی کی مغل میں  
 پہنچے تو انشاء جی کے کیا کہنے۔  
 ”دل گزیدہ“ ام مریم کا بہت زبردست جا  
 رہا ہے ان کا ایک ایک لفظ دل پر اثر کرتا ہے۔  
 ”پریت کے اس پار کہیں“ نایاب جیلانی کا  
 بہت شاندار قسط رہی اس ماہ، نایاب جیلانی تو چھا  
 مگی ہے، ناولت میں ”شہر دل کے راستے“

تحسین اختر کیا کمال کا لکھا ہے ”وہ جو محبتوں کا  
 قرار تھا“ خدیجہ اسحق کا مکمل ناول بہت ہی اعلیٰ  
 جتنی تعریف کی جائے کم ہے باقی تمام سلسلے بھی  
 بہت زبردست تھے، تو جناب آپ آتی ہوں میں  
 اپنی تحریر کی طرف میں پہلے ایک اور ماہنامے میں  
 لئے دو ناول لکھ چکی ہوں اور پسند بھی کیے گئے  
 ہیں لیکن حنا کے لئے یہ میری پہلی تحریر ہے پہلا خط  
 اور پہلی ہی تحریر گو میں بچپن سے مسلسل حنا کو پڑھتی  
 آرہی ہوں بلکہ زندگی میں پہلی دفعہ جس پرچہ ک  
 میں نے چھوٹا تھا اور زندگی میں پہلی بار پڑھا تو  
 جب میں انھیں کلاس میں بھی وہ حنا ہی تھا، جس  
 وقت لفظوں سے آشنائی تھی لیکن مفہوم سے غیور  
 لیکن اب بی اے کرنے کے بعد میری شادی ہ  
 مگی ہے اور میں ایک بچی کی ماں بھی ہوں یہ کہ  
 میری حنا میں دانشمندی بہت پرانی ہے، مجھے امیا  
 ہے کہ آپ کو میری تحریر ضرور پسند آئے گی اگر  
 میری حوصلہ افزاء کی مگی تو مزید بھی حنا کے ساتھ  
 اپنا سلسلہ جاری رکھ سکوں گی۔  
 عاکشہ چوہدری خوش آمدید اس مغل میں، د  
 کے لئے آپ کی محبتوں کا شکریہ، تحریر کے متعلق  
 آپ سے ہماری فون پر بات ہو چکی ہے، آپ ک  
 اگلی تحریر کے منتظر ہیں گے شکریہ۔  
 مسز گہمت غفار: کراچی سے لکھتی ہیں۔  
 جیتی رہو شاد و آباد رہو، سلامت رہو، آمین  
 ثم آمین۔  
 اس ماہ جنوری 2018ء کا رسالہ سالگرہ نب  
 منکوا یا۔  
 ”کچھ باتیں ہماریاں“ ہمیشہ کی طرح تو  
 طلب ہے دعاؤں سے پر، اللہ کرے سردار بھاء  
 کی باتیں دل کو لگیں، ڈھیروں دعا میں دل نہ  
 نکلیں، اپنے پیارے وطن کے لئے نیک مقلم  
 جرأت مند ایماندار اور منصف رہنما کے لئے دا

# اب ہر دن خوبصورت

## مکمل تحفظ مکمل تازگی



**Butterfly**  
BREATHABLES

GIRL  
TALK

MONTHLY HINA FEBRUARY 2018

محذرت کہ شائع نہیں ہو پایا آپ کی تحریر بھی انشاء اللہ جلد شائع کریں گے، ڈائری کے سلسلے میں آپ دوسرے شعرا کا کلام بھیج سکتی ہیں شکریہ۔ سیدہ جیلانی: ایبٹ آباد سے تشریف لائی ہیں وہ لکھتی ہیں۔

آپنی میں نے ایک ناول لکھا ہے، مجھے جنون ہے لکھنے کا بہت سوچا کہ کہاں پوسٹ کروں بس اب ڈرتے ڈرتے آپ کی خدمت میں حاضر ہے، یہ کہانی لا جواب ہے ”دل گزیدہ“ دلیل ڈن ام مریم بس اس فیض صاحب کو تھوڑا سیدھا کریں غانیہ آئی رینگی لو پویرا اور حنا کا ساتھ کتنا پرانا ہے اس کا مجھے خود بھی علم نہیں شاید تب سے جب مجھے زندگی گزارنے کا ڈھنگ ہی نہیں پتا تھا، مگر ہر ماہ میرے پیارے میاں جی اللہ انہیں سلامت رکھیں بنا کہے لے آتے ہیں چونکہ ہم گاؤں کے ہاسی ہیں اس وجہ سے ٹھوڑا مسئلہ ہوتا ہے، اشارہ لانے میں مگر دل بہت شدت سے دیت کرتا ہے کہ کب ہو گا ٹیکسٹ منٹھ اور کب آئے گا حنا، اب آتے ہیں بشری سیال ک ناول ”مئی رقص“ بار آپ نے عینی احمد کے ساتھ کچھ زیادتی نہیں کر دی، میرے خیال سے کر دی، بہر حال بیٹ آف لک، اب آتے ہیں نایاب جی کے ناول کی طرف واہ فشرہ پو آر بہت سستی اتنا ہی ہیام بھی کیپ اٹ آپ جی شاہاش، پلیز میرے خط کو حنا کے صفحات پر ضرور تحریر کریں اور ہمیشہ شادو آباد رہیں، سب سسٹمز کو میرا دل سے سلام۔

سیدہ جیلانی خوش آمدید حنا کو پسند کرنے کا شکریہ آپ اپنی تحریریں ہمیں بھجوائیں قابل اشاعت ہوں تو ہم ضرور شائع کریں گے آپ کی آمد کا ایک بار پھر شکریہ۔

☆☆☆

کی گہرائیوں سے سردار بھائی کی دعا پر آمین کہہ کر مزید ہم نے بھی اپنے رب سے دعائیں کی یا رب العالمین ہماری اور سردار بھائی کی دعائیں قبول فرما آمین۔

ہمیشہ کی طرح حمد باری تعالیٰ، نعت رسول مقبول کے روحانی تحریر کو چومتے ہوئے آگے بڑھے، تو جگہ گاتی جگہ لکھ کر تحریر پر نظر پڑی تو وہ شخص پیارے نبی کی پیاری باتیں، سبحان اللہ۔ کہانیوں میں ”میں تم اور چائے“ حیا بخاری کی کہانی اچھی لگی، ”راہ ہدایت“ وجیہ بخاری کی تحریر خوبصورت تھی، سچ ہے خوش نصیب ہوتے ہیں وہ لوگ جن کو رب کا نکتا ہدایت دے۔ ”وہ لمحہ جاوداں“ سندس جنس کی کہانی بھی اچھی لگی، بیاض میں، سعدیہ عمر، سعدیہ جبار، آنسہ ممتاز، مریم رباب، فرح عامر، ام امین، جویرہ ناصر، آسیہ وحید، عابدہ سعید، ان کے اشعار اور قطعات اچھے تھے، رحنا حنا میں نعیمہ راؤ، عابدہ سعید، فرح عامر، ہمارائے، نسیہ آصف کی تحریریں اچھی تھیں۔

میری ڈائری میں سے نازیہ کمال، مریم رباب، فائزہ قاسم، ہمارائے، فریال امین، درشن کی ڈائری کے اوراق پسند آئے۔ نوزیہ یہ بتائیں کہ یہ ڈائری کے اوراق میں شاعر بھی یہی ہوتے ہیں۔

حاصل مطالعہ میں سعدیہ جبار، آنسہ ممتاز، فریال امین، نازیہ کمال، مریم رباب، ام خدیجہ، ثناء حیدر، درشن، آسیہ وحید، جویرہ ناصر، بھٹی ساری تحریریں بہت پسند آئیں، سروے کے بارے میں بھی ابھی علم ہوا، اس ماہ بھی بھجواتا ہے تو میں بھیج رہی ہوں۔

سزگھٹ غفار خوش رہیں حنا کے لئے آپ کی محبتوں کا شکریہ، سروے آپ نے لیٹ بھجوا دیا